ننگے پاؤں
نگہت سیما

پیشِ لفظ

میں نے لکھنے کی ابتدا بچوں کی کہانیاں لکھنے سے کی تھی اور اس وقت میں چھٹی کلاس میں پڑھتی تھی۔ اور میری یہ کہانیاں بچوں کے ایک رسالے ''غنچہ'' میں چھپتی تھیں۔ اور میں ''جنگ'' کے بچوں کے صفحہ میں بھی لکھتی تھی۔ ''غنچہ'' کراچی سے نکلتا تھا اور یہ ٹین ایجر بچوں کے لیے تھا۔

میٹرک تک میں ''غنچہ'' اور جنگ کے بچوں کے صفحہ پر ہی لکھتی رہی۔ البتہ دو تین کہانیاں میں نے ''سیارہ ڈائجسٹ میں بھی بھیجیں۔ تب میں ساتویں کلاس میں تھی اور ان دنوں مقبول جہانگیر سیارہ ڈائجسٹ کے ایڈیٹر تھے۔ ''ایک غریب سپاہی'' اور ''(مسجد) اقصیٰ کے آنسو'' یہ دونوں تحریریں سیارہ میں چھپیں اور مقبول جہانگیر نے انہیں بہت سراہا اور جب انہیں علم ہوا کہ میں ساتویں کلاس کی طالبہ ہوں تو بے حد حیران ہوئے اور مجھے مشورہ دیا کہ میں اچھے ادیبوں کو پڑھوں اور سنوں۔

میں سوچتی ہوں کہ ''ایک غریب سپاہی'' یہ کہانی جس موضوع پر میں نے لکھی تھی۔ اگر آج اس موضوع پر اس سے بہتر لکھنا چاہوں تو نہیں لکھ سکتی۔ شہادت کا فخر اپنی جگہ پر لیکن اپنے بہت پیارے کے بچھڑ جانے کا دکھ کیا ہوتا ہے۔ یہ موضوع تھا۔

فرسٹ ایئر میں ''جنگ راولپنڈی'' کے ادبی صفحہ پر میری پہلی کہانی ''جواری'' چھپی یوں افسانہ نگاری کی ابتدا کی۔

پھر کچھ عرصہ تک میں نے نہیں لکھا۔ جاوید بھائی کی اچانک ڈیتھ نے بہت عرصہ تک اپ سیٹ رکھا۔

1976ء میں دوبارہ لکھنا شروع کیا اور اب کے سیارہ ڈائجسٹ میں میری کئی کہانیاں مسلسل چھپیں۔ جنہیں بہت پسند کیا گیا۔ جن میں سے ''بھرم''، ''اولڈ ایج ہاؤس'' اور ''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل'' مجھے آج بھی پسند ہیں۔ ''بھرم'' کا ایک جملہ آج بھی دل پر اثر انداز ہوتا ہے۔

''اور میرا وجود تو شاید بی پی کے خالی ڈبوں سے بھی زیادہ حقیر تھا جنہیں بھابی بیگم نے گیلے کپڑے سے چمکا چمکا کر اپنے سامان میں رکھ لیا تھا۔''

سیارہ کے ایڈیٹر پہلے سید قاسم محمود اور پھر ستار طاہر تھے میری یہ کہانیاں ایک لفظ کاٹے یا ردو بدل کئے بغیر چھپتی رہیں۔

''اوراق'' میں بھی میں نے کئی کہانیاں لکھیں۔

وزیر آغا صاحب نے میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ کبھی کوئی کہانی رد نہیں کی۔

غالباً 83 میں اقبال بانو'' کے کہنے پر خواتین میں پہلا افسانہ بھیجا تھا اور تب سے اب تک یہ سفر جاری ہے۔ ''اوراق'' سال بعد چھپتا تھا۔ اور خواتین کے پرچے ہر ماہ آتے تھے۔ میں نے ادھر لکھنا شروع کیا تو ہولے ہولے ''اوراق'' میں لکھنا ختم ہو گیا۔ حالانکہ جب میں ''اوراق'' میں لکھ رہی تھی تو ادبی حلقوں میں میری کہانیاں کافی پسند کی جا رہی تھیں۔

انور سدید صاحب نے ''تخلیق'' میں ''آج کا ادب'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا اور اس میں میری کہانی ''مراجعت'' کی بے حد تعریف کی تھی۔ وزیر آغا صاحب نے میری نظمیں بھی پسند کی تھیں اور مجھے کہا تھا کہ اگر میری نظمیں اتنی طویل نہ ہوں تو ان میں آزا

اب تک کتنا لکھا ہے؟ صحیح اندازہ تو نہیں لیکن کافی پہلے میں نے مختلف ڈائجسٹوں اور ادبی پرچوں میں چھپنے والی کہانیاں پرچوں میں چھپنے والی کہانیاں افسانے، ناولٹ وغیرہ گنے تو دو ہزار سے زیادہ تھے، بچوں کی کہانیاں اس کے علاوہ تھیں۔

اب تک میری چوبیس کتابیں چھپ چکی ہیں۔ بچوں کے لیے ''حدیث کہانیوں'' کے عنوان سے ایک کتاب چھپی ہے۔ یہ پہلا حصہ ہے۔ دوسرا آنے والا ہے۔

گھر والوں کا تعاون نہ ہو تو لکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ گھر میں سب ہی فیملی کے افراد والد سمیت ادبی ذوق رکھتے تھے۔ جب پہلی کہانی چھپی تھی تو مجھے یاد ہے ابو نے دس روپے انعام دیا تھا۔ جاوید بھائی سب سے بڑے تھے گھر میں اور پھر ان کے بعد جمیل بھائی تھے۔ دونوں بھائیوں نے بہت تعریف کی۔ بہت سراہتے تھے اور بہت شوق سے ہماری تحریریں پڑھتے تھے۔

جاوید بھائی نہ صرف ہر تحریر پڑھتے تھے بلکہ اس تحریر کی تعریف میں چھپنے والے خطوط کی کٹنگ بھی اپنے پاس رکھ لیا کرتے تھے۔ جو ان کے حادثے کے بعد ان کے بریف کیس میں سے نکلی تھیں۔ ''جواری'' چھپا تو میں نے انہیں دکھایا وہ عید پر گھر آئے ہوئے تھے۔ از حد حیران ہوئے۔

یہ سب تم نے لکھا ہے یہ تاش کی ٹرمز...... یہ پتے شو کرانا...... بلائنڈ کیسے لکھا......

جمیل بھائی مسکرائے تھے۔ اور دو لفظ کہے تھے انہوں نے۔ ''مطالعہ...... بھائی صاحب مطالعہ۔''

پھر انہوں نے میری ساری تحریریں دیکھیں جو تب تک میں نے لکھی تھیں اور ابھی کہیں چھپنے کے لیے نہیں بھیجی تھیں اور دو منتخب کیں۔

''یہ کسی ادبی پرچے میں چھپنے کے قابل ہیں۔ بچوں کے رسالے میں نہیں چھپ سکتیں نہ اخبار میں'' میں یہ لے جا رہا ہوں...... ٹی۔ وی یا ریڈیو سے بھی پیش کرنے کے لیے کچھ کروں گا۔''

(جمیل بھائی اور جاوید بھائی نے اپنی کالج لائف میں خود بھی کافی لکھا تھا۔)

جاوید بھائی جان کے بعد جمیل بھائی نے میری بہت حوصلہ افزائی کی...... سیارہ ڈائجسٹ میں میری کہانی ''اولڈ ایج ہاؤس'' چھپی۔ تو اتفاقاً ان کی نظر سے گزری۔ تب تک بطور خاص انہوں نے میری تحریریں کبھی نہیں پڑھی تھیں۔ ہم (میں اور ابو) راولپنڈی گئے تو ان سے گلے ملتے ہوئے جو پہلی بات انہوں نے کی وہ تھی۔

''آپ نے اولڈ...... ایج ہاؤس پڑھی'' ابو نے نفی میں سر ہلا دیا تو ان کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

"It is a great story"

ان کے یہ الفاظ ان کی آنکھوں کی چمک اور میرے لیے جو فخر تھا ان کے لہجے میں، وہ میں کبھی نہیں بھول سکتی۔

ایک بار چھٹیوں میں، میں ان کے گھر راولپنڈی گئی ہوئی تھی تو میں نے انہیں بتایا کہ میں آج کل ''سقوط مشرقی پاکستان'' کے پس منظر میں ناولٹ لکھ رہی ہوں۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ میں اسے اس طرح میں نہیں لکھ پاؤں گی جیسے کوئی ایسا شخص لکھ سکتا ہے۔ جو مشرقی پاکستان میں رہا ہو۔ تب انہوں نے مجھے ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' اور ایک انگلش کی کتاب تھی شاید دی فال آف ڈھاکا۔ ٹھیک سے نام یاد نہیں، لا کر دیں۔ لیکن پھر بھی مطمئن نہ ہوئے تو مجھ سے کہا۔

''میرے بہت اچھے دوست ہیں کرنل اقبال، مشرقی پاکستان کے محاذ پر تھے پھر جنگی قیدی بھی بنے، کل ان کی دعوت کرتے ہیں۔ وہ کھانے پر آئیں گے تو پھر جو مزید جاننا چاہو، ان سے پوچھ لینا۔''

سو ان کی فیملی کو کھانے پر بلایا۔ کرنل صاحب سے میرا تعارف کروایا۔

انہوں نے بہت کچھ بتایا...... میں نے کچھ پوائنٹ نوٹ کیے۔ کچھ ذہن میں رکھے...... لیکن پھر ہوا یوں کہ میں اسے

جلدی مکمل نہ کرسکی۔ پہلے اپنے پیپرز میں مصروف ہوگئی۔ (بی ایڈ کے پیپرز) اور پھر میری سستی۔ وہ فائل ادھر ادھر ہوگئی۔

تقریباً تین سال بعد میں نے اسے مکمل کیا لیکن تب تک جمیل بھائی اس دنیا میں نہیں رہے تھے۔ ''شکستہ آئینے'' کے نام سے یہ ناولٹ چار یا پانچ اقساط میں چھپا تھا لیکن اس طرح نہیں لکھا جاسکا جیسا کہ میں لکھنا چاہتی تھی۔

محمود بھائی جمیل بھائی جان سے چھوٹے ہیں۔ اگرچہ وہ انگلینڈ میں ہیں۔ لیکن جب کبھی وہ پاکستان آئے انہوں نے ہماری تحریروں کو بہت شوق سے پڑھا۔ ایک بار وہ آئے تو انہوں نے پوچھا کہ

''تم نے اتنا زیادہ لکھا ہے لیکن اب تک تمہاری کتاب کیوں نہیں چھپی۔؟''

میرا پہلا افسانوی مجموعہ ''مراجعت'' جو میں نے خود چھپوایا تھا اگر وہ اصرار کر کے نہ چھپواتے تو یہ کتاب کبھی نہ چھپتی۔ اور نہ ہی کتابیں چھپنے کا سلسلہ اسٹارٹ ہوتا۔

مجھے لکھنے میں کبھی مشکل نہیں پیش آئی مطالعہ اور مشاہدہ یہ دونوں چیزیں میری مددگار رہیں۔ کشمیر کے موضوع پر میں نے جو کہانی لکھی تھی اس کے لیے مجھے معلومات ایک ایسے لڑکے سے ملی تھیں جو جہاد کے لیے گیا تھا۔

اس نے روزنامچہ مجھے دیا تھا جو وہ کیمپ میں لکھتے تھے۔ اس کے بغیر وہ کہانی اتنی مکمل نہیں لکھی جاسکتی تھی۔ میں نے ہمیشہ جیسے خود محسوس کیا ویسے لکھا...... اپنا نقطہ نظر۔ عراق افغانستان، وانا، وزیرستان...... ڈاکٹر قدیر ان معاملات کو میں نے جس طرح محسوس کیا کہانی کے روپ میں پیش کردیا...... اعداد و شمار اور حالات جاننے کا ذریعہ اخبار تھے...... پھر معاشرتی برائیاں۔ مثلاً جادو ٹونا۔ حسد وغیرہ کو بھی میں نے اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ بین الاقوامی موضوعات پر لکھنا بچپن میں ہی شروع ہوا تھا۔ وان ہو ''ویت نام اور کشمیر، فلسطین پر بچوں کی کہانیاں لکھیں۔ میری کسی بھی کہانی پر کوئی خاص اعتراض تو نہیں ہوا اگر کوئی ہوا بھی ہو تو مجھے یاد نہیں۔ ایک بار کسی قاری نے ''یہ دانہ و دام کی کہانی'' پر اعتراض کیا تھا کہ صدام ظالم تھا اور عراق کے ساتھ جو ہوا صحیح ہوا مجھے یہ نہیں لکھنا چاہئے تھا وغیرہ...... مگر وہ ان کا نقطہ نظر تھا۔

وطن سے محبت شاید خون میں رچی ہوئی ہے۔ اور یہ محبت والدین سے ہم میں منتقل ہوئی، تاریخ سے دلچسپی رہی۔ والدین نے پاکستان کے حوالے سے ہمیشہ کچھ نہ کچھ بتایا۔ تقسیم کے وقت جو تکالیف مسلمانوں نے اٹھائیں۔ ابو۔ امی اکثر بتایا کرتے تھے...... پاکستان ناگزیر تھا...... ہمارے تشخص کے لیے، پہچان کے لیے۔ بہت دکھ ہوتا ہے جب دیکھتے ہیں کہ اس اتنی قربانیوں کے بعد بننے والا پاکستان غداروں کے ہاتھوں میں ہے۔ اور وہ اس کی جڑوں کو کاٹ رہے ہیں۔ اپنے خزانے بھر رہے ہیں۔

قارئین جب کوئی تحریر پسند کرتے ہیں تو نہ صرف اچھا لگتا ہے بلکہ مزید لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔

''ننگے پاؤں'' میری پسندیدہ کہانیوں میں سے ہے، یہ خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوئی تھی، اب اسے کتابی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔ اس کہانی میں ایک بہت نازک مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنے لڑکوں کی طرف سے غافل ہوتے ہیں کہ لڑکے ہیں۔ انہیں کیا ڈر ہے...... لیکن آج کل تو لڑکوں پر بھی چیک رکھنا ضروری ہے...... ان کے دوست کیسے ہیں...... ہم عمر ہیں...... اگر کوئی بڑی عمر کا لڑکا حتی کہ استاد بھی زیادہ قریب ہے تو اس کے متعلق والدین کو مکمل علم اور معلومات ہونا چاہئیں۔

نگہت سیما

ننگے پاؤں

رستے سارے کالے ناگ اور تیز ہوا
اک دیا ہے ہاتھوں پر اور ننگے پاؤں
اِن آنکھوں سے ان آنکھوں تک لمبے رستے

''میں ہرگز ہاسٹل نہیں جاؤں گی' سنا آپ نے۔''

دھڑ سے دروازہ کھول کر بالکل اس کے سامنے کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے ثمین نے کہا تو تیمور عباس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس سے اسی ردعمل کی توقع کر رہا تھا لیکن اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ یوں اس طرح آفس میں آجائے گی۔ کم از کم اس طرح آج سے پہلے وہ کبھی آفس میں نہیں آئی تھی لیکن ان دنوں وہ جس طرح باغی ہو رہی تھی' اس سے اس کی توقع کی جاسکتی تھی۔

''ہاسٹل تو آپ کو جانا ہی پڑے گا ڈرثمین!'' وہ ہولے سے مسکرایا۔

''لیکن کیوں' کس لیے؟'' اس نے شیشے کی میز پر مکا مارا۔

''ریلیکس' ریلیکس گڑیا!''

اس نے نگاہیں اٹھا کر بے حد غصے سے تیمور عباس کی طرف دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں' یوں ہی ہونٹ بھینچے اسے دیکھتی رہی۔ اسے خود کو گڑیا کہلوانا ہرگز پسند نہیں تھا لیکن اس وقت اس نے ہمیشہ کی طرح تیمور عباس کو گڑیا کہنے پر ٹوکا نہیں بلکہ ایک غصیلی نظر اس پر ڈال کر اپنا سوال دہرایا۔

''اس لیے کہ یہ ملک صاحب کا حکم ہے۔''

''مگر کیوں' بابا کیوں بھیجنا چاہتے ہیں مجھے ہاسپٹل۔ یہاں میری ذات سے انہیں کیا تکلیف پہنچ رہی ہے۔ میرا وجود کیوں کھٹکتا ہے انہیں۔ مجھے تو ہفتہ ہفتہ بھر ان کی شکل نظر نہیں

آتی۔ ترس جاتی ہوں ان سے بات کرنے کو انہیں دیکھنے کو۔ میں نے کیا کیا ہے جو وہ مجھے یہ سزا دے رہے ہیں۔''

بات کرتے کرتے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ پلکیں جھپک جھپک کر آنسو روکنے کی کوشش کرنے لگی تو عباس نے مضطرب ہو کر ہاتھ میں پکڑا قلم ٹیبل پر رکھا اور ٹیبل کے پیچھے سے اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

''اسی میں آپ کی بہتری ہے۔''

''کیا بہتری ہے؟'' وہ عجیب طرح سے ہنسی۔ ''گھر سے دور ہاسٹل میں رہ کر پڑھنے میں کیا بہتری ہے عباس صاحب! آپ بتائیں گے مجھے؟'' اس کے لہجے میں ہلکا طنز تھا۔

''ہاں' بابا جان کو میری شکل نظر نہیں آئے گی تو شاید انہیں خوشی ہو۔''

''ثمین! آپ غلط سمجھ رہی ہیں۔'' عباس نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''ملک صاحب کا خیال ہے کہ گھر میں آپ تنہا رہ کر چڑچڑی ہوتی جا رہی ہیں۔ خود ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ آپ کو دے سکیں۔ وہاں ہاسٹل میں آپ تنہائی محسوس نہیں کریں گی۔''

''یہ بابا جان کا خیال ہے' میرا نہیں۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''آپ بابا جان سے کہہ دیں کہ مجھے ہاسٹل نہیں جانا۔''

اور عباس جانتا تھا کہ ملک صاحب جب ایک بار کوئی فیصلہ کر لیں تو وہ اسے تبدیل نہیں کرتے۔

''گڑیا.....گڑیا پلیز بیٹھو۔''

غیر ارادی طور پر عباس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بٹھانے کی کوشش کی اور پھر یکدم ہی ہاتھ ہٹا لیے اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نیلی آنکھیں متورم ہو رہی تھیں اور چھوٹی سی ناک اور رخسار بے حد سرخ تھے۔ شاید وہ روتی رہی تھی۔ عباس کو دکھ سا ہوا۔ وہ اسے روتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ایک طرح سے اس نے ہی اسے پالا تھا۔ اسے ہی نہیں' سعدون کو بھی۔ وہ دو برس کی تھی اور سعدون صرف دو ماہ کا جب وہ ماں کی ممتا سے محروم ہو گئی تھی اور خود عباس کی عمر اٹھارہ سال تھی تب سے ثمین اور سعدون کو سنبھالے رکھتا۔ گو سعدون اور ثمین کی آیا موجود تھی لیکن وہ دونوں بھی اس کی گود میں سکون پاتے تھے اور خود ملک صاحب تو بیوی کی موت کے صدمے سے نڈھال تھے پھر کئی ماہ بعد جب وہ سنبھلے تو انہوں نے سعدون اور ثمین کو جیسے عباس کی نگرانی میں ہی دے دیا تھا اور خود ان کی ہر ضرورت سے بے خبر ہو گئے تھے۔

عباس چھ سال کی عمر میں ''ملک ہاؤس'' آیا تھا۔ وہ اس گھر کا فرد نہیں تھا لیکن یہاں اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ملک صاحب ذاتی طور پر اس کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیتے تھے۔ وہ اس وقت بی ایس سی کا اسٹوڈنٹ تھا۔ عباس کون تھا' کس کا بیٹا تھا اور ملک صاحب سے اس کا کیا رشتہ تھا؟ اس نے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ خود کو ملک صاحب کا وفادار

سمجھتا تھا۔ ایک بار بچپن میں ہی ''ملک ہاؤس'' کے کسی ملازم نے اسے بتایا تھا کہ وہ ملک صاحب کو کسی سڑک سے روتا ہوا ملا تھا۔ انہوں نے اخبارات میں تصاویر وغیرہ چھپوائیں' اعلان کروائے لیکن کوئی اس کی خبر لینے نہیں آیا۔ سو ملک صاحب نے اسے گھر میں ہی رکھ لیا تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ ملک صاحب کا اعتماد اس پر بڑھتا گیا۔ وہ گھر کے علاوہ آفس کے بھی بہت سے امور سرانجام دینے لگا تھا۔

ملک فیروز خان اگر اس دنیا میں کسی پر اعتبار کرتے تھے تو وہ عباس ہی تھا اور خود عباس نے کبھی اپنی ذات' اپنی خوشی یا اپنے فائدے کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ اس کی رہائش ''قصر زہرہ'' میں ہی تھی۔ بے شمار ملازموں کے علاوہ اتنے بڑے ''قصر زہرہ'' میں صرف سعدون' در ثمین' ملک فیروز خان اور عباس ہی رہتے تھے۔ سعدون اور ثمین اس سے بہت مانوس تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک سعدون اور ثمین ہر معاملے میں اسی سے مشورہ کرتے تھے اور اپنی ہر بات شیئر کرتے تھے۔ ملک فیروز خان نے جب سے مل لگائی تھی' بے حد مصروف ہو گئے تھے۔ وہ بہت کم گھر پر رہتے تھے۔ کبھی جاگیر پر اور کبھی اپنی مل میں چلے جاتے۔ ملک ٹیکسٹائل ملز ٹیکس فری زون میں تھی اور ''قصر زہرہ'' کراچی میں۔ یہ گھر انہوں نے زہرہ کے ساتھ شادی سے کچھ عرصہ پہلے بنوایا تھا۔ جب انہوں نے یہاں ایک ہوٹل بنایا تھا اور اس وقت اسی ہوٹل کے آفس میں ثمین موجود تھی۔ جب سے ٹیکسٹائل مل لگی تھی' تب سے ہی ہوٹل کی تمام ذمہ داری انہوں نے عباس کو سونپ دی تھی۔

در ثمین یوں ہی کھڑی رہی تو اس نے پھر نرمی سے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔

''ملک صاحب سمجھتے ہیں کہ چونکہ سعدون بابا کو بھی ہاسٹل بھیج دیا گیا ہے اور میں رات گئے تک ادھر مصروف رہتا ہوں اور پھر شاید ملک صاحب مجھے وہاں بلوانا چاہتے ہیں۔ تو یوں آپ گھر میں بالکل تنہا ہو جائیں گی۔''

''تو اس کا ایک بالکل آسان ساحل تھا کہ بابا جان' سعدون کو واپس بلا لیں۔ یوں بھی اس کا دل بالکل نہیں لگ رہا وہاں اور پھر میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ بابا جان نے اسے لاہور کیوں بھیج دیا۔ کیا وہاں یہاں سے اچھی تعلیم دی جاتی ہے؟''

عباس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ بکھر کر معدوم ہو گئی۔

''ملک صاحب بہتر جانتے ہیں۔''

''اور آپ ساری زندگی بابا جان کے چمچے بنے رہیں' آپ کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے لیکن میری رائے ہے۔ مجھے کہیں نہیں جانا اور میں چاہتی ہوں' آپ یہ بات بابا جان کو بتا دیں۔''

وہ تنتناتے ہوئے ایک گہری نظر اس پر ڈالتی باہر چلی گئی۔ وہ کچھ دیر یونہی کھڑا خالی دروازے کو دیکھتا رہا۔

در ثمین اسے بے حد عزیز تھی' وہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کی ہر

خواہش پوری کرنا چاہتا تھا۔ اس نے صرف اس کے آنسوؤں کو دیکھ کر ملک فیروز خان سے سعدون کو لاہور نہ بھیجنے کی درخواست کی تھی۔ ''وہ او لیول یہاں سے ہی کر لے تو بہتر ہے' بعد میں باہر بھجوا دیجئے گا' ابھی بہت چھوٹا ہے۔''

لیکن ملک صاحب جو اس کے مشورے' بہت دھیان سے سنتے تھے' جب دل میں کچھ ٹھان لیتے تو پھر اس کی بات کی بھی پروا نہیں کرتے تھے اور سعدون کے جانے کے بعد درثمین بہت چڑچڑی ہو گئی تھی۔ اسے سعدون سے بہت محبت تھی اور جب سعدون سے فون پر بات ہوتی تو وہ خوامخواہ ہی اس سے بھی الجھنے لگتی۔ بلاوجہ ملازمین کو ڈانٹتی اور پڑھائی کی طرف سے بھی لاپروائی برتنے لگتی تھی اور ابھی سعدون کو گئے صرف تین ماہ ہوئے تھے کہ ملک صاحب نے اسے بھی لاہور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ عباس کو حیرت ہوئی تھی اور اس نے دبے لفظوں میں ملک صاحب کو بتایا بھی تھا کہ درثمین شاید ہاسٹل جانے پر راضی نہ ہو' وہ بھی اتنی دور لاہور۔

''میں نے اس کا ایڈمیشن کنیئرڈ کالج میں کروا دیا ہے۔ اگلے ہفتے فرسٹ ایئر کی کلاسز شروع ہو جائیں گی' تم اسے مناسب تیاری کروا دینا۔ جو شاپنگ وہ کرنا چاہے' کروا دینا اور لاہور چھوڑ آنا۔''

❖❖❖

''تو تمہارے پاس ایک بہت پرانی کہانی ہے جو تمہارے خیال میں میرے لیے بہت سود مند ثابت ہو سکتی ہے۔ چوہدری جہانداد نے دائیں ہاتھ سے اپنی مونچھ مروڑتے ہوئے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو بے حد دھیان سے دیکھا۔

سیاہ جینز پر ریڈ گھٹنوں سے اونچی شرٹ پہنے جس کے بازوؤں اور گلے کے کنارے پر کڑھائی تھی۔ گلے میں سیاہ لمبا اسکارف جو گھٹنوں کو چھو رہا تھا۔ بال پونی میں جکڑے' بے حد چمکتی سیاہ آنکھیں' گلابی رنگت' وہ بے حد اعتماد سے سر اٹھائے چوہدری جہانداد کو دیکھ رہی تھی۔ چوہدری جہانداد جیسے جہاں بین شخص کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہ لگی کہ لڑکی جو کچھ کہہ رہی ہے' اس میں کہیں کوئی سچ ہے۔''

''بالکل۔'' لڑکی اسی اعتماد سے مسکرائی۔ ''اس کہانی کے منظر عام پر آ جانے سے ہونے والے الیکشنز کی صورت حال بالکل تبدیل ہو جائے گی۔ لوگ دوسروں کی معمولی لغزشیں بھی معاف نہیں کرتے۔ بھلے خود گردن تک آلائشوں میں لتھڑے ہوں۔''

''بہت خوب' باتیں اچھی کرتی ہو۔'' چوہدری جہانداد بدستور دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے دائیں مونچھ مروڑ رہے تھے۔

''یعنی میرا حریف الیکشن میں کامیاب نہیں ہو سکے گا۔''

''سو فیصد۔''

''لیکن اگر ایسا نہ ہوا تو؟'' انہوں نے ایک تیز اور گہری نظر اس پر ڈالی۔

''ایسا ہی ہوگا' مجھے انسانوں کی نفسیات سے خوب آگاہی ہے۔''

''اتنی سی عمر میں تمہیں انسانوں کی نفسیات سے کیسے آگاہی ہو گئی؟''

ان کی نظریں ابھی تک اس پر تھیں۔ کھوجتی اور اندر اترتی ہوئی۔

''بی اے تک میرا مضمون نفسیات تھا۔''

''آہا!'' چوہدری جہانداد کا قہقہہ بہت بلند تھا۔

''تم.....'' انہوں نے ہنستے ہنستے کہا۔ ''بی اے تک نفسیات پڑھ کر یہ سمجھنے لگی ہو کہ تمہیں انسانوں کی نفسیات سے بہت آگاہی ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ایسا ہی ہے۔ صرف نفسیات ہی نہیں پڑھی میں نے' انسانوں کو بھی پڑھا ہے۔''

''آہا!'' چوہدری جہانداد نے پھر قہقہہ لگایا۔ ''عمر کتنی ہو گی تمہاری؟''

''پچیس سال۔''

''پچیس سال.....'' اب کے چوہدری جہانداد نے استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''اور پچیس سال کی عمر میں تم سمجھتی ہو کہ تمہیں انسانوں کو پڑھنا آتا ہے۔ انسان جو ایسا بہروپیا ہے کہ جس کا اصل روپ کبھی کوئی نہیں جان سکا۔''

''کچھ بھی جاننے یا سمجھنے کے لیے عمر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ کبھی کبھی زمانہ کم عمری میں ہی وہ سب کچھ سکھا دیتا ہے جو پچاس سال کی عمر میں بھی آدمی نہیں سیکھ پاتا۔''

''اچھا تو تمہاری نفسیات میرے متعلق کیا کہتی ہے۔'' چوہدری جہانداد ابھی تک استہزائیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''آپ کے متعلق۔'' لڑکی نے ایک لمحے کے لیے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''آپ ایک خود غرض اور سفاک انسان ہیں۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر آپ کا اپنا بھی کوئی آپ کی راہ میں آئے تو آپ اسے راہ سے ہٹانے کے لیے قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ آپ کے دل میں دولت کی ہوس بھی بہت ہے۔'' چوہدری جہانداد کے مسکراتے لب بھینچ گئے اور آنکھوں میں عجیب سفاک سا غصہ ابل آیا لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے اپنے اندر اٹھتے ابال پر قابو پا لیا۔ آج تک کسی نے یوں اس طرح خود ان کے سامنے انہیں بے نقاب نہیں کیا تھا۔

''تمہارے پاس اپنی کہانی کی سچائی کا کیا پروف ہے؟''

''کہانی خود اپنی سچائی کا پروف ہے۔'' لڑکی نے بغور چوہدری جہانداد کے چہرے کو دیکھا۔ مسلسل مونچھ مروڑتا ان کا ہاتھ اب میز پر دھرا تھا اور انگلیوں کا ارتعاش اندر کی بے چینی کا پتا دے رہا تھا۔

''کیا قیمت ہے تمہاری اس کہانی کی؟''

''قیمت کا تعین تو آپ کریں گے۔'' وہ یکدم کھڑی ہو گئی۔ ٹیبل پر رکھے بیگ کو دائیں

کندھے پر لٹکایا۔

''آپ سوچ لیں' میں پھر حاضر ہوں گی دو تین روز میں اور یقیناً آپ کو بھی اندازہ تو ہوگا کہ آپ کی یہ جدی پشتی سیٹ اس دفعہ خطرے میں ہے۔'' وہ جانے کے لیے مڑی۔

''لڑکی! سنو' تمہارا نام کیا ہے' کہاں رہتی ہو' کیا کرتی ہو؟''

''یہ سب جاننا غیر ضروری ہے' میں خود حاضر ہو جاؤں گی۔''

''اور اگر میں اس کہانی کے منظر عام پر آنے سے دلچسپی نہ رکھتا ہوں تو؟ ظاہر ہے سیٹ پر رہنے کے لیے میرے اور ذرائع بھی ہیں۔'' چوہدری جہانداد نے اس کا اندر ٹٹولنا چاہا۔

''اس صورت میں۔'' لڑکی کے بھرے بھرے ہونٹوں پر ایک دلکش سی مسکراہٹ ابھری اور نچلے ہونٹ کے دائیں کونے کے ساتھ ننھا سا تل اس مسکراہٹ سے روشن سا ہو گیا۔ انہیں لگا جیسے اس لڑکی کو انہوں نے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے لیکن کہاں...... شاید یوں ہی وہم ہوا ہے۔ بعض اوقات ذرا سی کسی سے مشابہت ہو ہی جایا کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس لڑکی کی بھی کہیں کسی سے مشابہت ہو' ورنہ انہوں نے یقیناً آج سے پہلے اسے نہیں دیکھا تھا۔

''اس صورت میں یقیناً دوسری پارٹی اس میں دلچسپی ضرور رکھے گی کہ یہ کہانی منظر عام پر نہ آئے اور میں یہ کہانی اسی پارٹی کو دوں گی جو میرے حسب منشا اس کی قیمت لگائے گی۔''

''تم بہت شاطر لگتی ہو لڑکی!''

''کل تک سوچ لیں' میں پرسوں آؤں گی۔ آپ اپنی قیمت بتایئے گا پہلے پھر میں اپنی ڈیمانڈ بتاؤں گی' اوکے۔'' وہ یکدم تیزی سے پلٹی اور باہر نکل گئی۔

اور اندر آتے چوہدری کاظم جہانداد نے اسے دیکھا اور اس کے ہونٹوں سے بے اختیار سیٹی نکل گئی۔

''واؤ' بڑی زبردست چیز ہے۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''یہ کون تھی ڈیڈ؟''

''یہ......'' چوہدری جہانداد ابھی تک کچھ الجھے ہوئے تھے۔ ''پتا نہیں اس کے پاس کیا کہانی ہے اور کیسے اس تک پہنچ گئی اور ملک فیروز خان کی زندگی کا کون سا ایسا گوشہ ہے جو چھپا ہوا ہے۔ بظاہر تو ان کی زندگی میں ایسا کوئی اہم واقعہ نہ تھا۔ صاف ستھری زندگی تھی۔ بہت سال پہلے دونوں نے کچھ عرصہ تک مشترکہ طور پر کام بھی کیا تھا لیکن پھر یہ اشتراک ختم ہو گیا تھا۔ وہ گارمنٹس فیکٹری ملک فیروز خان نے لے لی تھی اور ان کا حصہ ان کی رضامندی سے انہیں دے دیا تھا۔ تب سے ہی وہ کچھ کینہ ان کے متعلق اپنے دل میں رکھتے تھے پھر بھائی پھیرو والی ٹیکسٹائل مل کے خریداروں میں وہ بھی شامل تھے لیکن مل ملک فیروز خان نے خرید لی تھی اور اب الیکشن میں ان کے مقابل کھڑا ہونا انہیں مزید تپا گیا تھا۔ جب انہوں نے مل کر گارمنٹ

فیکٹری شروع کی تھی' تب سے ہی وہ انہیں حریف سمجھتے تھے۔ زہرہ جمال کے معاملے میں وہ ان سے بری طرح ہار گئے تھے۔

''زہرہ جمال......'' ان کے اندر دور تک جیسے کسی نے نیزے کی انی سی چبھو ڈالی تھی۔

''یہ لڑکی!'' انہوں نے کاظم کی طرف دیکھا۔ ''معلوم نہیں کون ہے لیکن ایک کہانی بیچنا چاہتی ہے مجھے۔''

''کہانی......'' کاظم چوہدری دلچسپی سے میز پر جھک آیا تو انہوں نے تفصیل بتائی۔

''نو...... نو ڈیڈ! آپ اسے ایک پیسہ بھی مت دیں۔ مجھے لگ رہا ہے یہ لڑکی ڈبل گیم کھیلے گی۔'' پیسے کے معاملے میں وہ باپ سے بھی زیادہ حریص تھا۔ امریکہ میں قیام کے دوران لیزا اور فینی جیسی لڑکیوں نے اسے خوب لوٹا تھا اور وہ بخوشی ان کی قربت کے عوض لٹتا رہا۔ عورتوں کے لیے اس کے دل میں کوئی خاص احترام نہ تھا۔ سوائے اپنی ماں کے' بہنیں تھیں نہیں' دو چھوٹے بھائی اور تھے۔ اس کا تجربہ تھا کہ عورت بہت حریص اور لالچی ہونے کے ساتھ بے وقوف بھی ہوتی ہے اور پیسہ خرچ کیے بغیر بھی محض محبت کے چند بولوں سے اس سے فیض یاب ہوا جا سکتا ہے۔ اسے اپنی گزری زندگی میں فینی' لیزا اور بلونت کور پر لٹائے جانے والے پیسوں کا بہت پچھتاوا تھا لیکن تب وہ اتنا تجربہ کار نہیں تھا اور جب وہ ان کے ساتھ ہوتا تھا تو مختلف طریقوں اور اداؤں سے وہ اس کی جیبیں خالی کروا لیتی تھیں۔

''اس کا خیال ہے کہ اس کہانی کے منظر عام پر آ جانے سے ہماری الیکشن کمپین کی صورت حال بدل جائے گی۔ جیتنے کے امکانات سو فیصد ہو جائیں گے۔''

''ڈیڈ! آپ فکر نہ کریں' میں ایک پیسہ خرچ کیے بغیر بھی یہ کہانی اس سے وصول کر لوں گا۔''

چوہدری جہانداد نے سر ہلا دیا لیکن وہ سوچ رہے تھے کہ یہ کہانی بہر حال انہیں معلوم ہونا چاہیے۔ تصور ہی تصور میں انہوں نے ملک فیروز خان کا پیلا پڑتا چہرہ دیکھا اور ان کی بنی بنائی عزت خاک میں ملتے دیکھی اور ان کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''جب وہ دوبارہ آپ کے آفس میں آئے تو مجھے بتا دیجئے گا۔''

کاظم کی آنکھیں اس طرح دار لڑکی کے تصور سے چمکنے لگی تھیں۔ اسے اپنی مردانہ وجاہت پر ناز اور یقین تھا جبکہ چوہدری جہانداد نے اس لڑکی کی آنکھوں میں جو اعتماد دیکھا تھا' اس نے انہیں بتایا تھا کہ بہر حال انہیں اس کی مطلوبہ قیمت دینا ہی پڑے گی۔

''ویسے یہ لڑکی کیا کرتی ہے' کہاں رہتی ہے؟'' کاظم کے لہجے سے اشتیاق جھلک رہا تھا۔

چوہدری جہانداد نے برا سا منہ بنایا' اسے کاظم چوہدری کی لڑکیوں پر فدا ہو جانے والی عادت کچھ زیادہ پسند نہ تھی۔

''اس نے بتایا نہیں۔''

''خیر پتا چل جائے گا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں آج اسلام آباد جا رہا ہوں' یہ بتانے آیا تھا۔''

"یہ آج کل اسلام آباد کے بہت چکر لگ رہے ہیں تمہارے؟" انہوں نے معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا۔ "آفس میں بیٹھنا ضروری ہے تمہارا۔ منیجر بتا رہا تھا کہ تم......"

"او ڈیڈ...... سب ٹھیک چل رہا ہے، میں ابھی مِل کے آفس سے ہی آ رہا ہوں اور ہماری مِل اس وقت سب سے بہترین سوتر بنا رہی ہے اور سب سے زیادہ مانگ ہے اس کی اور اسلام آباد میں ایک دوست ہے میرا۔ نیویارک میں اکٹھے رہے ہم۔ آج کل وہ بزنس شروع کرنے کا سوچ رہا ہے تو ذرا مل کر سوچ رہے ہیں کہ کیا کیا جائے۔ شاید ہم پارٹنر شپ میں کوئی کام کریں۔" چوہدری جہانداد نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں سچ ایک فیصد بھی نہیں ہوگا۔

"او کے، کل شام تک آ جاؤں گا۔"

نمیرہ عرف نومی سے ملنے کا تصور اس کے دل کو گدگدانے لگا اور وہ چوہدری جہانداد کے خدا حافظ کہنے کا انتظار کیے بغیر باہر نکل گیا۔

❖❖❖

"تم کچھ پریشان لگ رہی ہو امثل!"

فریدوں نے اس کی ٹیبل پر دونوں ہاتھ رکھ کر تھوڑا سا جھکتے ہوئے کہا تو اس نے چونک کر فائل سے نظر ہٹائی۔

"نہیں، کچھ ایسا خاص نہیں۔"

"آنٹی کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔" فریدوں نے پھر پوچھا۔

"حسب معمول ہے۔ رات خاصی تکلیف رہی۔ ڈاکٹر عباد کہہ رہے تھے کہ اب ڈائی لیسز ضروری ہو گیا ہے اور ماما اس کے لیے تیار نہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں ہومیو پیتھک علاج کرواؤں گی۔"

"میں آؤں گا شام میں لالہ کے ساتھ پھر بات کریں گے۔ لالہ کل سے ضد کر رہی تھی کہ اسے تمہاری طرف لے جاؤں اور تم خود تو پتا نہیں کہاں مصروف رہتی ہو کہ وقت ہی نہیں ملتا تمہیں۔ پتا ہے اماں اور آپا بھی کتنا یاد کر رہے تھے تمہیں۔"

فریدوں کے لہجے میں شکوہ سا در آیا۔

"بس ماما کی وجہ سے ہی پریشانی ہے۔ تم جانتے ہو ان کا ایک گردہ بالکل ہی کام نہیں کر رہا اور میں چاہتی ہوں فریدوں! کہ ماما کو باہر لے جاؤں، ان کو اپنا ایک گردہ دے دوں لیکن چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔"

اس کے ہونٹوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"بہرحال تم جاؤ اپنی سیٹ پر، غفور صاحب کام چھوڑ کر تمہیں گھور رہے ہیں۔"

اس نے کن انکھیوں سے غفور صاحب کی طرف دیکھا جو قلم ہاتھ میں پکڑے ادھر ہی دیکھ

رہے تھے اور اپنی سماعتیں بھی ادھر ہی لگا رکھی تھیں۔ غفور صاحب ایسے آدمی تھے جنہیں دوسروں کے متعلق اندازے لگانے اور ان اندازوں کو پھر اپنے انداز میں ہر ایک کو پورے یقین سے بتانے کا شوق ہوتا ہے۔ "اللہ پاک کی قسم حامد صاحب کا کچھ چکر ہے۔" اور امثل کو ان کے ایسے ہی اندازوں سے خوف آتا تھا۔ حالانکہ وہ بہت بولڈ لڑکی تھی۔ اس آفس میں کام کرتے ابھی مہینہ بھر ہی ہوا تھا اور یہ جاب اسے فریدوں نے ہی دلائی تھی۔ اس سے پہلے جو لڑکی یہاں کام کرتی تھی، اس نے شادی کی وجہ سے جاب چھوڑ دی تھی۔ گو کہ جاب اس کی ڈگری اور تعلیم سے مطابقت نہیں رکھتی تھی لیکن اس کی ضرورت تھی۔ اس نے جرنلزم میں ماسٹرز کیا تھا اور یہاں آنے سے پہلے ایک مقامی اخبار کے دفتر میں جاب کر رہی تھی لیکن اس اخبار کے ایڈیٹر نے اس کی زندگی عذاب کر رکھی تھی۔ تنگ آ کر اس نے جاب چھوڑ دی تھی۔

"امثل جی پلیز...... کچھ ادھر بھی نظر کرم ہو جائے۔"

اس کے ہونٹ ہمیشہ خوشامد کے شیرے میں لتھڑے رہتے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں ہوس ناچتی تھی۔ شروع شروع میں ڈھکے چھپے لفظوں میں اور اب وہ صاف صاف اس کی رفاقت کی خواہش کرنے لگا تھا۔

"امثل جی! پتا نہیں آپ میں کیا ہے جی کہ رات بھر تڑپتا ہوں۔"

اس کی غلیظ گفتگو سے تنگ آ کر اس نے جاب چھوڑ دی تھی۔ حالانکہ وہ جاب چھوڑنا ہرگز افورڈ نہیں کر سکتی تھی لیکن اس کی برداشت کی حد اتنی ہی تھی۔ لالہ رخ اس کی اکلوتی اور بہت اچھی دوست تھی۔ بچپن سے دونوں نے ایک ہی اسکول، ایک ہی کالج میں پڑھا تھا۔ یونیورسٹی میں بھی دونوں نے ایک ہی شعبے میں ایڈمیشن لیا تھا۔ فریدوں، لالہ رخ کا بھائی تھا اور دونوں گھروں کا ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا تھا۔ لالہ رخ کی امی اور آپا اس سے محبت کرتی تھیں، اس طرح اس کی ماما کو بھی لالہ بے حد عزیز تھی۔ لالہ رخ کی دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ ایک بہن کی شادی ہو چکی تھی، دوسری آپا تھیں پھر فریدوں اور سب سے چھوٹی لالہ۔

"ہومی کی پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟" فریدوں نے سیدھا ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے وہ پڑھائی میں خاص دلچسپی نہیں لے رہا۔ اب وہ عمر کے اس حصے میں ہے کہ زیادہ روک ٹوک بھی مناسب نہیں ہے۔"

"لیکن ابھی وہ چھٹی کلاس کا اسٹوڈنٹ ہے اور اپنا برا بھلا نہیں سمجھتا۔ تمہیں اس کا دھیان رکھنا چاہیے۔"

"ہاں، دراصل ماما کی بیماری کی وجہ سے میں اس پر پوری توجہ نہیں دے پا رہی لیکن اب دھیان رکھوں گی۔"

اسے احساس ہوا کہ وہ ان دنوں ہومی پر بالکل بھی توجہ نہیں دے رہی، حالانکہ پہلے خود اپنے پاس بٹھا کر اسے ہوم ورک کراتی تھی، اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں پوچھتی۔ وہ اسے بہت عزیز

تھا اور اب جبکہ پاپا نہیں تھے تو اسے ہی اس کا دھیان رکھنا تھا۔ ماما تو اپنی بیماری کے ہاتھوں نڈھال تھیں لیکن ان دنوں اس نے اپنے آپ کو جن باتوں میں الجھا رکھا تھا' اس نے اسے ہر طرف سے بے گانہ کر رکھا تھا۔ وہ ہر وقت تانے بانے بنتی رہتی اور پیسہ اکٹھا کرنے کے منصوبے بناتی رہتی تھی۔

''کیا ماما کی بیماری کے علاوہ بھی کوئی بات تمہیں الجھا رہی ہے شمی؟''

فریدوں نے جاتے جاتے اچانک پوچھا تو وہ یکدم چونکی۔ اس شخص سے وہ کبھی نہیں چھپ سکتی تھی۔ چاہے جتنا بھی چھپائے' اس کی آنکھیں اندر تک اسے کھوج آتی تھیں لیکن جس بات نے اسے الجھا رکھا تھا' وہ بات کم از کم اس سے وہ کبھی بھی ڈسکس نہیں کر سکتی تھی۔

''نہیں' بس ہومی اور ماما ہی کا خیال ہے۔'' اس نے نظریں جھکا لیں۔

''آر یو شیور؟''

''شیور۔''

''اوکے۔'' وہ واپس اپنی ٹیبل کی طرف چلا گیا اور جاتے جاتے ایک تیز نظر غفور صاحب پر ڈالی جو فوراً نظریں جھکا کر میز پر پڑی فائل کے اوراق پلٹنے لگے اور پھر اٹھ کر حمید صاحب کے کیبن میں جا بیٹھے۔

''اللہ پاک کی قسم! یہ فریدوں صاحب کا اور اس نئی لڑکی امثل ملک کا کوئی چکر ہے حمید صاحب!''

''آپ کو شاید یاد نہیں رہا مس امثل' فریدوں کی کزن ہے۔''

حمید صاحب بھی ان کی اس عادت سے چڑتے تھے۔ فریدوں نے اس کا تعارف خالہ زاد بہن کی حیثیت سے ہی کرایا تھا۔ وہ امثل جیسی خوبصورت لڑکی کے لیے آفس جاب مناسب نہیں سمجھتا تھا اور پھر اس آفس میں وہ چار سال سے کام کر رہا تھا اور سب کا مزاج آشنا تھا' اس لیے نہیں چاہتا تھا کہ اس کے سامنے کوئی امثل پر ریمارکس دے کیونکہ جاب اس کی مجبوری تھی۔

''تو حمید صاحب! کیا کزنوں میں چکر نہیں چل سکتا۔ ارے اللہ پاک کی قسم ادھر تو زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ گھر بھی' باہر بھی۔''

وہ ایک آنکھ بند کر کے خباثت سے مسکرائے اور کیبن سے باہر نکل کر امثل کی میز کے پاس آ کھڑے ہوئے۔

''مس امثل! یہ کل آپ آفس کے بعد کہاں جا رہی تھیں۔ اللہ پاک کی قسم وہ لباس آپ پر بہت جچ رہا تھا۔ آفس میں اس لباس پر پابندی تو نہیں ہے نا جی۔''

امثل کا رنگ یکدم سرخ ہوا اور اس نے بمشکل اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے اپنے لہجے کو قدرے نرم کرتے ہوئے کہا۔

''غفور صاحب! کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آفس کے بعد آپ میرا تعاقب کیوں کر رہے

تھے؟''

''تعاقب کہاں مس امثل! وہ تو بس اچانک ہی نظر پڑ گئی۔ اللہ پاک کی قسم آنکھیں پھٹ گئیں آپ کو اس ماڈرن لباس میں دیکھ کر۔''

''آپ کی دور کی نظر کمزور لگتی ہے غفور صاحب! بہتر ہے کہ عینک لگوا لیں۔''

''اللہ پاک کی قسم مس امثل! میری نظر تو ماشاءاللہ آسمان پر اڑتی چڑیا کے پَر تک گن لیتی ہے۔ آپ تو مس امثل قیامت ڈھا رہی تھیں۔ ہائے داوے۔''

''پلیز غفور صاحب!'' امثل کی برداشت کی حد ختم ہونے والی تھی کہ فریدوں اپنی سیٹ سے اٹھ کر چلا آیا۔

''کیا بات ہے غفور صاحب!'' اس نے پیچھے سے آ کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ اچھلے۔

''ارے یہ تم فریدوں! ڈرا دیا اللہ پاک کی قسم۔''

''ہم بھی سنیں' کیا سنا رہے ہیں؟''

''وہ جی کچھ نہیں' بس ایسے ہی بتا رہا تھا مس امثل کو۔ کل ایک خاتون کو دیکھا' بالکل دور سے مس امثل کی طرح لگیں۔ بس ذرا ماڈرن بہت تھیں۔''

''خواتین کو اتنے دھیان سے مت دیکھا کریں غفور صاحب! اللہ پاک کو پسند نہیں ہے۔ گناہ ہے نامحرم پر نظر ڈالنا۔''

فریدوں کے ہاتھ کا دباؤ ان کے کندھوں پر بڑھا تو انہوں نے اس کے ہاتھ اٹھائے۔

''بڑی جان ہے بھئی! کندھے ٹوٹے جا رہے ہیں اور ہم تو فریدوں جی! توبہ جو کسی نامحرم پر ایک سے دوسری نظر ڈالیں۔ توبہ ہے جی۔''

وہ اپنی سیٹ کی طرف بڑھ گئے اور امثل نے شکر کا سانس لیتے ہوئے ایک تشکر بھری نظر فریدوں پر ڈالی اور پھر فائل پر جھک گئی۔

❖❖❖

''ثمین!'' تیمور عباس نے کھلے دروازے کا پردہ ہٹا کر اندر جھانکا۔ ''پیکنگ ہو گئی گڑیا؟''

درثمین نے مڑ کر ایک نظر اسے دیکھا اور پھر شیلف سے کتابیں اٹھا کر بیگ میں رکھنے لگی۔

''ناراض ہیں؟'' تیمور عباس اندر چلا آیا لیکن درثمین بدستور اپنے کام میں مصروف رہی۔

''بہت خفا ہیں۔'' وہ اس کے پیچھے سے ہو کر اس کے سامنے بیڈ کے کنارے پر ٹک گیا لیکن درثمین نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ اس کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے نیچے رخساروں پر گہری سرخی تھی۔ عباس کے دل کو جیسے کسی نے زور سے بھینچا ہو۔ وہ یقیناً بہت زیادہ روئی تھی۔

''آئی ایم سوری ثمین! میں نے ملک صاحب سے بہت کہا لیکن.....'' درثمین نے بیگ کی

زپ بند کی اور اٹھ کر سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔
''ہمیں کب جانا ہے؟'' وہ بے حد سنجیدہ تھی۔
''آج ہی کسی وقت۔ ابھی ملک صاحب کے پاس کچھ مہمان آئے ہوئے ہیں' مہمانوں کے جانے کے بعد بات کریں گے وہ۔''
''کیوں' کیا آپ نے ٹکٹ نہیں منگوایا تھا؟''
''ہاں' آپ کا اور اپنا' لیکن اب ملک صاحب بھی ساتھ چلیں گے' اس لیے نو بجے والی فلائٹ سے نہیں جاسکیں گے اور یہ بھی ممکن ہے' آج جانا کینسل ہو جائے۔''
''او کے۔'' درثمین نے تیمور عباس کی طرف نہیں دیکھا۔ ''میں تیار ہوں جب جانا ہو تو بتا دیجئے گا۔''
''لیکن پہلے اپنی ناراضی تو ختم کریں ثمین! بخدا میرا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ کی ناراضی سے مجھے تکلیف ہو رہی ہے اور یقین کریں میں آپ کے جانے کے بعد بہت بے سکون رہوں گا۔ اگر آپ اس طرح ناراض رہیں۔'' تیمور عباس نے سنجیدگی سے کہا۔
''لیکن عباس! آپ بابا کو سمجھا تو سکتے تھے' قائل تو کر سکتے تھے نا۔'' پہلی بار درثمین نے نگاہ اٹھا کر تیمور عباس کو دیکھا۔ گو عباس اس سے سولہ برس بڑا تھا لیکن وہ اور سعدون ہمیشہ اس کا نام لے کر ہی بلاتے تھے۔
''کوشش کی تھی میں نے۔''
''جھوٹ' آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔'' درثمین ایک دم پھٹ پڑی۔ ''آپ نے بالکل بھی بابا سے بات نہیں کی۔ آئی نو' اگر آپ بابا جان سے بات کرتے تو بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ بابا آپ کی بات نہ مانتے۔''
''آپ یقین کیوں نہیں کرتیں درثمین!'' تیمور عباس نے زچ ہو کر اسے دیکھا۔
''درثمین لمحہ بھر یونہی نظریں جھکائے ہونٹ کاٹتی رہی پھر سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''لیکن آپ کو یہ تو پتا ہو گا نا کہ بابا مجھے ہاسٹل کیوں بھیجنا چاہ رہے ہیں؟''
''وجہ میں آپ کو بتا چکا ہوں۔'' تیمور عباس کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔
درثمین کی نیلی آنکھوں میں اضطراب نے کروٹ لی۔ ''میں اصل وجہ پوچھ رہی ہوں۔''
''میرے خیال میں تو یہی اصل وجہ ہے۔''
درثمین کچھ دیر یونہی سر اٹھائے تیمور عباس کی طرف دیکھتی رہی۔ ''او کے' یہی وجہ ہو گی لیکن مجھے یہاں اس گھر میں بالکل تنہائی محسوس نہیں ہوتی۔ مجھے یہاں بابا کا انتظار رہتا ہے۔ کم از کم دس بارہ دن بعد میں انہیں دیکھ لیتی ہوں۔ ہم ایک ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ بھلے بابا کھانے کے دوران مسلسل آپ سے ہی باتیں کیوں نہ کرتے رہیں لیکن مجھے انہیں سننا اچھا لگتا ہے پھر یہاں اس گھر میں آپ بھی تو ہیں عباس! اور وہاں ہاسٹل میں تو نہ بابا ہوں گے نہ آپ۔''

''میں آپ سے ملنے آتا رہوں گا۔'' تیمور عباس نے تسلی دی۔
''ہاں جیسے سعدون سے ملنے جاتے ہیں' مہینے میں ایک بار۔'' اس نے آہستگی سے کہا اور پھر ملتجی نظروں سے اسے دیکھا۔
''پلیز عباس! آپ...... آپ بابا سے ایک اور بار بات کریں۔ انہیں کہیں نا کہ وہ مجھے اور سعدون کو یہاں رہنے دیں' اسی گھر میں' اپنے پاس۔''
''آپ خود کیوں نہیں کر لیتیں ملک صاحب سے بات۔'' تیمور عباس جھلا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ خود کب چاہتا تھا کہ وہ یہاں سے جائے لیکن ملک صاحب نے اس کی بات پر غور ہی نہیں کیا تھا۔
''تم نہیں جانتے عباس! جو میں سوچ رہا ہوں اور پھر میرا اب کراچی جلد جلد آنا ممکن نہیں رہا۔ بلکہ میں سوچ رہا ہوں ہوٹل بھی سیل کر دوں۔ البتہ گھر سیل نہیں کروں گا۔''
''آپ کو چوہدری جہانداد سے خطرہ ہے کہ......'' تیمور عباس نے پوچھا تھا۔
''نہیں' اس طرح کا تو نہیں جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ البتہ میرے الیکشن میں حصہ لینے کا سن کر سنا ہے وہ بہت تلملایا ہے۔'' ملک فیروز خان مسکرائے تھے۔
''آپ اپنے آبائی علاقے سے ہی کھڑے ہوں گے۔''
''ہاں' ظاہر ہے۔'' ملک فیروز خان کچھ سوچ رہے تھے۔
''ٹھیک ہے' میں خود کر لوں گی۔'' درثمین نے ایک ناراض نظر اس پر ڈالی۔ ''جب مہمان چلے جائیں تو بتا دیجئے گا۔''
ایک ہلکی سی مسکراہٹ نے عباس کے لبوں کو چھوا اور وہ ہولے سے سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔
درثمین نے پاؤں سے بیگ کو ٹھوکر ماری اور تکلیف کی شدت سے کراہ کر رہ گئی۔
''اور اگر میں نہ جاؤں تو بھلا بابا مجھ سے زبردستی کر سکتے ہیں۔'' اس نے سوچا اور اطمینان سے بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر میز پر پڑا اخبار اٹھا کر دیکھنے لگی۔ کمرے میں مدھم مدھم گواچی کی خوشبو بکھری تھی۔
خوشبو کے معاملے میں عباس کا ٹیسٹ بہت اچھا تھا۔ وہ گوانچی کا آفٹر شیو لوشن اور گواچی کا ہی پرفیوم استعمال کرتا تھا۔ درثمین کو یہ خوشبو بہت پسند تھی۔ وہ اخبار سامنے رکھے جملے اور لفظ جوڑتی رہی کہ بابا جان سے یہ کہے گی' وہ کہے گی لیکن جب کچھ دیر بعد بابا جان کے بلانے پر وہ ان کے سامنے بیٹھی تھی تو سارے لفظ اور سوچے ہوئے جملے جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔
''تم ہوسٹل نہیں جانا چاہتیں' عباس نے بتایا ہے۔''
''جی بابا!'' بمشکل اس کے ہونٹوں سے آواز نکلی تھی۔ وہ عباس کے سامنے تو لڑتی' جھگڑتی' بحث کرتی' ملک فیروز خان کے فیصلوں کو رد کرتی تھی لیکن ان کے سامنے وہ کچھ بول ہی نہ پاتی تھی۔ ایک طرف بیٹھے عباس نے سر جھکا کر لبوں پر بے اختیار امڈ آنے والی مسکراہٹ کو چھپایا

لیکن درثمین نے اس کی مسکراہٹ دیکھ لی تھی۔ تب ہی ایک قہر آلود نظر اس پر ڈالی۔

"میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔" ملک فیروز خان نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ "سعدون پہلے سے ہی لاہور میں ہے۔ یہاں کا ہوٹل میں فروخت کر رہا ہوں۔ بھائی پھیرو والی مل میرے لیے مسئلہ بنی ہوئی ہے۔ وہاں اب عباس مستقل رہے گا تو ظاہر ہے یہاں تمہارا بالکل اکیلے رہنا ہرگز مناسب نہیں۔"

اس نے شاکی نظروں سے تیمور عباس کی طرف دیکھا۔ کم از کم یہ بات وہ اسے پہلے بھی بتا سکتا تھا لیکن ملک صاحب کا یہ فیصلہ خود اس کے لیے بھی غیر متوقع تھا۔

"پھر میرا بھی اب یہاں جلد آنا ممکن نہیں۔ میں وہاں ملتان سے ہی الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہوں، اس لیے میرا "ملک ہاؤس" میں رہنا ضروری ہے۔ دادو والی مل میں بھی کبھار چکر لگے گا۔ یہاں کراچی کا معاملہ آہستہ آہستہ سمیٹ رہا ہوں۔"

"اور گھر...... کیا گھر بھی فروخت کریں گے؟" درثمین کی نیلی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

اسے اس گھر سے بہت محبت تھی، یہاں اس کی بہت سی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ بچپن سے لے کر اب تک۔

"نہیں، یہ گھر تمہاری ماں کا ہے اور اس کی وصیت کے مطابق اب تمہارا ہے۔ یہاں چوکیدار اور ایک ملازم ہوگا۔ جب تک عباس یہاں ہے، وہ بھی ادھر ہی رہے گا لیکن جلد ہی میں لاہور میں گھر لے رہا ہوں۔"

"تو بابا! پھر میں اور سعدون لاہور والے گھر میں آپ کے ساتھ رہیں گے نا۔" اس کی نیلی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں۔

ملک فیروز خان نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے تیمور عباس کی طرف دیکھا۔

"عباس! آج کی سیٹ کینسل کروا دو۔ کل کسی وقت کی فلائٹ سے میں اور ثمین لاہور جائیں گے، تم فی الحال ہوٹل کے سلسلے میں فائنل بات ہونے تک یہیں رکو گے۔"

"جی ملک صاحب!" تیمور عباس نے ایک نظر سر اٹھائے ملک فیروز خان کی طرف دیکھتی درثمین کو دیکھا اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ درثمین وہیں بیٹھی ملک فیروز خان کو دیکھ رہی تھی۔

سرخ و سپید رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، کشادہ پیشانی، کنپٹیوں کے پاس کہیں کہیں سفید بال۔ بہت زبردست پرسنیلٹی تھی ان کی۔ سعدون میں بہت مشابہت ہے ان کی، بس آنکھوں کے رنگ کا فرق تھا۔ سعدون کی آنکھیں اس کے جیسی تھیں، نیلی۔

"سعدی بڑا ہو کر بالکل آپ جیسا لگے گا۔" بے اختیار ہی اس کے لبوں سے نکلا۔

"تب ہی اتنی دیر سے بغور میرے چہرے کا مطالعہ کیا جا رہا تھا۔" ملک فیروز خان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی۔ درثمین پوری آنکھیں کھولے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اپنی سترہ سالہ زندگی میں شاید پہلی بار اس نے اپنے سامنے ملک فیروز خان کو مسکراتے

دیکھا تھا اور اس مسکراہٹ نے ان کے چہرے پر ایک نرم سا تاثر پیدا کر دیا تھا، ورنہ چہرے سے ہمیشہ وہ بہت سخت گیر اور خشک مزاج لگتے تھے۔

"بابا! آپ مسکراتے ہوئے بہت خوبصورت لگتے ہیں۔"

وہ آج شاید پچھلے سارے ریکارڈ توڑنے پر آمادہ تھی، ورنہ بابا کے سامنے تو وہ کہنے والی بات بھی نہ کہہ پاتی۔

"فیروز! تمہارے ہونٹوں پر مسکراہٹ یوں طلوع ہوتی ہے جیسے سیاہ بدلیوں کی اوٹ سے اچانک سورج نکل آئے یا چاند۔ تم مسکرانے میں اتنی کنجوسی نہ کیا کرو فیروز! تمہیں پتا نہیں ہے مسکراتے ہوئے تم کتنے دلکش لگتے ہو۔"

دل کے اندر کسی یاد نے چٹکی بھری تو چہرے کا نرم تاثر گہری سنجیدگی تلے چھپ گیا۔ انہوں نے درثمین کی طرف سے نظریں چرا کر ٹیبل پر پڑی فائل اٹھالی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ویسا ہی معصوم سا تاثر تھا جس میں ان کے لیے محبت کے رنگ جھلملا رہے تھے۔

وہ خوبصورت تھی لیکن اس میں زہرہ کی سی کوئی بات نہ تھی۔ ہاں بس آنکھیں ویسی ہی تھیں۔ گہری، نیلی جھیل ایسی اور ان جھیلوں کے گرد پہرہ دیتی پلکوں کی لانبی باڑیں۔

ملک فیروز خان خاموشی سے فائل کی ورق گردانی کرنے لگے۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی، ہاتھ گود میں دھرے، کبھی کبھی نگاہیں اٹھا کر ملک فیروز خان کو فائل کی ورق گردانی کرتے ہوئے بھی دیکھ لیتی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی انہیں کام کرتے ہوئے دیکھتی رہے اور بابا کبھی کبھی فائل سے نظر اٹھا کر اس پر ایک نظر ڈال کر مسکرا دیں۔ ایسی مسکراہٹ جو ان کے پورے چہرے کو روشن کر دے لیکن وہ تو اسے قطعی نظر انداز کیے فائل میں سر دیے بیٹھے تھے۔ ہولے ہولے اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتی گئی اور وہ کھڑی ہوگئی۔

"اپنی ضرورت کی ہر چیز رکھ لینا۔ بہت جلد یہاں آنا ممکن نہیں ہوگا۔ بلکہ میرا خیال ہے طویل عرصہ تک۔"

انہوں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ اس کا دل بے طرح مچلا کہ بابا ایک بار اس کی طرف سر اٹھا کر دیکھیں اور ویسے ہی مسکرا دیں جیسے پہلے مسکرائے تھے۔ ایسے ہی نرم لہجے میں بات کریں جیسے ابھی کچھ دیر پہلے کی تھی لیکن وہ سر جھکائے فائل دیکھ رہے تھے۔

"شاید بابا کو مجھ سے محبت نہیں، بالکل بھی نہیں۔"

ہمیشہ کی طرح اس نے سوچا اور پورچ کی سیڑھیوں پر آ کر بیٹھ گئی۔ جب سے اس نے چھوٹی چھوٹی باتوں پر غور کرنا اور انہیں محسوس کرنا شروع کیا تھا تو سب سے پہلے بابا کی بے اعتنائی کھلی تھی۔ وہ اس پر بہت کم توجہ دیتے تھے۔

اس نے کبھی بابا کو خود سے بات کرتے ہوئے، ہنستے ہوئے یا مسکراتے نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے برعکس اگر وہ گھر پر ہوتے تو سعدون کو پھر بھی کچھ نہ کچھ توجہ دیتے۔ کئی بار سعدون کی کسی

بات پر ان کے لبوں پر مسکراہٹ بھی آتی تھی بلکہ جب وہ ملتان کے قریب اپنے گاؤں والی حویلی میں تھے تو بابا اکثر سعدون کو اپنے کمرے میں بٹھائے اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی کرتے تھے لیکن اسے انہوں نے کبھی بطور خاص اپنے کمرے میں نہیں بلایا تھا بلکہ ایک دو بار تو انہوں نے سعدون کو اپنے کمرے میں ہی سلا لیا تھا۔ تب وہ سات سال کی اور سعدون پانچ سال کا تھا اور اس روز وہ بہت روئی تھی اور بہت ضد کی تھی اس نے بابا کے کمرے میں سونے کے لیے لیکن عباس نے اسے بہلا لیا تھا پھر تعلیم کی غرض سے انہوں نے کراچی والی کوٹھی میں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہاں عباس مستقل ان کے ساتھ تھا جبکہ وہ خود آتے جاتے رہتے تھے سعدون کو گلے لگا کر پیار کرتے' اس کی پڑھائی کا پوچھتے اور اس کی طرف ایک سرسری سی نظر ڈال لیتے۔

''کیسی ہو؟''

اور وہ جو دس پندرہ دنوں میں ڈھیروں باتیں اس کے دل میں جمع ہو جاتی تھیں اور وہ انہیں لفظ دیتی رہتی تھی اندر ہی مر جاتیں۔ بابا ہفتہ دس دن رہ کر واپس ''ملک ہاؤس'' یا مِل چلے جاتے لیکن یہ ہفتہ دس دن وہ بہت ہی خوش رہتی تھی۔ کھانے کی ٹیبل پر ناشتہ' لنچ' ڈنر وہ بابا کے ساتھ کر کے بہت خوش رہتی تھی۔ اس نے اس گھر میں ہی ہوش سنبھالا تھا' اس لیے اس گھر سے محبت لازمی تھی۔

اور ہاسٹل کا کمرہ جانے کیسا ہوگا؟ روم میٹ کیسی ہوگی اور پتا نہیں دل لگے گا بھی یا نہیں اور وہاں کیا میں سعدی سے مل سکوں گی یا نہیں۔ بابا اور عباس ملنے آئیں گے یا نہیں؟

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ کچھ دیر دھندلائی نظروں سے لان کو' فوارے کو' بڑے سے براؤن گیٹ کو' پورچ میں کھڑی دونوں گاڑیوں کو دیکھتی رہی پھر گھٹنوں پر سر رکھ کر رونے لگی۔

''ثمین!'' عباس کی آواز پر اس نے سر نہیں اٹھایا۔

''آپ رو رہی ہیں۔'' اب کے اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''ہاں' رو رہی ہوں۔'' اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا۔

''کیوں رو رہی ہیں آپ؟'' وہ اس کے قریب ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

''آپ کے خیال میں مجھے خوشی سے قہقہے لگانے چاہئیں' ناچنا چاہیے کہ میں اپنا گھر چھوڑ کر ہاسٹل میں رہنے جا رہی ہوں۔''

''نہیں' خیر میرا ایسا بھی کچھ خیال نہیں ہے۔'' عباس نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

''کیوں اپنی ان خوبصورت آنکھوں پر ظلم کر رہی ہیں۔'' عباس کی آنکھوں میں ہلکی سی شرارت تھی۔

''میری مرضی۔'' اس نے کندھے اچکائے۔ ''آنکھیں بھی میری ہیں اور آنسو بھی میرے۔ میں جو چاہے کروں۔''

بے اختیار عباس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی اور وہ جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''بیٹھیں۔'' عباس نے ہاتھ پکڑ کر اسے بٹھا لیا۔

''اس طرح رو رو کر اپنے آپ کو کیوں ہلکان کر رہی ہیں ثمین! ملک صاحب نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ فیصلے کیے ہیں۔ زندگی میں تو بہت مشکل مقام آتے ہیں در ثمین! آپ اتنی سی بات پر گھبرا گئیں۔ آپ کو یہاں' اس گھر میں رہنا پسند ہے نا۔ تو آپ نے سنا تھا ملک صاحب کہہ رہے تھے ''قصر زہرہ'' صرف آپ کا ہے۔ جب آپ کی شادی ہو جائے گی تو اپنے میاں کے ساتھ یہاں ہی آ کر رہ لیجئے گا۔''

اس نے غصیلی نظر اس پر ڈالی۔ ''اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں آپ......''

''یہ زندگی ہے ثمین! یہاں بچھڑنا' ملنا' جدا ہونا پھر ملنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ لوگ تو اپنی عزیز ترین ہستیوں سے بچھڑ جاتے ہیں۔ یہ تو پھر چونے' پتھر' اینٹ کی چار دیواری ہے اور آپ اسے ہمیشہ کے لیے نہیں چھوڑ رہیں۔''

''آپ کے لیے۔'' اس نے ایک طنز بھری نظر عباس پر ڈالی۔ ''یہ ایک اینٹ' پتھر' چونے کی چار دیواری ہے لیکن میرے لیے یہ سارے کا سارا ''قصر زہرہ'' ایک جیتا جاگتا سانس لیتا وجود رکھتا گھر ہے۔ اس گھر میں میری ماں نے زندگی کی خوشیاں دیکھی تھیں۔ اسی گھر میں' میں نے اس کی گود میں آنکھ کھولی تھی۔ یہیں اس کی ہنسی بکھری ہے۔ یہاں وہ چلتی پھرتی ہوگی۔ آپ کو کیا پتا عباس! یہ ''قصر زہرہ'' مجھے کتنا عزیز ہے۔ اس کے ایک ایک کونے سے مجھے اپنی ماں کی خوشبو آتی ہے' اس کی ہنسی سنائی دیتی ہے۔''

عباس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ''آپ اتنی حساس ہیں ثمین! میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا لیکن گڑیا! اتنا حساس ہونا اچھا نہیں ہوتا۔''

''میں گڑیا نہیں ہوں تیمور عباس! میں ایک جیتی جاگتی انسان ہوں اور میرا نام در ثمین ہے۔'' وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے اندرونی دروازہ دھکیلتے ہوئے اندر چلی گئی۔ عباس حیران سا بیٹھا اسے جاتے دیکھتا رہا۔

❁❁❁

چوہدری جہانداد نے دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے اپنی دائیں مونچھ مروڑتے ہوئے اسے دیکھا۔

''تو تم قیمت جاننا چاہتی ہو؟'' وہ مسکرائے اور ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔

وہ آج بھی اسی لباس میں تھی۔ وہی ریڈ شرٹ' سیاہ جینز اور گلے میں لٹکا لمبا سیاہ اسکارف اور کاندھے پر سیاہ شولڈر بیگ اور بالوں کی سختی سے باندھی ہوئی پونی۔

''ہاں ظاہر ہے میری آمد کا مقصد ہی یہ ہے تو۔''

''اور اگر میں کہوں کہ مجھے اس کہانی سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں۔''

''تو کوئی بات نہیں۔'' وہ کھڑی ہوگئی۔ ''میں چلتی ہوں۔''

''بیٹھو لڑکی!'' چوہدری جہانداد نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''کیا تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ ملک فیروز خان کے بچوں کی ماں ایک گائیکہ کی بیٹی اور ایک سابقہ مشہور ماڈل گرل تھی۔ تو یہ بات کم و بیش سب ہی جانتے ہیں۔''

انہوں نے اب بائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے بائیں مونچھ مروڑنا شروع کر دی تھی۔

لڑکی ذرا چونکی اور پھر مسکرائی۔

''نہیں' گو یہ بات بھی اس کہانی کا ایک حصہ ہے لیکن میرے پاس اس سے زیادہ سنسنی خیز انکشافات ہیں۔''

''اس گائیکہ کا تعلق ریڈ لائٹ ایریے سے تھا۔''

''غالباً یہ بات بھی کم و بیش سب ہی لوگ جانتے ہوں گے۔'' لڑکی بڑے اعتماد سے چوہدری جہانداد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھ رہی تھی۔

''اوہ......'' چوہدری جہانداد ہونٹ سکیڑے اور دونوں ہاتھ ٹیبل پر رکھ کر تھوڑا سا آگے جھکا۔

''دس ہزار کافی ہوں گے؟''

''دس ہزار......صرف دس ہزار؟'' لڑکی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم کتنی رقم کی ڈیمانڈ کر رہی ہو۔''

''پانچ لاکھ۔'' لڑکی کھڑی ہوگئی۔

''پانچ لاکھ۔'' چوہدری جہانداد کی آنکھوں میں حیرت سی اتری۔ ''محض چند فضول باتوں کی قیمت پانچ لاکھ۔''

''میرا خیال ہے' میں غلط جگہ آ گئی ہوں۔''

''تمہارا خیال بالکل صحیح ہے بی بی! تم جا سکتی ہو۔'' چوہدری جہانداد نے سیدھا ہوتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اسے جانے کا اشارہ کیا۔ ''مجھے تمہاری اس بے ہودہ کہانی سے کوئی دلچسپی نہیں اور رہی الیکشن میں جیتنے کی بات تو وہ بہر حال میں ہی جیتوں گا۔''

لڑکی کی آنکھوں میں ہلکی سی مایوسی نظر آئی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ نارمل نظر آنے لگی۔ اس نے بیگ کو دائیں کندھے سے بائیں کندھے پر منتقل کیا۔

''مجھے واقعی یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' وہ زیر لب بڑبڑائی۔

''اگر میں تمہیں یہاں روکنا چاہوں تو کوئی بھی پتا نہیں چلا سکے گا کہ تم کہاں سے آئی تھیں

''اس صورت میں آپ کو بھلا کیا فائدہ ہوگا چوہدری صاحب! سوائے اس کے کہ آپ کے گناہوں میں ایک اور گناہ کا اضافہ ہو جائے گا۔ آپ کہانی تو نہ جان پائیں گے اور اگر میں نے آپ کے کارندوں کے ظلم و ستم اور مار پیٹ سے تنگ آ کر کچھ کہہ بھی دیا تو آپ کے پاس کیا

ثبوت ہوگا کہ میں نے سچ کہا ہے۔'' لڑکی نے بڑے اعتماد سے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

''سنو لڑکی!'' چوہدری جہانداد نے اسے پکارا۔ ''میں بیس ہزار دینے کو تیار ہوں۔ یہ بھی محض اپنے تجسس کے لیے' ورنہ مجھے ایسی خاص دلچسپی نہیں ہے تمہاری کہانی سے۔''

''میں سوچوں گی اور چند دن تک آپ کو بتا دوں گی۔'' لڑکی نے مڑ کر کہا

چوہدری جہانداد نے غصے سے میز پر مکا مارا۔ اس لڑکی نے خوامخواہ انہیں الجھا دیا تھا۔ کبھی فیروز خان ان کا دوست تھا اور فیروز خان کی زندگی میں زہرہ جمال کے سوا اور کیا راز تھا۔

اور پھر یہ بھی راز کب تھا۔ کتنی دھوم دھڑام سے شادی ہوئی تھی۔ ملک فیروز خان اور اس وقت کی خوبصورت ترین ماڈل زہرہ جمال کی۔ اخبارات میں تصاویر آئی تھیں اور پھر ایک کامیاب ازدواجی زندگی دونوں نے گزاری تھی اپنے بیٹے کی پیدائش کے دو ماہ بعد آٹھ سالہ کامیاب زندگی گزارنے کے بعد زہرہ جمال وفات پا گئی تھی۔ اس کی موت بالکل اچانک ہوئی تھی اور موت سے قبل انہوں نے کتنی ہی چالیں چل ڈالی تھیں کہ کسی طور زہرہ جمال فیروز خان سے متنفر ہو جائے کیونکہ کسی زمانے میں وہ خود بھی زہرہ جمال کے خواستگار تھے اور مہینوں اس غم میں مبتلا رہے تھے کہ زہرہ جمال نے ان کے بجائے ملک فیروز خان سے شادی کر لی تھی۔

ملک فیروز خان نے زہرہ کے بعد پھر شادی نہ کی تھی۔ گو وہ کاروبار میں ان کے حریف تھے۔ ان کا تعلق ایک ہی علاقے سے تھا اور وہ یہ بات اچھی طرح سے جانتے تھے کہ ملک فیروز خان کا کردار بے داغ ہے پھر یہ لڑکی......

''ضرور یہ کوئی سازش ہے یا چال۔ ملک فیروز خان کے آس پاس بہت ہوشیار لوگ ہیں۔ مجھے اس میں الجھا کر وہ میری توجہ الیکشن کی طرف سے ہٹانا چاہتے ہیں اور یہ تھا بھی سچ۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ خوامخواہ ہی ہیجان میں مبتلا رہے تھے۔ مسلسل ان کا ذہن اس لڑکی اور اس کہانی کی طرف رہا تھا' اسی لیے وہ وہاڑی کے جلسے میں بھی صحیح طرح سے تقریر نہیں کر پائے تھے اور ان کے رفقاء کے بقول یہ جلسہ اتنا کامیاب نہیں رہا تھا جتنا کہ وہاڑی میں ہونے والا ملک فیروز خان کا جلسہ۔'' انہوں نے غصے سے بیل پر ہاتھ مارا۔

''جی سر!'' چپڑاسی اندر آیا۔ ''اگر دوبارہ یہ لڑکی یہاں آئے تو اسے باہر سے ہی روانہ کر دینا۔ میرے آفس میں بھیجنے کی ضرورت نہیں۔''

''جی بہتر سر!''

''اور یہ کاظم لاہور سے آیا کہ نہیں؟''

''نہیں سر!''

چوہدری جہانداد نے اسے جانے کا اشارہ کر کے کاظم کا نمبر ملایا لیکن اس کا موبائل پچھلے سات دن کی طرح آف تھا۔ دو دن کا کہہ کر جانے والا کاظم آج آٹھ دن ہو گئے تھے' واپس

نہیں آیا تھا۔ وہ کاظم کے اس مزاج سے بہت نالاں تھے۔ ہفتوں کے لیے غائب ہوجاتا تھا۔ اسے اپنی دلچسپیاں بہرحال بہت عزیز تھیں۔ چوہدری جہانداد کے مسائل کو سن کر ہنسی میں اڑا دیتا۔

''اوہ ڈیڈ! یہ کوئی پرابلمز نہیں ہیں۔'' کاظم کو باہر بھیج کر شاید انہوں نے غلطی ہی کی تھی' اس لیے اعظم اور معظم کو باہر بھیجنے کا ان کا بالکل ارادہ نہیں تھا۔ اعظم اسلام آباد میں قائداعظم یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس سی کررہا تھا اور وہ کاظم کے مقابلے میں زیادہ سمجھدار اور باشعور تھا۔ مجھے اس سلسلے میں اعظم سے مشورہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے سوچا اور اعظم کا موبائل نمبر ملایا۔

''تم کب تک لاہور آرہے ہو اعظم؟''

''میرا ارادہ اگلے ویک اینڈ پہ آنے کا ہے۔''

''نہیں پتر! اسی ویک اینڈ پر آجاؤ' مجھے تم سے ایک مشورہ کرنا ہے۔''

''جی' کوشش کروں گا۔''

''کوشش نہیں پتر! آنا ہے ہرصورت۔''

''آجاؤں گا۔ خیریت ہے نا' اماں تو ٹھیک ہیں نا؟''

''ہاں ہاں' ٹھیک ہے وہ۔ بس اپنا ایک مسئلہ ہے۔ ہاں' کاظم تو نہیں آیا تمہارے پاس؟''

''نہیں لیکن میرا خیال ہے وہ اسلام آباد میں ہی ہیں۔ کل رات انہیں یہاں ایک شاپنگ سینٹر میں دیکھا تھا' میرے ایک دوست نے۔''

''اچھا ٹھیک ہے پھر ہفتے کو ملاقات ہوگی' اللہ حافظ۔''

''اور اگر اعظم مشورہ دیتا ہے تو اس لڑکی کو پچاس ہزار کی آفر کردیتا ہوں۔'' تجسس انہیں بے چین کیے ہوئے تھا۔

''بھلا کیا' کیا راز ہوسکتا ہے۔ کیا چھپی ہوئی کہانی ہے ملک فیروز خان کی جس سے وہ بھی بے خبر ہیں۔''

وہ اپنے الیکشن کو بھول کر ایک بار پھر ملک فیروز خان اور اس کہانی کے متعلق سوچنے لگے جو بقول لڑکی کے سچ تھی' لفظ بہ لفظ اور جو الیکشن کا رخ بدل دے گی۔

انہوں نے پھر بیل پر ہاتھ مارا تاکہ وہ اس لڑکی کے متعلق دیا گیا آرڈر منسوخ کرسکیں۔

''جی سر!''

''سنو غلام حسین! وہ لڑکی آئے تو آنے دینا اسے۔'' اور بات مکمل کرکے وہ فون اپنی طرف کھسکا کر کوئی نمبر ملانے لگے۔

❖❖❖

''امثل!'' مسز فاروق نے آہستگی سے میز پر بکھرے کاغذات پر جھکی امثل کو پکارا۔

''جی ماما!'' کاغذات پر سے نظر ہٹا کر انہیں دیکھا۔

''مغرب ہونے والی ہے' ہومی ابھی تک نہیں آیا۔''

''اوہ ہاں' میں دیکھتی ہوں۔''

اس نے کاغذات سمیٹ کر فائل میں رکھے اور فائل الماری کے لاکر میں بند کرکے چابی میز کی دراز میں ڈال دی۔

''کیا وہ کھیلنے گیا ہے؟''

''نہیں۔ کہہ رہا تھا اپنے ایک ٹیچر کے پاس پڑھنے جارہا ہوں۔ آج کل بہت ذکر کرتا ہے اپنے ٹیچر کا۔ تنویر نام بتاتا ہے۔ ہروقت سر تنویر کی باتیں کرتا رہتا ہے۔''

''لیکن ماما! آپ کو اس وقت اسے نہیں جانے دینا چاہیے تھا پھر میں جو ہوں اسے پڑھانے کے لیے۔ اسے سر تنویر کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''تمہارے پاس وقت کہاں ہوتا ہے۔'' مسز فاروق کے لہجے میں شکوہ در آیا۔ ''آفس سے آتی ہو تو یہ فائل لے کر بیٹھ جاتی ہو یا پھر گھر سے نکل جاتی ہو۔''

''سوری ماما!'' اس نے جھک کر ان کی پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھ دیے۔ ''بس چند دن کی بات ہے ماما! میں دراصل کسی اچھی جاب کی کوشش میں ہوں۔ میں چاہتی ہوں آپ کا علاج اچھی طرح سے ہوسکے' اس لیے آفس کے بعد مصروف ہوجاتی ہوں۔''

''میرا علاج......'' وہ افسردگی سے مسکرائیں۔ ''میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ مجھ پر پیسہ مت ضائع کرو۔ اپنی اور ہومی کی فکر کرو۔''

''ماما! میں اور ہومی آپ سے ہیں۔ آپ کا ہونا ہم دونوں کے لیے بہت ضروری ہے۔ آپ جانتی ہیں نا اور ہاں' مجھے بتائیں ان مسٹر تنویر کا کوئی اتا پتا' فون نمبر وغیرہ۔''

''یہ تو ہومی نے بتایا نہیں لیکن روز آجاتا ہے عصر تک۔''

''کب سے جارہا ہے وہ۔''

''یہی کوئی تین چار دن سے اور بہت خوش ہے کہ سر بہت اچھا پڑھاتے ہیں' فیس وغیرہ بھی نہیں لیتے۔''

''آج کل کے دور میں اتنا مخلص کون ہوسکتا ہے ماما! کہ بغیر پیسوں کے اور مطلب کے وقت ضائع کرے۔''

''دنیا میں اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں بیٹا!''

''آج کل کے دور میں اچھے لوگ کہاں رہے ماما!'' امثل نے افسردگی سے کہا اور پریشان ہوکر کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

''تو کہاں پتا کروں اس کا۔''
''ظاہر سے پوچھ لو اس کے ساتھ ہی پڑھتا ہے۔ کیا خبر اسے پتا ہو سر تنویر کے گھر کا۔'' مسز فاروق پریشان سی ہو کر اٹھ بیٹھی تھیں۔
''آپ لیٹی رہیں ماما! میں جاتی ہوں۔ اگر ظاہر کو سر تنویر کا گھر پتا ہوا تو میں اسے ساتھ لے کر چلی جاؤں گی، فکر مت کیجئے گا۔''
مسز فاروق نے سر ہلا دیا تو وہ دروازے کی طرف بڑھی، تب ہی مین گیٹ کھلا اور سائیکل گھسیٹنے کی آواز آئی۔
''اوہ میرا خیال ہے ہومی آ گیا۔''
''اللہ تیرا شکر ہے۔'' مسز فاروق نے اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے اطمینان بھری سانس لی اور تکیے سے ٹیک لگالی۔
ہمایوں سائیکل برآمدے میں کھڑی کر کے اندر داخل ہوا۔
''کہاں رہ گئے تھے تم؟'' امثل نے اسے گھورا۔
''میری سائیکل کا ٹائر پنکچر ہو گیا تھا، اتنی دور سے گھسیٹتا ہوا لا رہا ہوں۔''
''لیکن تم گئے کہاں تھے؟''
''ماما کو پتا ہے سر تنویر کی طرف گیا تھا۔'' وہ کتابیں ایک طرف پھینک کر مسز فاروق کے بیڈ پر ہی بیٹھ گیا۔
''کون ہیں یہ سر تنویر؟'' امثل اپنی کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔
''ہمارے نئے سر ہیں، میتھ پڑھاتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا، اگر کوئی سوال سمجھ میں نہ آئے تو گھر آ جایا کرو۔''
''گھر کہاں ہے ان کا؟''
''وہاں ہی اسکول کے قریب۔''
''ان کے گھر میں اور کون کون ہوتا ہے؟'' وہ مسلسل سوال کر رہی تھی۔
''کوئی بھی نہیں، اکیلے ہوتے ہیں۔''
ہمایوں اب بے زار ہو گیا تھا اتنے سوالوں سے، اس لیے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
''تم آئندہ ادھر نہیں جاؤ گے، میں خود پڑھا دوں گی۔''
اس نے بھولے بھالے سے ہمایوں کو دیکھا۔ خوبصورت نیلی آنکھوں والے ہمایوں کو دیکھ کر ایک لمحہ کو تو جو دیکھتا ٹھٹک جاتا تھا اور ایک بار فریدوں نے کہا تھا۔
''امثل! ہومی کا خیال رکھا کرو، دیر تک باہر نہ رہا کرے۔''

اور وہ ہنس دی تھی۔
''وہ کوئی لڑکی ہے فریدوں۔''
''تم نہیں جانتیں باہر کا ماحول۔ ہم لوگ کس قدر پستی میں گرتے جا رہے ہیں۔''
اور پھر ان ہی دنوں پارک میں بارہ سالہ حمید کی لاش ملی تھی جس کی ماں ایک ہاسپٹل میں نرس تھی اور وہاں قریب ہی رہتی تھی۔ بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا اور تب سے ہی وہ ہمایوں کے متعلق بہت محتاط ہو گئی تھی۔
''کیوں، اتنے اچھے تو ہیں سر تنویر۔'' ہمایوں نے بحث کی۔
''میں نے کہہ دیا ہے نا نہیں جاؤ گے۔''
اس نے منہ پھلا لیا۔ ''وہ کون سا ٹیوشن فیس لیتے ہیں۔''
''نہ لیں لیکن تم نہیں جاؤ گے۔ باقی لڑکے بے شک جاتے رہیں۔''
''اور تو کوئی نہیں جاتا، وہ تو صرف مجھے ہی......''
''اور کوئی نہیں جاتا۔'' اب کے امثل چونکی۔
''ہاں، وہ تو صرف مجھے پڑھاتے ہیں کیونکہ میں انہیں اچھا لگتا ہوں۔''
''لیکن اب تمہیں ان کے پاس نہیں جانا، سمجھ لیا نا۔'' امثل نے اس بار سختی سے کہا تو مسز فاروق نے بھی پاس بیٹھے ہمایوں کا ہاتھ پکڑ کر اس پر بوسہ دیا۔
''میری جان! تمہاری آپی صحیح کہہ رہی ہیں۔ آئندہ تم مت جانا۔''
''نہیں جاؤں گا۔'' اس نے بدستور منہ پھلا رکھا تھا۔
''اتنے اچھے تو ہیں سر تنویر۔''
''ہوں گے لیکن کیا تمہاری آپی سے زیادہ اچھے ہیں۔'' مسز فاروق مسکرائیں۔
''نہیں، آپی تو آپی ہیں۔ ان سے اچھا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔''
امثل نے مسکرا کر اسے دیکھا اور اس کے گال پر چٹکی لی۔
''اور ہومی، ہومی ہے۔ میرا پیارا سا بھائی اور مجھے دنیا میں سب سے زیادہ پیارا۔''
''ماما سے بھی زیادہ۔'' ہمایوں کی نیلی آنکھوں میں شرارت تھی۔
''ماما...... ماما تو ہم دونوں کی ہیں اور ہم دونوں کو ساری دنیا سے زیادہ پیاری۔''
امثل نے مسز فاروق کی طرف دیکھا جو ابھی تک ہمایوں کا ہاتھ تھامے نیم دراز سی تھیں اور ان کے چہرے پر یکدم اضطراب کروٹیں لینے لگا تھا۔
''ہومی! ہمیشہ اپنی آپی کی بات ماننا، اسے کبھی اکیلا مت چھوڑنا۔ میں نہ رہوں تو اپنی آپی کا خیال رکھنا، اس کی ہر بات ماننا۔ تم دونوں کا ایک دوسرے کے سوا اور کوئی نہیں ہے اور یہ یاد رکھنا کہ تمہاری آپی کے علاوہ تمہارا اور کوئی ہمدرد نہیں۔''

''ماما!'' امثل اٹھ کر ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔
''آپ ایسی بات مت کیا کریں ماما! آپ ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ میں آپ کے ساتھ مل کر ہومی کی دلہن ڈھونڈوں گی' اسی جیسی پیاری پیاری۔''
اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور آواز بھی آنسوؤں سے بھیگ رہی تھی۔
''تم جانتی ہو ثوما! اور میں بھی کہ میں بہت دیر تم دونوں کے ساتھ نہیں رہ سکوں گی۔''
''ماما پلیز...... ایسا نہ کہیں۔'' امثل کی آنکھیں چھلک پڑیں۔
''میں کوشش کر رہی ہوں ماما! کچھ پیسہ مل جائے تو آپ کو باہر لے جاؤں۔ ماما! آپ کو کچھ نہیں ہوگا' کچھ بھی نہیں۔'' وہ یکدم ان سے لپٹ کر رونے لگی۔
''آپی! مت روئیں' مت روئیں۔'' ہمایوں اسے مسز فاروق سے الگ کرنے لگا تو مسز فاروق نے بازو پھیلا کر دونوں کو اپنے ساتھ لپٹا لیا اور آنسو ان کی آنکھوں سے بھی بہنے لگے تھے۔ وہ تینوں رو رہے تھے' جب فریدوں اور لالہ اندر داخل ہوئے۔
''ارے...... ارے یہاں کیا سین ہو رہا ہے بھئی۔'' فریدوں نے آواز کو خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔
امثل فوراً ہی سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور اس نے دونوں ہاتھوں کی پشت سے رخساروں کو پونچھا۔ مسز فاروق بھی سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ ان کے آنسو ابھی تک ان کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔ ہمایوں بھی سسکیاں لے رہا تھا۔
''ارے آنٹی! کیا ہوا؟'' لالہ نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان کے رخساروں کو پونچھا۔
''ان شاء اللہ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔''
''بیٹھو فریدوں!'' امثل نے کھڑے ہو کر اسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
''پاگل ہو تم بھی' بجائے اس کے آنٹی کو حوصلہ دو' خود بھی رونے لگیں۔'' اس نے امثل کو سرزنش کی اور ہمایوں کی طرف دیکھا۔
''اور یہ ہمارا شیر کیوں رو رہا ہے۔ اتنا بہادر بچہ ہے یہ تو۔''
اس نے ہمایوں کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور ایک بازو اس کے گرد حمائل کرتے ہوئے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ ''آپ کو پتا ہے مرد نہیں روتے۔''
''میں تو لڑکا ہوں۔''
ہمایوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو بے اختیار مسکراہٹ نے فریدوں کے لبوں کو چھوا اور اس نے اس کے سر پر پیار کیا۔
''پڑھائی کیسی جا رہی ہے میرے شیر کی۔''

''اچھی اور آج تو مجھے ایکسیلنٹ ملا ہے انگلش کے مضمون پر' دکھاؤں۔''
وہ ہاتھ چھڑا کر باہر بھاگ گیا تو فریدوں نے امثل کی طرف دیکھا۔
''بیٹھ جاؤ بے وقوف لڑکی! آنٹی کو پریشان کر دیا ہے۔''
''میں نے پریشان نہیں کیا' ماما خود ہی ایسی باتیں کرتی ہیں۔''
وہ بیٹھتے ہوئے بولی۔ مسز فاروق اب سنبھل گئی تھیں۔ لالہ ان کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھی تھی۔
''غلط تو نہیں کہتی فریدوں بیٹے! کیا بھروسہ کب زندگی کا چراغ بجھ جائے۔''
''دیکھا تم نے ماما کو۔''
''آنٹی! میں کئی ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جنہیں ڈائی لیسز کراتے ہوئے پندرہ پندرہ سال ہو گئے ہیں۔ آپ بھی ان شاء اللہ ٹھیک رہیں گی اور ڈاکٹر نے اگر کہا ہے تو آپ کو ڈائی لیسز کروالینا چاہئیں۔ میں کل ڈاکٹر عابد سے ٹائم لے لیتا ہوں تو آپ کو لے چلتا ہوں۔ وہ کیا کہتے ہیں۔''
''نہیں بیٹا! ابھی نہیں۔ اب تو کچھ بہتر ہوں۔ اجمل صاحب کی دوائی سے بہت فرق پڑا ہے۔''
''چلیں کچھ دن اور استعمال کر لیں یہ دوا لیکن ڈائی لیسز سے گھبرایئے مت۔''
''ایک دفعہ ڈائی لیسز کروالیا تو پھر تو بار بار کروانا پڑے گا بیٹا! میں تو چاہتی ہوں' جتنی دیر بچ سکوں' بہتر ہے اور پھر ڈائی لیسز پر خرچ بھی تو بہت آتا ہے۔''
''خرچ کی آپ بالکل فکر نہ کریں ماما!''
''کیسے نہ کروں فکر۔''
''میں نے کہا نا ہو جائے گا کچھ نہ کچھ۔''
''تمہارے نام کا زیور میں فروخت نہیں کروں گی ثوما!''
''ماما! میں وہ زیور لے کر کیا کروں گی جو آپ کے کام نہ آسکے۔ آپ کی زندگی ہمارے لیے زیور سے زیادہ اہم ہے اور آپ جانتی ہیں مجھے زیور وغیرہ قطعی پسند نہیں ہے۔''
''نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا نے دی۔'' فریدوں نے ماحول کو تبدیل کرنے کے لیے گنگنایا۔
''فریدوں! تم گانا کیوں نہیں شروع کر دیتے۔'' لالہ بھی موضوع بدلنا چاہتی تھی۔
''تمہاری آواز اچھی ہے۔ گانا گاؤ اور پیسہ کماؤ۔ شاعری تمہارے لیے میں کر دوں گی' مثلاً

میری محبوبہ...... ادھر تو دیکھو' ادھر تو دیکھو میری جاں
میں تمہارے لیے کب سے کھڑا ہوں یہاں
میری محبوبہ...... میری محبوبہ......

فریدوں اور امثل بے اختیار ہنس دیے۔ مسز فاروق کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''تمہارے مشورے پر غور کروں گا۔''

''ضرور غور کرنا۔ روں روں تو کر ہی لیتے ہو' بس تھوڑا سا سُر اور بنا لینا۔''

''یہ دیکھیے بھائی!'' ہومی اپنی کاپی لے آیا تھا۔

''ہاں ہاں' دکھاؤ یار!'' فریدوں نے کاپی اس کے ہاتھ سے لے لی۔

''خود لکھا ہے؟''

''جی۔''

''ظاہر ہے جرنلسٹ بہن کے بھائی ہو۔''

فریدوں کو ہمایوں سے باتیں کرتے دیکھ کر امثل اٹھ کھڑی ہوئی۔

''لالہ! تم ماما سے گپ لگاؤ' میں چائے بنا لاؤں۔''

''چائے کے ساتھ پاپڑ بھی تل لینا۔'' لالہ نے فرمائش کی۔ ''سادا چائے میرے حلق سے نہیں اترتی۔''

''تم نہ بھی کہتیں تو میں نے پاپڑ تلنے ہی تھے لیکن تم ہو سدا کی ندیدی۔''

''بیٹا! میں نے پھلکیاں بنا کر رکھی تھیں فریج میں' لے آنا۔''

مسز فاروق نے کہا تو اس نے جاتے جاتے پلٹ کر انہیں دیکھا۔

''ماما! آپ سے کتنی بار کہا ہے کہ خود کو مت تھکایا کریں۔''

''ہومی کو پسند ہیں اور پھر سارا دن فارغ بھی تو نہیں بیٹھا جاتا۔ ایسے تو پاگل ہی ہو جاؤں۔''

''املی کی چٹنی ڈھیر ساری ڈالنا۔'' لالہ نے پھر تاکید کی تو وہ مسکراتے ہوئے کچن میں چلی گئی۔

چائے دم دے کر اس نے ٹرالی میں باؤل اور چائے کے کپ رکھے اور فریج سے پھلکیاں نکالنے لگی تو فریدوں نے کچن کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''امثل!'' اس نے چونک کر فریدوں کو دیکھا۔

''ادھر کیا کرنے آئے ہو' میں چائے لا رہی تھی۔'' لاپروائی سے کہتے ہوئے اس نے فریج سے پھلکیوں والا باؤل نکال کر ٹرالی میں رکھا۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا تھا امثل!''

''کوئی بہت ضروری بات ہے؟''

''ہاں۔'' فریدوں سنجیدہ تھا۔ ''تم بار بار بے یقین کیوں ہو جاتی ہو ثوما!''

''تم سے کس نے کہا۔'' اس نے ٹرالی میں ٹی پاٹ رکھا۔

''تمہارے رویے نے ثوما! کبھی کبھی تم بالکل اجنبی لگنے لگتی ہو۔ جب تم اپنے دل کی بات مجھ سے چھپانے لگتی ہو۔''

''نہیں تو...... میں نے تو کچھ نہیں چھپایا تم سے۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو ثوما! میں جانتا ہوں تم پیسوں کے لیے پریشان ہو۔ یہ صرف تمہاری پریشانی تو نہیں ہے لیکن تم مجھ سے شیئر نہیں کر رہی ہو۔ میں نے تم سے کہا تھا نا ثوما! میں ہوں تمہارے ساتھ' ہر لحظہ' ہر آن۔ ڈائی لیسز اگر ضروری ہوا تو آنٹی کا ڈائی لیسز ضرور ہوگا۔ تم اس کے لیے فکر مت کرو' میں آج رات ڈاکٹر عابد سے وقت لے لوں گا اور پھر آنٹی کی رپورٹس ڈسکس کر لیں گے۔''

''تھینکس فریدوں!'' امثل نے نظر اٹھائے بغیر کہا۔

''اور میں اس تھینکس پر تمہیں تھپڑ مار سکتا ہوں لیکن آج لحاظ کر رہا ہوں' آئندہ ایسا نہ ہو۔ کیا مجھے ہر دس بارہ دن بعد اس بات کی تجدید کرنا چاہیے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں' تمہیں چاہتا ہوں' تمہارے دکھ سکھ الگ نہیں ہیں مجھ سے۔ یہ محض کتابی بات نہیں ہے کہ ہمارے درمیان من، تو کا فرق نہیں ہے۔ میں اپنی آخری سانس تک تمہارے ساتھ ہوں امثل! ہر مشکل' ہر دکھ میں' پھر تم جب اجنبیت برتتی ہو تو بہت غصہ آتا ہے مجھے۔''

امثل کی خوبصورت آنکھوں کی سطح گیلی ہوئی اور دو آنسو لڑھک کر رخساروں پر آ گئے۔

فریدوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر ان آنسوؤں کو اپنی انگلی پر چن لیا۔

''آئندہ اس طرح مت رونا امثل! ہم روئے تو ساتھ مل کر روئیں گے۔ نہیں تو ساتھ مل کر ہنسیں گے۔ یاد رکھنا امثل! تم ہو تو میں ہوں لیکن تمہیں تو بھول جاتا ہے سب' ہر دس دن بعد غیریت کا لبادہ اوڑھ کر بیٹھ جاتی ہو۔''

''تو ہر دس دن بعد تجدید کر دیا کرونا۔'' وہ آنسوؤں میں مسکرائی۔

''کیا...... یعنی میں ہر دس دن بعد محترمہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کہوں۔ آئی لو یو امثل!''

فریدوں نے گھور کر اسے دیکھا۔

''تو کیا حرج ہے۔'' وہ نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے مسکراہٹ روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اسے دیکھنے لگی اور فریدوں مبہوت سا اسے دیکھے جا رہا تھا۔

❖❖❖❖

''آپ نے بابا جان سے بات ہی نہیں کی ہوگی۔ میں جانتی ہوں۔'' وہ وزیٹنگ روم میں تیمور عباس کے بالکل سامنے بیٹھی اس سے جھگڑ رہی تھی۔

''میں نے بات کی تھی ثمین!'' تیمور عباس کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح ٹھہراؤ تھا' نرمی تھی' ملائمت تھی۔ اس کا لڑنا' جھگڑنا' بحث کرنا کوئی بھی بات اسے غصہ نہیں دلاتی تھی۔

''اور وہ نہیں مانتے' ہے نا۔'' وہ طنز سے ہنسی۔
ملک صاحب کا خیال ہے کہ فی الحال آپ ادھر ہی رہیں' یہی بہتر ہے۔''
''اور آپ وہاں رہیں' بابا جان کے لاڈلے ان کے پاس۔'' وہ غصے میں بھری ہوئی تھی' چھ ماہ ہوئے تھے۔ سعدون نے اسے بتایا تھا کہ بابا جان نے ڈیفنس میں گھر لے لیا ہے۔ ایک ویک اینڈ پر بابا جان اسے گھر لے گئے تھے۔
''گھر خوبصورت تو ہے مگر ''قصر زہرہ'' جیسا نہیں۔''
اور تب سے وہ ضد کر رہی تھی کہ اب اسے اور سعدون کو ہاسٹل سے نکال کر گھر لے جانا چاہیے۔
''ملک صاحب گھر میں بہت کم ٹھہرتے ہیں۔ زیادہ تر وہ ''ملک ہاؤس'' یا دادو میں ہوتے ہیں۔''
''آپ تو ہوتے ہیں نا وہاں۔''
''ہاں' لیکن میں بھائی پھیرو سے رات کو لوٹتا ہوں۔'' عباس دھیمے لہجے میں اسے سمجھا رہا تھا۔
''اور کراچی میں بھی تو آپ ہوٹل سے رات کو گھر آتے تھے۔ صرف میں اور سعدی ہوتے تھے گھر پر اسکول سے آ کر۔''
''ہاں۔''
''تو اب بھی میں اور سعدی اسکول اور کالج سے جا کر گھر پر اکیلے رہ لیں گے نا۔ ملازم بھی تو ہیں اور پھر بابا جان بھی تو آتے ہیں نا کبھی کبھی۔''
''آپ سمجھ نہیں رہیں ثمین! ملک صاحب نے جو کہا ہے یہی مناسب ہے۔''
''آخر اپنے گھر کے ہوتے ہوئے ہاسٹل میں رہنا کیوں مناسب ہے۔ پہلے بھی تو ہم رہتے تھے آپ' میں اور سعدون۔ بابا جان تو مہینے میں ایک دو بار ہی آتے تھے۔ اب بھی ہم رہ سکتے ہیں۔''
''پہلے کی اور بات تھی ثمین گڑیا! سمجھنے کی کوشش کرو۔''
''مت کہیں مجھے گڑیا۔'' اس نے عباس کو بری طرح جھڑک دیا۔
وہ گڑیا کہنے سے چڑتی تھی اور وہ کوشش کرتا تھا کہ اسے گڑیا نہ کہے لیکن زبان پر چڑھا ہوا تھا اس لیے کبھی کبھی نکل جاتا تھا۔
''میں اب بچی نہیں ہوں۔''
وہ واقعی اب بچی نہیں تھی۔ لانبا قد پانچ فٹ چار انچ سے بھی نکلتا ہوا۔ لانبے بال' متناسب جسم۔ تیمور عباس نے فوراً ہی نظریں جھکا لیں۔

اور یہی تو مسئلہ تھا کہ وہ اب بچی نہیں رہی تھی۔ گو ملک صاحب نے زبان سے کچھ نہیں کہا تھا لیکن وہ جو ان کی رگ رگ سے آشنا تھا ان کی مصلحت سمجھ گیا تھا۔ تب ہی اس نے دبے دبے لفظوں میں کہا تھا کہ وہ کہیں الگ رہائش اختیار کر لے تو ملک فیروز خان نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی تھی۔
''اس کی ضرورت نہیں عباس' میں پھر بھی یہاں ملازمین کی موجودگی میں ان کا اکیلا رہنا مناسب نہیں سمجھتا۔''
''اور میں اب سمجھتی ہوں۔''
''کیا سمجھتی ہیں آپ؟'' تیمور عباس نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔
''یہی کہ آپ نہیں چاہتے کہ میں اور سعدون' بابا جان کے قریب رہیں۔ اس طرح آپ کی اہمیت کم ہو جائے گی نا۔ اور پھر آپ......''
''آپ تو خاصی سمجھ دار ہو گئی ہیں۔'' تیمور عباس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
''اور آپ قبضہ کرنا چاہتے ہیں بابا جان کی ہر چیز پر۔'' اپنی طرف سے اس نے بہت تاک کر نشانہ لگایا تھا۔
''بہت خوب۔'' آپ کے عباس کا قہقہہ پہلے سے زیادہ بلند تھا۔ وہ جل ہی تو گئی۔
''اب کے ملک صاحب آئیں تو انہیں اپنے خدشات سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔'' تیمور عباس نے قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا لیکن اس کی آنکھیں اب بھی ہنس رہی تھیں۔
''ان پر تو آپ نے جادو کر رکھا ہے۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔
''اگر آپ کہیں تو آپ کو بھی اس جادوگر کا پتا دے دوں جس سے میں تعویذ لیتا ہوں۔''
تیمور عباس اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا لیکن اس نے فوراً ہی نظریں جھکا لی تھیں کیونکہ آنکھوں کی سطح پر نمی پھیلتی جا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر یونہی سر جھکائے بیٹھی رہی۔
''سعدون نہیں آیا؟'' کچھ دیر بعد اس نے سر اٹھا کر پوچھا۔
اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں ملال کے رنگ اتنے گہرے تھے کہ عباس کا دل تڑپ اٹھا۔ وہ ایسی ہی تھی لڑ جھگڑ کر پھر مایوس ہو کر نارمل ہو جاتی تھی۔
''اسے ٹیسٹ کی تیاری کرنا تھی وہ مجھ سے اجازت لے کر اپنے ایک ٹیچر کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا ہے۔ ویک اینڈ اس کے ساتھ ہی گزارے گا۔''
''ٹیچر کے ساتھ۔''
ثمین کو حیرت ہوئی۔
''ہاں کہہ رہا تھا کہ وہ بہت شفیق اور مہربان ٹیچر ہیں اور خود انہوں نے آفر کی تھی اسے کہ وہ چونکہ میتھ میں ویک ہے اس لیے وہ اسے تیاری کروا دیں گے۔''

''اور آپ ملے تھے ٹیچر سے۔''

''نہیں' وہ گھر جا چکے تھے۔ سعدون کہہ رہا تھا کہ وارڈن سے کہہ جائیں تو وہ کچھ دیر بعد آئیں گے مجھے لینے۔''

''اور اس نے مجھ سے ملنے کو نہیں کہا تھا۔ آپ لے آتے اسے اور پھر مجھ سے مل کر وہ چلا جاتا اپنے ٹیچر کے پاس۔''

''ہاں مجھے خیال ہی نہیں رہا۔''

''آپ کو کیوں خیال آتا۔ وہ میرا بھائی ہے نا آپ کا تو نہیں۔'' اس نے ایک ناراض نظر اس پر ڈالی۔

اور عباس خاموش رہا۔ وہ کیا کہتا کہ اس نے سعدون سے بہت کہا تھا لیکن وہ خود ہی آنے پر تیار نہ ہوا۔ اگر بتا دیتا تو ثمین کو افسوس ہوتا اور شاید وہ اس بات کا یقین بھی نہ کرتی۔

''آپ کے پیپرز ہو جائیں تو میں آپ کو گھر لے جاؤں گا کب تک فارغ ہو جائیں گی؟''

''اپریل میں ہوں گے پیپر۔ لیکن تب بھی کیا ضرورت ہے لے جانے کی۔ یہاں ہی رہ لوں گی اور اگر وارڈن نے نہ رکھا تو کسی پرائیویٹ ہاسٹل میں بھیج دیجئے گا۔'' اس نے جل کر کہا۔

''تب بھی تو مناسب نہیں ہوگا نا رہنا وہاں گھر میں۔'' تیمور عباس نے مسکراہٹ چھپانے کے لیے لب دانتوں تلے دبا لیے۔

''ملک صاحب کہہ رہے تھے رزلٹ آنے تک وہ آپ کے ساتھ ہی رہیں گے گھر پر اور سعدون کو بھی لے آئیں گے اتنے دنوں کے لیے۔''

''رئیلی۔''

سب کچھ بھول کر اس کی آنکھیں چمکنے لگیں اور گلابی ہونٹ کھل اٹھے۔

''ایسا کہا ہے بابا جان نے؟''

''ہاں کہا تو ہے۔'' عباس نے اس کی مسکراتی آنکھوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں دعا کی۔

خدا کرے کہ تم ہمیشہ یونہی مسکراتی رہو' ہمیشہ خوش رہو۔ تمہیں کیا خبر تمہارے آنسو اور تمہارا ملال مجھے کئی کئی روز تک دکھی رکھتا ہے۔ ''اور پھر ہم گھومنے بھی جائیں گے شالا مار باغ' مقبرہ جہانگیر' اقبال پارک' سب جگہوں پر۔ پتا ہے ایک بار لڑکیاں گئی تھیں ویک اینڈ پر شاہی قلعہ اور شاہی مسجد وغیرہ دیکھنے لیکن اس روز مجھے بخار تھا پھر میں نے سوچا کہ آپ کے اور سعدون کے بغیر کیا مزا آئے گا۔''

''ہاں' ٹھیک ہے میں آپ کو اور سعدون کو پورا لاہور دکھاؤں گا۔''

''سچی بہت مزا آئے گا تب۔'' وہ چھوٹے بچوں کی طرح خوش ہونے لگی۔

''اور بابا جان کہاں ہیں آج کل؟''

''وہ ملک ہاؤس میں ہیں۔''

''ان کے الیکشن کب ہو رہے ہیں؟''

''ابھی تو التوا میں پڑ گئے ہیں۔''

''پھر وہ کیا کر رہے ہیں؟''

عباس کے ساتھ ہر بات پر بحث کرنے کی اس کی عادت تھی اور عباس بڑے تحمل سے اس کی ہر بات کا جواب دیتا تھا۔

''کچھ دنوں تک گندم کی کٹائی شروع ہو جائے گی۔''

''تو بابا نے خود تو نہیں کاٹنی گندم۔'' وہ بڑبڑائی۔

''خیر جب بابا جان آئیں لاہور تو ان سے کہیے گا کہ پچھلے ماہ کی دو تاریخ کو وہ صرف دس منٹ کے لیے مجھ سے ملنے آئے تھے۔''

''کہہ دوں گا۔'' تیمور عباس کھڑا ہو گیا۔

''عباس! اگلے ہفتے میرے پیپرز شروع ہو جائیں گے۔''

''کیسی تیاری ہے؟'' عباس نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے کندھے اچکائے اور کھڑی ہو گئی۔ ''جب رزلٹ آئے گا تو پتا چل جائے گا۔''

''مجھے یقین ہے آپ کا سابقہ ریکارڈ برقرار رہے گا۔'' عباس مسکرایا۔

''آپ اگلے ویک اینڈ پر سعدی کو لے کر آیئے گا۔ ایگزام سے پہلے' پلیز۔''

''اگلے ویک اینڈ پر تو مجھے کراچی جانا ہے۔'' عباس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''پلیز عباس!'' اس نے اٹھتے ہوئے منت کی۔ ''مجھے بہت دن ہو گئے ہیں سعدی سے ملے' ایک ماہ ہونے والا ہے۔ میں پیپرز میں بھی اداس رہوں گی اور آپ نہ لائے ملانے کے لیے سعدی کو تو میں پیپرز ہی نہیں دوں گی اور آرام سے فیل ہو جاؤں گی۔''

اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عباس نے اس کی طرف دیکھا۔

''او کے' لے آؤں گا۔ دو تین روز تک۔''

''تھینک یو عباس! آپ بہت اچھے ہیں۔ میں تو ویسے ہی آپ سے لڑتی رہتی ہوں۔ دراصل مجھے غصہ آپ پر نہیں آتا۔ بابا جان پر آتا ہے' خود پر آتا ہے اور پتا نہیں کس پر اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنا غصہ کس پر نکالوں۔''

''تم ہمیشہ اپنا غصہ مجھ پر نکال سکتی ہو ثمین!'' عباس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ہمیشہ۔'' اس نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''اور وہ جو ایک دن آپ کی بیوی آجائے گی' وہ مجھے لڑنے دے گی آپ کے ساتھ۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔

''اور پھر وہ بھی تو اپنا غصہ نکالے گی آپ پر۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' تیمور عباس نے سر کھجایا۔ میرا خیال ہے میں شادی ہی نہیں کروں گا تاکہ کوئی آپ کو نہ روکے اپنا غصہ اتارنے سے۔''

وہ ہولے سے ہنسا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا گیٹ سے باہر نکل گیا۔

ہمیشہ کی طرح عباس سے مل کر وہ ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی' ورنہ پچھلے ایک ہفتے سے وہ سخت مضمحل تھی۔ کوئی تین بار تو وہ باتھ روم میں جا کر روئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ وہ ضد کر کے اس بار ضرور عباس کے ساتھ گھر چلی جائے گی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح عباس کے سامنے جلد ہی اس کی ضد دم توڑ گئی تھی۔

''ہیلو۔'' وہ عباس کو رخصت کر کے مڑی تو لان میں بیٹھی اس کی روم میٹ ڈیزی نے آواز دی۔

''تم یہاں بیٹھی ہو۔'' وہ باڑ پھلانگ کر اس کے پاس چلی آئی۔

اس کے ساتھ بی اے کی عفیرہ اور عاصمہ بھی تھیں۔

''یہ تمہارے بھائی تھے نہیں؟'' عفیرہ نے پوچھا۔

''نہیں' میرے کزن تھے۔''

''اچھا!'' عفیرہ کا اچھا معنی خیز تھا۔

''ہاں' ان کے والدین وفات پا چکے ہیں اور یہ بچپن سے ہی ہمارے گھر میں رہتے ہیں۔ بابا جان کے بہت لاڈلے ہیں۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔

پہلی بار جب اس کی روم میٹ نے عباس کے متعلق پوچھا تھا تو اس کی سمجھ میں یہ ہی آیا تھا کہ وہ کہہ دے کہ عباس کزن ہیں۔

''ویسے تمہارے کزن ہیں بہت ڈیشنگ پرسنالٹی کے۔'' عاصمہ نے رائے دی۔

''اچھا!'' وہ ہنس دی۔ ''میں نے کبھی غور نہیں کیا۔''

''اب غور کرنا۔'' عاصمہ نے مشورہ دیا۔

''یار' بچی ہے ابھی۔'' عفیرہ نے اس کی طرف دیکھا اور بلاوجہ ہنس دی۔

اور اس نے چڑ کر ڈیزی کا ہاتھ پکڑا' اسے یوں بھی یہ دونوں لڑکیاں کوئی خاص پسند نہیں تھیں۔

''چلو نا کمرے میں۔ پڑھتے ہیں چل کر۔''

''اچھا!'' ڈیزی کھڑی ہو گئی اور جاتے جاتے مڑ کر عفیرہ اور عاصمہ کی طرف دیکھا اور پھر

اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

❋ ❋ ❋

''تو تم مجھ سے ملنا چاہتی تھیں لڑکی؟'' ملک فیروز خان نے نظر اٹھا کر اندر آنے والی لڑکی کو دیکھا۔

اور پھر جیسے باقی کے لفظ ان کے ہونٹوں پر ہی رہ گئے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھی اس وقت انہیں بہت پیچھے ماضی میں لے گئی تھی۔

اگر اس کی آنکھیں نیلی ہوتیں۔

اور اگر اس کا قد تھوڑا لمبا ہوتا۔

اور اس کے بال۔ ہاں' بال یوں پونی میں نہ کسے ہوتے۔

اور ان کا رنگ سیاہ کے بجائے براؤن ہوتا۔ سنہری جھلک لیے براؤن رنگ تو وہ سمجھتے شاید وقت پیچھے کی طرف پلٹ گیا ہے اور زہرہ جمال سامنے کھڑی مسکرا رہی ہے اور اس کے تراشیدہ لبوں پر سجی مسکراہٹ نے اس کے نچلے ہونٹ کے دائیں کونے پر ننھے سے تل کو نمایاں کر دیا ہے۔

''سر! میں آپ سے ملنا چاہ رہی تھی بہت دنوں سے لیکن آپ مل ہی نہیں رہے تھے۔'' وہ ماضی میں سفر کر رہے تھے۔

''خیریت تھی خاتون! اس نظرِ عنایت کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔''

ان کی نگاہیں زہرہ جمال کے چہرے پر تھیں اور وہ دل ہی دل میں اس کے حسن کو سراہ رہے تھے۔

''جی سر! دراصل ہم لوگ اپنے ایک اسٹوڈنٹ ساتھی کے لیے فنڈ جمع کر رہے ہیں۔ اسے کینسر ہے نا اور ہم چاہتے ہیں اس کا علاج ہو جائے وہ ایک غریب خاندان کا اکلوتا اور بے حد ذہین لڑکا ہے۔''

اور اس سمے وہ جو مانگتی وہ دان کر دیتے' اتنے ہی سخی ہو رہے تھے۔ انہوں نے خاموشی سے چیک بک نکال کر چیک لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اور چیک پر لکھی رقم دیکھتے ہی اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

''اوہ تھینک یو۔ اب تک جتنے لوگوں سے ہم نے ہیلپ کے لیے کہا ہے۔ سب سے زیادہ رقم آپ نے دی ہے۔ سعید احمد نے بالکل صحیح کہا تھا کہ بھائی جان بہت سخی ہیں۔''

''اوہ!'' وہ مسکرائے تھے' یہاں کا رستہ سعید نے بتایا ہے آپ کو اور وہ خود کہاں ہے۔''

''باہر کھڑا ہے۔'' زہرہ جمال سفید ڈریس میں بے حد دلکش لگ رہی تھی' اتنی کہ انہیں اپنا دل پہلو سے نکلتا محسوس ہوا۔ سعید ان کے والد کے کزن کا بیٹا تھا اور ان سے عمر میں دو تین سال

چھوٹا اور ان سے بے حد دوستی تھی۔

''کہاں ہے وہ نالائق! بلاؤ اسے ذرا۔ کیا خود مجھ سے نہیں مانگ سکتا تھا۔''

''اگر میں مانگ لیتا تو زہرہ سے آپ کی کیا ملاقات ہوتی؟''

اور کتنا سچ کہا تھا سعید نے۔ بھلا وہ زہرہ جمال سے کہاں مل پاتے جو سعید کی کلاس فیلو تھی۔

اور جب زہرہ جمال نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا ان کی نظریں اس کی پشت پر بکھرے سنہری مائل براؤن بالوں کے آبشار سے الجھی ہوئی تھیں۔

''سر! کیا میں بیٹھ سکتی ہوں؟'' ان کے سامنے کھڑی لڑکی نے کہا تو وہ اپنے خیالوں سے چونکے۔

''ہاں ہاں' کیوں نہیں' بیٹھیں۔''

وہ لڑکی زہرہ جمال نہیں تھی لیکن مدتوں بعد انہیں زہرہ کی یاد دلا گئی تھی۔ اس میں کچھ ایسا تھا ضرور۔

شاید اس کے نچلے ہونٹ کے دائیں کونے کا تل یا پھر اس کے ہونٹوں کی بناوٹ۔

اس کی اونچی اٹھی ہوئی ناک۔

اور کیا وہ ان سارے بیتے سالوں میں زہرہ جمال کو نہیں بھول پائے تھے' حالانکہ انہوں نے خود کو تو یہی باور کرا رکھا تھا کہ زہرہ جمال ان کی زندگی سے ہی نہیں' ان کے دل سے بھی نکل چکی ہے۔

''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ مجھ سے کیوں ملنا چاہتی تھیں؟ عباس نے بتایا ہے مجھے کہ آپ دو تین بار آ چکی ہیں۔''

ملک فیروز خان نے نگاہیں جھکا لی تھیں۔

یہ لڑکی زہرہ جمال نہ تھی بلکہ اس میں زہرہ جمال کی سی کوئی بات نہ تھی۔

سیاہ جینز پر ریڈ شارٹ شرٹ' گلے میں گھٹنوں کو چھوتا اسکارف۔

''کیا میں آپ کی آمد کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟''

''وجہ تو ظاہر ہے مجھے بتانا ہی ہے۔'' لڑکی حد سے زیادہ پُراعتماد لگ رہی تھی۔

''شاید آپ کسی تنظیم کی طرف سے فنڈ اکٹھا کر رہی ہیں تو۔''

''پلیز اندازے مت لگائیے۔'' لڑکی نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روکا۔ ''میرے پاس ایک کہانی ہے شاید آپ کو اس سے کوئی دلچسپی ہو۔''

لڑکی کی نظریں ٹیبل کے پیچھے بیٹھے ملک فیروز خان پر تھیں۔

''کیسی کہانی؟'' ملک فیروز خان کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''کوئی اتنی زیادہ پرانی کہانی نہیں ہے' بس پندرہ سولہ سال پرانی بات ہے کہ ایک جاگیردار

نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا' اس لیے کہ اسے شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے دوست۔''

''کیا بکواس ہے یہ؟'' ملک فیروز خان کی آواز میں ہلکی سی لرزش تھی۔

''یہ بکواس نہیں ہے سر! بلکہ حقیقت ہے۔ آپ کیا اس جاگیردار کا نام جاننا پسند کریں گے؟''

لڑکی اب بھی ملک فیروز خان کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

''تم کون ہو؟'' ملک فیروز خان کے چہرے کے نقوش میں سختی در آئی تھی اور وہ بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''آپ کو اس سے غرض نہیں ہونا چاہیے سر! آپ تو یہ بتائیے کہ آپ کو اس کہانی سے کوئی دلچسپی ہو تو۔''

''تم کیا چاہتی ہو لڑکی؟'' ملک فیروز خان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

''قیمت۔ اس کہانی کی قیمت۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ یہ کہانی منظر پر نہ آئے تو۔''

''جو کچھ تم کہہ رہی ہو اس میں سچ نہیں ہے' ایک فیصد بھی نہیں۔''

''ہو سکتا ہے۔'' لڑکی مسکرائی۔

''لیکن کیا یہ بھی سچ نہیں ہے کہ آج سے بہت سال پہلے آپ کے پردادا کے والد نے جس بچے کو گود لیا تھا اس کا تعلق ریڈ لائٹ ایریا سے تھا۔'' ملک فیروز خان کے ہونٹ بھینچ گئے۔

''تم کیا کچھ جانتی ہو لڑکی اور کس نے بتایا تمہیں یہ سب؟''

ملک فیروز خان ذرا بھی گھبرائے ہوئے اور پزل نہ لگ رہے تھے۔ ایک لمحہ کو لڑکی ان کا اعتماد دیکھ کر نروس سی ہو گئی۔

''پہلے آپ قیمت لگائیے پھر یہ بھی بتا دوں گی۔''

''اگر میں کہوں کہ میرے نزدیک اس کہانی کی کوئی قیمت نہیں ہے تو؟'' اب ملک فیروز خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''تو میرے خیال میں آپ کے حریف' میرا مطلب ہے چوہدری جہانداد خان کو ضرور اس سے دلچسپی ہو گی اور لوگ بھی اس کہانی کو چھپنے کے بعد دلچسپی سے پڑھیں گے اور اس صورت میں ان کی دلچسپی اس لیے بھی زیادہ ہو گی کہ کہانی کا ہیرو ہونے والے الیکشن میں کھڑا ہو رہا ہے اور ایک قاتل کے مقابلے میں لوگ یقیناً......''

''آپ کا تعلق کس اخبار سے ہے؟'' ملک فیروز خان نے جیسے اس کی بات پر توجہ ہی نہ دی تھی۔

''میرا تعلق کسی اخبار سے نہیں ہے۔'' لڑکی نے سر اٹھا کر ملک فیروز خان کی طرف دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"کچھ عرصہ پہلے ایک مقامی اخبار کے ایڈیٹر نے بھی اس طرح کا فون کیا تھا اور میں نے اسے اجازت دے دی تھی کہ وہ بڑے شوق سے اس کہانی کو چھاپ دے۔ سو خیال گزرا کہ شاید اسی اخبار کی طرف سے آپ آئی ہیں۔"

ایک لمحہ کو لڑکی کے چہرے پر مایوسی جھلکنے لگی تھی۔

گو اس موقع پر جب الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہونے ہی والا تھا وہ اس طرح کا کوئی اسکینڈل افورڈ نہیں کر سکتے تھے پھر بھی انہوں نے لڑکی کو اجازت دے دی کہ وہ بڑے شوق سے اس کہانی کو اخبار میں چھپوا سکتی ہے۔ یہ رسک لیتے ہوئے گویا انہوں نے لڑکی پر نفسیاتی دباؤ ڈالا تھا۔ اور یہ بھی حقیقت تھی کہ چند ماہ پہلے اخبار کے ایڈیٹر سے انہوں نے یہی کچھ کہا تھا۔ چند ماہ پہلے وہ جس اخبار میں کام کرتی تھی' وہ اخبار دراصل یلو جرنلزم پر ہی چلتا تھا۔ اخبار کا مالک بلیک میلر تھا۔ وہ بڑے لوگوں کے راز اور ان کے متعلق معلومات جمع کرتا اور پھر ان کو چھاپنے کی دھمکی دے کر پیسے بٹورتا۔ یا ان واقعات کا مختصراً ذکر کر کے متعلقہ شخص سے کہا جاتا کہ اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کے متعلق مزید کچھ نہ چھاپیں تو اتنی رقم دے دے اور اپنی عزت کی خاطر وہ لوگ مطالبہ پورا کر دیتے تھے۔ اخبار میں ملازمت کے کچھ ہی دنوں بعد اخبار کی حقیقت اس پر واضح ہوئی تھی۔ یہ کہانی ایک بوڑھا شخص لایا تھا۔ اور اس نے دعوا کیا تھا کہ ملک فیروز خان یہ کہانی نہ چھاپنے کے لیے لاکھوں دے سکتا ہے۔ لیکن بعد میں ایڈیٹر نے فائل اس کی ٹیبل پر پھینکتے ہوئے کہا تھا۔ ان تلوں میں تیل نہیں۔ وہ بوڑھا جو پھر آنے کا کہہ کر گیا تھا تاکہ حاصل ہونے والی رقم سے اپنا حصہ لے سکے پھر پلٹ کر نہیں آیا تھا۔ فائل اس کی ٹیبل کی دراز میں پڑی رہی تھی اور جب اس نے جاب چھوڑی تھی تو اپنے کاغذات کے ساتھ وہ بے دھیانی میں اسے بھی اٹھا لائی تھی اور اس روز یونہی اپنے کاغذات چیک کرتے ہوئے اس کی نظر اس فائل پر پڑ گئی تھی اور پھر وہ اسے پڑھتی چلی گئی تھی اور اس نے سوچا تھا کہ۔

ملک فیروز خان خاموشی سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہے تھے۔

"اوکے سر!" وہ کھڑی ہوگئی۔ "میرا خیال ہے مجھے چوہدری جہانداد کے پاس جانا چاہیے۔"

"ضرور۔" ملک فیروز خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

لڑکی کمرے سے باہر نکل گئی تو ملک فیروز خان نے اسے آواز دی۔

"سنو لڑکی! اگر تمہیں تمہاری کوئی ضرورت یہاں تک لائی ہے تو تم اس کہانی کا سہارا لیے بغیر بھی اپنی ضرورت بیان کر سکتی تھیں۔ ہو سکتا ہے میں تمہاری ہیلپ کر دیتا۔ بہر حال اب بھی تم اگر..."

"تھینک یو سر۔"

لڑکی تیزی سے پلٹ گئی لیکن اس کی آنکھوں میں اتر آنے والی نمی فیروز خان کی تیز نظروں

سے نہ چھپ سکی تھی۔ وہ کچھ حیران سے ہوئے لیکن پھر سر جھٹک کر اپنے سامنے پڑے کاغذات دیکھنے لگے لیکن پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ اگر یہ لڑکی جہانداد تک پہنچ گئی تو اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ سب کچھ نمک مرچ لگا کر چھپوا دیتا۔ اور ان حالات میں کون تصدیق کرتا کہ سچ کیا ہے۔ ایک لمحہ کو انہوں نے سوچا کہ وہ سارا معاملہ عباس سے ڈسکس کر کے اس سے مشورہ لے لیں لیکن پھر سر جھٹک کر انہوں نے اس خیال کو رد کر دیا۔

"نہیں' عباس سے نہیں۔"

ذہن الجھ گیا تھا۔ قلم رکھ کر وہ ماضی میں کھو گئے۔ سارے منظر ان کی آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گئے تھے۔ کرسی کی پشت سے سر ٹیکتے ہوئے انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔

❖❖❖

امثل سر جھکائے فٹ پاتھ پر چل رہی تھی۔ اگلے اسٹاپ سے اسے اپنی وین ملنی تھی۔ فٹ پاتھ کے بالکل قریب ہی کسی گاڑی کے بریک چرچرائے اور کھڑکی سے جھانکتے ایک چہرے نے امثل کی طرف دیکھتے ہوئے پکارا۔

"ہیلو مس!" امثل نے چونک کر دیکھا۔ کھڑکی سے باہر جھانکتا چہرہ اس کے لیے قطعی اجنبی تھا۔

"آئیے آپ کو ڈراپ کر دوں۔"

امثل نے ناگواری سے اسے دیکھا اور سر جھٹک کر قدم آگے بڑھا دیے۔

"سنیں مس! دھوپ بہت تیز ہے اور آپ کی یہ خوبصورت رنگت جل جائے گی۔" گاڑی فٹ پاتھ کے ساتھ آہستہ آہستہ رینگنے لگی۔

"شٹ اپ!" امثل کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں اور اس کے قدموں کی رفتار تیز ہو گئی۔

"اور پتا نہیں یہ امیر زادے خود کو کیا سمجھتے ہیں جیسے ہر لڑکی ان کی گاڑی اور دولت پر فدا ہو جائے گی۔" اس نے غصے سے سوچا۔

"سنیں مس۔" اس نے پھر آواز دی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ "میں ایک شریف بندہ ہوں۔ اور میرا مقصد محض آپ کو دھوپ کی شدت سے بچانا ہے۔"

"آپ کی شرافت۔" اس نے دانت کچکچائے۔ جی تو یہ چاہ رہا تھا کہ اسے کھری کھری سنا دے لیکن پھر اسے ماما کی تنبیہہ یاد آ گئی۔

"ثوما! کسی سے بے وجہ الجھا نہ کرو اور یہ راہ چلتے لوگوں کی بکواس کو نظر انداز کر دیا کرو۔ جب عورت باہر نکلتی ہے تو اسے ایسے حالات کا سامنا قدم قدم پر کرنا پڑتا ہے۔ اگر ہر راہ چلتے بندے کی بات کا جواب دینے کھڑی ہو جاؤ گی تو مشکل ہو جائے گی۔ ہم بہت کمزور ہیں۔

تمہارے پاپا کے بعد ہمیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے۔"

اس نے رفتار تیز کر دی۔

کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ فریدوں کی بات مان لیتی' اس نے کہا بھی تھا۔

"ثوما! تھوڑی دیر رک جاؤ تو میں تمہارے ساتھ ہی چلتا ہوں۔"

لیکن اسے جلدی تھی' وہ چاہتی تھی کہ ہمایوں کے اسکول میں چھٹی ہونے سے پہلے وہ وہاں پہنچ جائے' اس لیے اس نے صبح ہی ہاف ڈے کی چھٹی لے لی تھی۔ دراصل وہ ہمایوں کے ٹیچر سر تنویر سے ملنا چاہ رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا تھا کہ سر تنویر' ہمایوں کو غلط راستے کی طرف لے جا رہا ہے۔ وہ اس کی تنبیہہ کے باوجود اکثر اسکول سے دیر آنے لگا تھا۔ ہر روز اس کے پاس کوئی نہ کوئی بہانہ ہوتا۔

کبھی چھٹی کے بعد میچ کھیلنا ہوتا۔

کبھی کسی ٹیسٹ کی تیاری کا بہانہ کسی دوست کے ساتھ مل کر۔ اور کبھی کچھ۔

اسے شک تھا کہ چھٹی کے بعد وہ سر تنویر کی طرف ہی جاتا ہے۔ سر تنویر اسے کچھ مشکوک سے لگے تھے۔ بھلا آج کے دور میں کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ کسی اسٹوڈنٹ پر اسکول ٹائم کے بعد بھی توجہ دے۔ جبکہ ٹیچرز نے ٹیوشنز کے لالچ میں اسکول میں بھی پڑھانا چھوڑ دیا ہے۔ اور یہ سر تنویر' پھر منتھلی ٹیسٹ میں اس کی کارکردگی بہت خراب تھی اور میتھ میں تو اس نے صرف 20 فیصد نمبر لیے تھے۔ جبکہ اس سے پہلے اس کا تعلیمی ریکارڈ بہت اچھا تھا۔

"مس! آئی وانٹ ٹو بی یور فرینڈ۔"

گاڑی ابھی تک فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

"مسٹر!" وہ غصے سے بل کھا کر رہ گئی۔ "اپنی راہ لیجیے اور اپنے طبقے کی کسی لڑکی سے فرینڈ شپ کیجیے۔" وہ خود کو خاموش رہنے سے نہیں روک سکی تھی۔

"لیکن دل اگر آپ سے دوستی کرنا چاہے تو؟"

اس نے سامنے سے آتی وین کو دیکھا اور تقریباً دوڑ کر اسٹاپ کے پاس کھڑے بڑے میاں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ بڑے میاں کے علاوہ اسٹاپ پر دو خواتین اور بچے بھی تھے۔

گاڑی اس کے پاس سے زن سے گزر گئی۔ اس نے دیکھا تھا۔ گاڑی ڈرائیو کرتے مرد کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور اس کی نظریں امثل پر ہی تھیں۔

"اللہ کرے ایکسیڈنٹ ہو جائے۔"

اس نے دل ہی دل میں بد دعا دی اور تیزی سے وین کی طرف بڑھ گئی۔ خاتون نے غصے سے اسے دیکھا لیکن وہ ان کے غصے کی پروا کیے بغیر وین کی سیڑھی پر قدم رکھ چکی تھی۔ وین لبالب بھری تھی' اسے بھی ایک جگہ کھڑے ہونے کی جگہ مل گئی۔

"پلیز۔" ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا لڑکا کھڑا ہو گیا۔

اس نے پاؤں مضبوطی سے جماتے ہوئے لڑکے کو دیکھا۔ نگاہیں جھکائے کھڑا وہ بڑی شرافت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"اور ثوما! یاد رکھنا باہر تمہیں ایسے لوگ بھی ملیں گے جن کے چہروں پر بظاہر شرافت نظر آئے گی تمہیں۔ جو پہلے تمہیں چھوٹی چھوٹی مہربانیوں سے زیر بار کریں گے اور پھر اچانک تم سے ان مہربانیوں کا صلہ مانگنے کے لیے ہاتھ پھیلائے تمہارے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔"

"تھینکس۔" اس نے لڑکے کی طرف دیکھا۔

یہ لڑکا اس سے پہلے بھی کئی بار اس وین میں اسے نظر آ چکا تھا۔ بلکہ شاید یہ وہیں کہیں اسلامیہ پارک میں ہی رہتا تھا۔

لڑکے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھری اور اس نے مڑ کر اپنے پیچھے کھڑے بڑے میاں کو دیکھا جو بمشکل ایک ہاتھ راڈ پر رکھے اور ایک ہاتھ میں اپنی پوٹلی سنبھالے کھڑے تھے۔

"بابا جی! آپ یہاں بیٹھ جائیں۔"

بڑے میاں نے مشکور نظروں سے اسے دیکھا اور اس نے لڑکے کے چہرے کے تاثرات سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنی بے اختیار مسکراہٹ چھپانے کے لیے سر جھکا لیا۔ لڑکا اب بڑے میاں جی کی جگہ پر کھڑا تھا اور جب بریک لگتی جان بوجھ کر اس سے ٹکرا جاتا۔ لیکن وہ سوائے غصے سے بل کھانے کے اور کچھ نہ کر سکی۔ ہمایوں کے اسکول والے اسٹاپ پر اترتے ہوئے اس نے ایک تیز نظر لڑکے پر ڈالی جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"کاش یہاں میری جگہ تمہاری بہن کھڑی ہوتی۔" اس کی آواز آہستہ تھی لیکن لڑکے کے چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے امثل کی بات سن لی ہے۔ وین آگے بڑھ گئی تو وہ اسکول کی طرف چل پڑی۔

تھینک گاڈ کہ ابھی اسکول کی چھٹی نہ ہوئی تھی۔ یہ جان کر کہ اسکول میں ان دنوں کسی بھی قسم کے میچز نہیں ہو رہے' اسے دکھ ہوا۔ حالانکہ وہ اسی بات کی توقع کر رہی تھی۔

"تو ہمایوں اب جھوٹ بھی بولنے لگا ہے۔ لیکن کیوں؟" اس کے ذہن میں ایک بار پھر سر تنویر کا خیال آیا تھا۔

"سر! میں میتھ کے ٹیچر سر تنویر سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور۔" ہیڈ ماسٹر نے بیل بجائی۔

"تنویر صاحب کو یہاں آئے زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن بچے انہیں بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ میتھ بہت اچھا پڑھاتے ہیں۔"

"جی' مجھے ہومی کے سلسلے میں ہی ان سے بات کرنا تھی۔"

''تنویر صاحب کو بھیجیں۔'' انہوں نے چپڑاسی سے کہا۔
چپڑاسی بالکل نکل گیا تو وہ فون کی طرف متوجہ ہو گئے جو وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔
''ایسا کریں مس! آپ میٹنگ روم میں جا کر تنویر صاحب سے بات کر لیں' میں انہیں وہیں بھجواتا ہوں۔''
ریسیور ہاتھ میں لیتے ہوئے انہوں نے امثل کی طرف دیکھا تو وہ ''جی اچھا'' کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میٹنگ روم آفس سے ملحق ہی تھا۔ یہاں پیرنٹس میٹنگ کے سلسلے میں کئی بار وہ آ چکی تھی۔ میٹنگ روم خالی تھا' وہ سامنے والے صوفے پر ٹک گئی اور دیوار پر لگی پینٹنگ کو دیکھنے لگی۔ تب ہی دروازے پر آہٹ ہوئی۔ اس نے پینٹنگز سے نظریں ہٹا کر آنے والے کو دیکھا اور لمحہ بھر کو اسے از حد حیرت ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے خود کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
''السلام علیکم۔'' آنے والے نے سر کے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
''سر تنویر!''
''جی!'' آنے والا بہت گہری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔
''میں ہمایوں کی سسٹر ہوں اور مجھے اسی کے سلسلے میں آپ سے بات کرنا تھی۔''
''جی کہیے۔'' وہ سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔
عمر تقریباً چالیس پینتالیس سال۔
دبلا پتلا سا' درمیانہ قد و قامت' گہری سانولی رنگت پر غالباً چیچک کے داغ' چھوٹی سی بیٹھی ہوئی ناک' موٹے موٹے ہونٹ اور بہت چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن میں عجب غلیظ سی چمک تھی۔ امثل نے نگاہیں جھکا لیں۔ اسے یکدم کراہیت کا سا احساس ہوا تھا اور پرنسپل صاحب کہہ رہے تھے کہ وہ لڑکوں میں ہر دلعزیز ہے۔
''دراصل ہمایوں کے منتھلی ٹیسٹ کے متعلق آپ سے بات کرنا تھی۔ اس نے میتھ میں صرف 20 فیصد مارکس لیے ہیں۔ حالانکہ اس سے پہلے کبھی اس کے 95 فیصد سے کم مارکس نہیں آئے تھے میتھ میں۔''
''دراصل۔'' ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے تنویر صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔
''شاید وہ آج کل پڑھائی پر توجہ نہیں دے رہا اسی لیے میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ شام کے وقت مجھ سے پڑھنے آ جایا کرے۔ لیکن غالباً آپ نے انہیں منع کر دیا۔'' تیز چبھتی ہوئی نظریں امثل کو اپنے وجود میں اترتی محسوس ہوئیں۔
''جی ہاں' میں خود میتھ پڑھا سکتی ہوں' اس لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''تب ہی یہ حال ہے۔'' اس کی نظروں میں طنز تھا جسے امثل نے نظر انداز کر دیا۔
''میں آپ کی اس توجہ کے لیے ممنون ہوں لیکن معذرت خواہ ہوں کہ ہومی آفٹر اسکول ٹائم آپ کے گھر نہ آ سکے گا۔ دراصل میری والدہ بیمار ہیں اور اسے ذرا بھی دیر ہو جائے تو انہیں گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔''
''میرا خیال ہے کہ وہ بہت دنوں سے شام کے وقت پڑھنے نہیں آ رہا ہے۔'' اس کا چہرہ پھر پہلے جیسا کرخت لگنے لگا تھا۔
''لیکن وہ چھٹی ہوتے ہی آپ کے ساتھ چلا جاتا ہے جس سے میری والدہ بہت پریشان ہو جاتی ہیں۔'' اس نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ سر تنویر کی آنکھوں میں حیرت نظر آئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔
''آپ کو شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے' وہ چھٹی کے بعد میرے ساتھ نہیں جاتا۔''
''میری درخواست ہے کہ آپ کلاس میں بھی اس پر توجہ دیں۔''
''میں اپنے فرائض بہتر سمجھتا ہوں مس۔''
وہ کھڑا ہو گیا۔ اس کے لہجے میں کھردراپن اور بیزاری سی تھی۔
کچھ دیر امثل وہیں کھڑی اسے باہر جاتا دیکھتی رہی اور پھر پرنسپل کے آفس میں چلی آئی۔
''سر! میں ہومی کے منتھلی ٹیسٹ کا میتھس کا پیپر دیکھنا چاہتی ہوں۔''
''تو آپ تنویر صاحب سے کہتیں' وہ ریکارڈ روم سے نکلوا دیتے۔ ایک ماہ تک پیپرز محفوظ رکھے جاتے ہیں۔''
''جی' لیکن میں ان کے علم میں لائے بغیر ٹیسٹ چیک کرنا چاہتی ہوں۔''
پرنسپل نے الجھ کر اسے دیکھا۔
''دراصل سر! میں ہومی کو خود میتھس پڑھاتی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ وہ کبھی بھی اتنے کم نمبر نہیں لے سکتا میتھس میں۔ میں دیکھنا چاہتی ہوں کہ اس نے کہاں غلطی کی ہے اور میں یہ نہیں چاہتی کہ تنویر صاحب کو یہ گمان گزرے کہ میں ان کے چیک کیے گئے نمبروں پر شک کر رہی ہوں۔ میں صرف اپنی معلومات کے لیے۔''
''او کے۔'' انہوں نے بیل بجا کر چپراسی کو ٹیسٹ کی کاپیاں لانے کو کہا اور جب اس نے ہومی کا ٹیسٹ دیکھا تو حیران رہ گئی۔ پہلا سوال ٹھیک تھا جس کے دس نمبر دیے گئے تھے جبکہ اگلے چار سوالوں پر کراس لگا ہوا تھا لیکن وہ چاروں کے چاروں سوال ٹھیک تھے۔
تو اس کا خیال صحیح تھا کہ تنویر صاحب نے جان بوجھ کے اس کے صحیح سوالوں کو بھی غلط کر دیا تھا تاکہ وہ لوگ تنویر صاحب کے پاس ہومی کو پڑھنے بھیج دیا کریں۔ لیکن کیوں...... آخر تنویر صاحب ایسا کیوں چاہتے ہیں جبکہ ان کا مقصد ٹیوشن کے پیسے لینا بھی نہیں۔ وہ کچھ پریشان سی

کھڑی ہوگئی۔

''کیا آپ نے غلطیاں دیکھ لیں بچے کی؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''جی سر! تھینک یو۔''

وہ باہر آ گئی۔ حالانکہ اس کا جی چاہا تھا کہ وہ پرنسپل کو تنویر صاحب کی اس حرکت سے باخبر کردے اور ہمایوں کا ٹیسٹ دکھا کر تنویر صاحب سے سوال غلط کرنے کی وجہ پوچھے لیکن پھر پہلے اس نے فریدوں سے مشورہ کرنا مناسب سمجھا۔

باہر نکلی تو چھٹی ہو چکی تھی اور بچے لائنیں بنا رہے تھے۔ وہ گیٹ سے باہر نکل کر ایک طرف درخت کے نیچے کھڑی ہوگئی تا کہ ہمایوں کو ساتھ لے جاسکے۔ باہر اسکول کی چاردیواری کے ساتھ ساتھ گاڑیاں کھڑی تھیں۔ بائیک' رکشے' سوزوکیاں۔ جب پاپا زندہ تھے تب پاپا بھی ہمیشہ خود ہمایوں کو اسکول چھوڑنے اور لینے آتے تھے۔ اس کا سارا دھیان گیٹ کی طرف تھا تا کہ ہمایوں کو دیکھ سکے' تب ہی اس کی نظر گیٹ سے باہر نکلتے سر تنویر پر پڑی۔ ان کے ساتھ جو بچہ تھا' وہ بے حد حسین تھا۔ بالکل ہومی جیسی نیلی آنکھیں' سرخ وسفید رنگت۔ گو اس کے نقوش ہومی سے ذرا بھی نہ ملتے تھے۔ ہاں بس آنکھوں کا رنگ ہومی جیسا تھا لیکن وہ اتنا خوبصورت تھا کہ بے اختیار اس کے لبوں سے ماشاءاللہ نکلا۔

سر تنویر نے سڑک کراس کی اور ان کے ساتھ ہی بچے نے بھی سڑک کراس کی تھی۔ ''تو کیا یہ بچہ سر تنویر کے ساتھ جارہا ہے؟'' ایک لمحے کے لیے اس کے ذہن میں آیا اور دوسرے ہی لمحے اس نے ہمایوں کی تلاش میں نظریں دوبارہ گیٹ پر دوڑائیں۔ گیٹ کے پاس ہی ہمایوں کھڑا تھا اور اس کی نظریں بھی سر تنویر پر تھیں۔

''ہومی...... ہمایوں......'' وہ راستہ بناتی اس کی طرف لپکی۔

''آپی! آپ؟'' ہومی اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''ہاں' میں تمہارے ٹیسٹ پیپر دیکھنے آئی تھی کہ آخر اتنے کم نمبر کیوں آئے تمہارے۔''

''آپی! میں نے آپ کو بتایا کہ میں نے سارے سوال صحیح کیے تھے اور میں نے سر سے کہا بھی تھا کہ میرے سوال ٹھیک تھے لیکن انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا۔''

''ہاں' تمہارے سوال ٹھیک تھے۔'' اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے امثل نے بتایا۔

''تو...... تو آپ نے بتایا سر تنویر کو؟'' اس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

''نہیں۔'' امثل نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''میں بتاؤں گا صبح سر تنویر کو۔ مجھے یقین تھا کہ میرے پورے نمبر آئیں گے' ففٹی میں سے ففٹی۔ لیکن......''

''نہیں' تم سر تنویر سے کچھ نہیں کہو گے ہومی!'' امثل کی آواز میں سختی تھی۔

''لیکن کیوں آپی؟'' اس نے الجھ کر امثل کو دیکھا لیکن امثل اس کی انگلی پکڑے گہری سوچ میں کھڑی تھی۔

''بتائیں نا۔'' ہومی نے ہولے سے اس کا بازو ہلایا تو وہ چونکی۔

''بتا دوں گی گھر چل کر۔ وہ لڑکا کون تھا جو سر تنویر کے ساتھ گیٹ سے باہر نکل رہا تھا؟'' اس نے موضوع بدلنے کے لیے پوچھا۔

''وہ سعدون تھا' ایٹتھ میں پڑھتا ہے۔ کراچی سے آیا ہے۔ ہاسٹل میں رہتا ہے اور اکثر ویک اینڈ پر سر تنویر کے ساتھ ان کے گھر چلا جاتا ہے۔''

''کیا وہ ان کا کوئی عزیز ہے؟'' امثل نے یونہی پوچھا۔

''نہیں۔ پتا ہے آپی! جب وہ پہلے روز آیا تو میرے کئی دوستوں نے پوچھا' کیا وہ میرا بھائی ہے۔''

''اچھا لیکن وہ تو بہت پیارا ہے۔'' امثل نے شرارت سے اسے دیکھا۔

''اور کیا میں پیارا نہیں ہوں۔'' ہمایوں نے منہ پھلا لیا تھا۔

''تم اس سے زیادہ پیارے ہو۔'' امثل نے اس کے گال پر چٹکی لی۔

''اور پتا ہے سعدی میرا بھی دوست بن گیا ہے۔''

''لیکن وہ تو آٹھویں کلاس میں پڑھتا ہے۔''

''ہاں' لیکن ایک دن وہ رو رہا تھا اکیلا گراؤنڈ میں بیٹھا تو میں نے اس سے پوچھا تھا' وہ کیوں رو رہا ہے۔''

''تو وہ کیوں رو رہا تھا؟'' امثل نے یونہی پوچھا۔

''اسے اپنی باجی اور اپنے عباس بھائی یاد آرہے تھے۔ اس کے بابا جان نے اسے یہاں بھیج دیا تھا اور اس کی باجی وہاں تھیں' کراچی میں۔''

''اچھا۔''

''تو بس میری دوستی ہوگئی۔ میں کبھی کبھی اس سے اپنا لنچ شیئر کرتا ہوں۔ اسے ہوسٹل کا کھانا بالکل پسند نہیں ہے نا۔''

دور تک ویگن یا بس کا نشان نہیں تھا اور اسٹاپ بچوں اور لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔

''باجی! یہاں سے تو ویگن دیر سے ملتی ہے' تھوڑا چلنا پڑے گا۔ اگلے اسٹاپ پر چلتے ہیں۔ میں تو وہاں سے ہی ویگن لیتا ہوں۔''

''چلو ٹھیک ہے۔''

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی لیکن اس کا ذہن سر تنویر میں ہی الجھا ہوا تھا۔

◆◆◆

وہ ننھے بچوں کی طرح خوشی سے پورے گھر میں گھومتی پھر رہی تھی۔

''یہ گھر بہت خوبصورت ہے۔ ہے نا عباس!''

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن عباس وہاں نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی وہ عباس کے ساتھ گھر آئی تھی۔ ڈیفنس کا یہ گھر ملک فیروز خان نے عابد سہگل سے خریدا تھا جسے عابد سہگل نے اپنی رہائش کے لیے بنوایا تھا اور زیادہ تر عمارتی سامان باہر کے علاقے سے آیا تھا لیکن پھر اس نے اپنی فیملی کے ساتھ امریکا میں سیٹل ہونے کا فیصلہ کیا تو گھر فروخت کر دیا اور اب یہ ملک فیروز خان کی قسمت تھی کہ انہوں نے اس گھر کو خرید لیا تھا۔

''عباس...... عباس...... سنیں۔''

اس نے بلند آواز میں اسے پکارا تو ایک کمرے کا دروازہ کھول کر عباس باہر نکل آیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے اور آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ میرا کمرہ کون سا ہے۔''

''میں ایک ضروری فون کرنے چلا گیا تھا۔ آیئے' آپ کو آپ کا کمرہ دکھاؤں۔ آپ کے کمرے کے ساتھ ہی سعدون کا کمرہ ہے اور نیچے گراؤنڈ فلور پر ملک صاحب کا بیڈروم ہے۔''

''اور آپ کا روم کدھر ہے؟''

''میں نے اپنے لیے انیکسی پسند کی ہے۔''

''آپ نے پسند کی ہے یا بابا جان نے کہا ہے۔''

''آپ جو بھی سمجھ لیں۔'' وہ مسکرایا تو پہلی بار درثمین نے غور سے اسے دیکھا۔ ڈیزی نے صحیح ہی کہا تھا' اس کی مسکراہٹ بہت خوبصورت تھی جو پورے چہرے کو روشن کر دیتی تھی۔

''کیا بابا جان! آپ کی شادی کر رہے ہیں؟''

وہ یکدم ہنس دیا۔ ''یہ خیال آپ کو کیسے آیا۔''

''اس لیے کہ آپ انیکسی میں جو ٹھہرے ہیں تو......''

''لیکن مجھ سے تو انہوں نے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔'' عباس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ہنوز ٹھہری ہوئی تھی۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ گھر کے اندر ہی رہتا رہا تھا اور ملک فیروز خان کے بیڈروم کے ساتھ ہی اس کا روم بھی ہوتا تھا لیکن اب...... یہ انیکسی اس کے لیے ڈیکوریٹ کروانا۔ دو بیڈروم' ٹی وی لاؤنج' اٹیچڈ باتھ' سٹنگ۔ انیکسی بھی گھر کی طرح ہی خوبصورت تھی اور جب گھر ڈیکوریٹ کیا جا رہا تھا تو ملک فیروز خان نے خاص طور پر انٹیریر ڈیکوریٹر کو انیکسی کے متعلق بھی ہدایات دی تھیں۔

''تو کیا۔ کمال ہے' مجھے خیال تک نہیں آیا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

بے خیالی میں وہ بڑبڑایا تو درثمین نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''ہاں' آپ کو خیال تک نہیں آئے گا اور بابا جان نے پکڑ کر کر دینی ہے آپ کی شادی' کسی ایسی ویسی لڑکی سے لیکن آپ صاف کہہ دیجئے گا کہ دیکھے بغیر نہیں کریں گے آپ کسی سے شادی۔''

وہ ہولے سے ہنسا تو ثمین نے غصے سے اسے دیکھا۔

''ہنس لیں۔ جب بابا جان نے کہنا ہے کہ چلو بھئی' جلدی سے سہرا باندھ کر تیار ہو جاؤ ایک گھنٹے بعد تمہارا نکاح ہے پھر روئیں گے سر پکڑ کر' اس لیے پہلے سے ہی کہہ دیجئے بابا جان کو۔''

''لیکن اگر انہوں نے میری بات نہ سنی تو...... آپ کو تو پتا ہے وہ تو بس حکم دینا جانتے ہیں۔''

وہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبا کر مسکرایا۔

''تو آپ دھمکی دے دینا کہ اگر انہوں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی تو خودکشی کر لیں گے' وغیرہ وغیرہ۔''

وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اسے مختلف مشورے دے رہی تھی اور وہ اس کے مشوروں پر بے حد محظوظ ہو رہا تھا۔

''یہ رہا آپ کا کمرہ۔'' لاؤنج میں کھڑے کھڑے عباس نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

''اور یہ اس کے بالکل ساتھ سعدون کا۔''

''اور سعدی کب آئے گا؟''

اس نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے پوچھا۔

''ظاہر ہے' ابھی تو نہیں آ سکتا۔ چھٹیوں میں ہی آئے گا۔''

''لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ جب میں گھر آؤں گی تو سعدی بھی آ جائے گا۔ اگلے ماہ تو چھٹیاں ہو رہی ہیں۔''

''ہاں' کہا تو تھا لیکن سعدون خود نہیں آنا چاہتا گھر۔''

''خود نہیں آنا چاہتا۔'' اسے حیرت ہوئی۔

''ہاں۔''

''وہ ضرور ناراض ہوگا بابا جان سے' اس لیے کہہ رہا ہوگا۔ ویک اینڈ پر تو آئے گا نا تو میں خود اس سے بات کر لوں گی۔''

اس نے گھوم پھر کر کمرے کو دیکھا۔

''یہ کمرہ آپ نے سجایا ہے۔ میرا مطلب ہے آپ کی پسند ہے۔''

''نہیں' یہ سارا کچھ تو مس عظمیٰ نے کیا ہے۔ فرنیچر اور پردوں کی خریداری سے لے کر ڈیکوریشن پیسز تک۔'' عباس نے بغور اسے دیکھا۔ ''کیا پسند نہیں آیا؟''

"نہیں' اچھا ہے۔" اس نے پردہ کھینچ کر کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی نیچے لان کی طرف کھلتی تھی۔ کھڑکی کھلتے ہی مختلف پھولوں اور پھلوں کی ملی جلی خوشبو اندر آئی۔ اس نے ایک لمبا سانس لے کر عباس کی طرف دیکھا۔

"یہ مس عظمیٰ کون ہیں۔"

"انٹیریئر ڈیکوریٹر ہیں۔"

"آپ ملے ان سے؟" وہ بیڈ کے کنارے پر ٹک گئی۔

"ہاں' ظاہر ہے روز ملاقات ہوتی تھی' جب تک گھر سیٹ نہیں ہوا۔"

"کیسی ہیں؟"

"اچھی' خوش شکل سی ہیں۔"

"کیا شادی کی جاسکتی ہے ان سے؟"

عباس نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"دثمین! یہ آپ کن چکروں میں پڑ گئیں۔ مس عظمیٰ میریڈ ہیں۔"

"میں آپ کو کسی ظالم انجانی لڑکی سے بچانے کی کوشش کر رہی ہوں اور آپ قہقہہ لگا رہے ہیں۔" درثمین نے برا سا منہ بنایا۔

"بابا جان کہاں ہیں؟"

"یہیں ہیں لاہور میں۔ ہیڈ آفس یہاں ہی بنایا ہے' وہاں ہوں گے اس وقت۔"

"رات کو ملاقات ہوگی؟"

"ظاہر ہے۔ پیپرز کیسے ہوئے آپ کے۔" عباس کو اچانک یاد آیا۔

"پتا نہیں۔" اس نے بے نیازی سے کہا۔ "جب رزلٹ آیا تو پتا چل جائے گا۔"

"کیوں' کیا اچھے نہیں ہوئے۔" عباس نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔

اس سے کچھ بعید نہ تھا کہ جان بوجھ کر پیپرز چھوڑ آئی ہو۔

"ہوسٹل میں رہ کر جیسے ہو سکتے تھے' ویسے ہی ہوئے ہیں۔"

"لیکن لوگوں کا خیال ہے ہوسٹل میں رہ کر زیادہ بہتر پڑھائی ہوتی ہے' بہ نسبت گھر کے۔"

عباس نے مشکوک نظروں سے اسے دیکھا۔

"لوگوں کا خیال ہے' میرا نہیں۔" درثمین کے انداز میں بے نیازی تھی۔

"درثمین! میں نے آپ سے کہا تھا' آپ نے اچھی طرح پیپرز دینے ہیں۔ اگر آپ کا رزلٹ اچھا نہ آیا تو مجھے شرمندگی ہوگی۔" عباس یکدم سنجیدہ ہوگیا۔

"خیر' اب اتنا بھی برا رزلٹ نہیں ہوگا کہ آپ کو شرمندگی ہو۔"

وہ ذرا سا مسکرائی اور پھر ایک دم جیسے کچھ یاد کرتے ہوئے چونکی۔

"وہ...... وہ عباس' ڈیزی ہے نا اور عفیرہ۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ تمہارا کزن بہت ڈیشنگ ہے اور پتا ہے' ڈیزی نے مجھے بتایا ہے کہ عفیرہ آپ پر مرنے لگی ہے۔" عباس کا چہرہ سرخ ہوا اور پیشانی پر شکنیں سی پڑ گئیں۔

"آپ کو ایسی فضول لڑکیوں سے دوستی نہیں کرنا چاہیے۔"

"خیر وہ میری تو نہیں' میری روم میٹ ڈیزی کی دوست ہے لیکن ایسی فضول بھی نہیں' اچھی خاصی خوبصورت ہے۔" پرس سے چیونگم نکال کر منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے کن انکھیوں سے عباس کو دیکھا۔

"پتا ہے' جس روز آپ آتے ہیں نا تو وہ جان بوجھ کر لان میں بیٹھ جاتی ہے آپ کو دیکھنے کے لیے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر آپ ڈراموں میں کام کرنے لگیں تو بہت دھوم مچ جائے گی آپ کی۔"

وہ مزے سے چیونگم چباتے اسے دیکھ رہی تھی' تب ہی عباس کے موبائل فون کی بیپ ہوئی اور عباس چہرے پر آئے ناگوار تاثرات چھپاتے ہوئے موبائل فون کی طرف متوجہ ہوگیا۔ کچھ دیر وہ دوسری طرف کی بات سنتا اور جی جی کہتا رہا پھر موبائل آف کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"ملک صاحب آپ کا پوچھ رہے تھے کہ آپ گھر پہنچ گئی ہیں۔" درثمین نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ بیڈ پر بیٹھی یونہی ٹانگیں ہلاتی رہی۔

"وہ کچھ دیر میں سعدون کو لے کر گھر پہنچ رہے ہیں۔"

"کیا...... سعدون کو......" خوشی سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"لیکن آپ تو کہہ رہے تھے کہ سعدون......"

"ہاں' مجھ سے سعدی بابا نے یہی کہا تھا۔ شاید ملک صاحب خود ہی اسے لینے چلے گئے۔"

وہ جو ابھی تک کمرے کے وسط میں کھڑا تھا' موبائل پاکٹ میں رکھتے ہوئے واپس مڑا۔

"آیئے' آپ کو سعدون کا کمرہ دکھادوں۔"

"نہیں' بعد میں دیکھ لوں گی' پہلے میں ذرا باتھ لے کر فریش ہوجاؤں۔ تب تک بابا جان اور سعدی بھی آجائیں گے۔ میرا سوٹ کیس اوپر بھجوا دیجئے گا۔"

"ٹھیک ہے۔" عباس باہر نکل گیا تو اس نے وارڈ روب کھول کر دیکھا' ڈریسنگ ٹیبل کا معائنہ کیا۔ بیڈ سائیڈ پر رکھے ٹیبل لیمپ کو سراہا۔

"بہر حال' مس عظمیٰ کی پسند اچھی ہے۔" وہ مسکرائی اور ملازم کو سوٹ کیس اندر لانے کے لیے کہا جو دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

اور پھر جب باتھ لے کر اپنے لانبے بالوں میں برش کر رہی تھی کہ اسے گیٹ کھلنے اور پھر پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔

''شاید بابا جان اور سعدی آ گئے ہیں۔'' بال یونہی پشت پر کھلے چھوڑ کر وہ دوپٹہ گلے میں ڈالتے نیچے چلی آئی اور لاؤنج میں صوفے پر بیٹھے سعدون کی طرف بے قراری سے بڑھی۔

''سعدی! تم آ گئے۔ میں تمہیں بہت مس کر رہی تھی۔''

سعدون بے حد تھکا تھکا سا لگ رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے پپوٹے بھی سوجے ہوئے تھے کچھ۔ اس نے وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''سعدی! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے وہ اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

''ہاں' ٹھیک ہوں۔'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔

''لیکن تم کچھ کمزور لگ رہے ہو سعدی!'' وہ تشویش سے اسے دیکھ رہی تھی۔

وہ پہلے کے مقابلے میں دبلا لگ رہا تھا اور چہرے کی رنگت بھی پھیکی سی پڑی ہوئی تھی۔

''نہیں تو آپ کو وہم ہوا ہے۔''

اب کے اس نے نظر اٹھا کر درثمین کی طرف دیکھا۔

''نہیں' وہم تو نہیں لیکن شاید وہ کچھ لمبا ہو رہا تھا' اس لیے اسے دبلا لگا اور پھر پیپرز کے دوران شاید اس نے محنت بھی کی ہو گی اور وہاں ہاسٹل میں بھلا کہاں خیال رکھا ہو گا اس نے اپنی خوراک کا۔ حالانکہ عباس جس طرح اسے دودھ کے ڈبے' بسکٹ' چکن بریڈ اور مختلف کھانے پینے کی اشیاء ہر ویک اینڈ پر دے جایا کرتے تھے' اس طرح سعدون کے ہوسٹل بھی لے کر جاتے تھے لیکن سعدون تو ہمیشہ سے لاپروا تھا۔ پھر بچہ ہی تو ہے ابھی۔ وہاں کراچی میں بھی تو عباس خود رات کو سونے سے پہلے دونوں کے کمروں میں دودھ کے گلاس بھجواتے تھے اور سعدی کو تو اپنے سامنے پلاتے تھے' ورنہ گلاس ٹیبل پر ہی پڑا رہتا تھا' یونہی دودھ سے بھرا۔ خیر اب سعدون گھر پر رہے گا تو میں خود اس کا خیال رکھوں گی۔''

سعدون کا ہاتھ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔

''تمہارا رزلٹ کب تک آئے گا؟''

''یکم اپریل کو میرا رزلٹ آ گیا تھا۔''

''کیسا رہا؟'' اس نے بے حد اشتیاق سے پوچھا۔

''عباس نے مجھے بتایا ہی نہیں۔''

وہ خاموش نگاہیں جھکائے جوتے کی ٹو کارپٹ پر مارتا رہا۔

''تم فیل ہو گئے ہو سعدون!'' یکدم گھبرا کر اس نے پوچھا

''نہیں' پاس ہو گیا ہوں۔'' سعدون نے آہستگی سے کہا۔

''لیکن نمبرز اچھے نہیں آئے' اس لیے پرنسپل کا خیال ہے کہ مجھے آرٹس کے سبجیکٹ رکھنا چاہئیں۔''

''لیکن سعدون وہاں کراچی میں تو تم پوزیشن لیتے تھے' یہاں آ کر کیا ہو گیا تمہیں۔''

درثمین پریشان ہو گئی تھی۔ سعدون خاموش ہی رہا' تب ہی ملک فیروز خان' عباس کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

''السلام علیکم بابا جان!'' درثمین کھڑی ہو گئی۔

''وعلیکم السلام۔'' انہوں نے ایک سرسری نظر اس پر ڈالی۔

''کیسی ہو؟''

''جی ٹھیک ہوں۔'' درثمین کے اندر جیسے کچھ ٹوٹ گیا۔ وہ کتنے مہینوں بعد ان سے مل رہی تھی۔ اس ایک سال کے دوران وہ صرف ایک بار ہوسٹل ملنے آئے تھے اور دسمبر کی چھٹیوں میں انہوں نے اسے حویلی بھجوا دیا تھا کیونکہ وہ خود انگلینڈ جا رہے تھے اور سعدون کو بھی ساتھ لے جا رہے تھے اور دسمبر کی دس چھٹیاں اس نے حویلی میں تقریباً روتے ہوئے ہی گزاری تھیں۔ اس نے سوچا تھا بابا جان اتنے دنوں بعد اس سے ملیں گے تو بہت بے چینی سے گلے لگائیں گے' پیار کریں گے لیکن ان کا انداز بالکل سرسری سا تھا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں مچلے' لیکن ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے انہیں پیچھے دھکیل دیا۔ عباس اس کی کیفیت سمجھ رہا تھا۔ ملک فیروز خان' سعدون کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

''خیر تم وہاں ایک سال کیا کرتے رہے ہو۔ جانتے ہو' میں نے تمہیں وہاں کیوں بھیجا تھا' اس لیے کہ تم یہاں سے اولیول کر لو تو تمہیں باہر بھجوا دوں اور اس اسکول کا رزلٹ ہمیشہ سب سے اچھا ہوتا ہے اور تم......''

انہوں نے ایک غصیلی نظر سعدون پر ڈالی اور مڑ کر عباس کی طرف دیکھا۔

''اس کے پرنسپل نے بلایا تھا اور کہا تھا کہ اسے کسی دوسرے اسکول میں بھیج دیں۔ ۳۸ فیصد نمبر لینے والے بچوں کو وہ اسکول سے نکال دیتے ہیں اور سائنس گروپ کے لیے ۶۰ فیصد مارکس لینا ضروری ہے۔ وہ کسی صورت تمہیں جماعت نہم میں بٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے' سنا تم نے۔ بمشکل انہیں رضامند کیا کہ اگر فرسٹ سمسٹر میں اس کے نمبرز کم آئے تو بے شک اسکول سے نکال دیجئے گا اور وہ مان گئے' اس لیے کہ یہ ملک فیروز خان کا بیٹا تھا۔ عباس! میں چاہتا ہوں تم خود اسے توجہ دو' جب تک یہ گھر پر ہے۔''

''جی ملک صاحب انہیں خود پڑھا دوں گا۔''

''یوں تو میں نے ایک ٹیوٹر کا بندوبست بھی کیا ہے۔ اگلے ماہ وچھٹیاں ہو جائیں گی تو صبح کے وقت وہ اسے پڑھائے گا۔ شام میں تم دیکھ لینا' فی الحال وہ شام میں آیا کرے گا اور تم صرف رات کو چیک کر لیا کرنا کہ اس نے کیا کیا ہے۔''

وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔ درثمین نے دیکھا' وہ بہت پریشان لگ رہے تھے۔ سعدون کے

رزلٹ نے پریشان تو اسے بھی کیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اسے غصہ آ گیا۔
''یہ سارا بابا جان کا قصور ہے۔ اتنی سی عمر میں اسے ہوسٹل بھیج دیا۔ حالانکہ جب تک وہ اس اسے خود ہوم ورک نہیں کرواتے تھے' وہ کہاں کرتا تھا اور وہ خود بھی اسے امتحان کے دنوں میں تیاری کرواتی تھی۔''
''اس میں کوتاہی نہ ہو۔''
''جی ملک صاحب!''
''اور ہاں۔'' وہ کچھ کہتے کہتے رک گئے۔
''میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں' چائے وہیں بھجوا دینا بلکہ چائے کا کہہ کر تم بھی آ جاؤ میرے کمرے میں۔ مجھے کچھ ضروری بات کرنا ہے تم سے۔''
''جی بہتر۔'' عباس نے ایک نظر خاموش بیٹھی ثمین اور بے زار سے بیٹھے سعدون پر ڈالی اور باہر نکل گیا۔
''تم نے میری بات اچھی طرح سمجھ لی ہے نا سعدون!'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔
''مجھے تم سے بہت امیدیں ہیں۔'' یہ اتنا بڑا کاروبار' یہ ملز' جاگیر یہ سب تمہیں سنبھالنا ہیں۔ چند دن بعد تم چودھویں سال میں قدم رکھ دو گے اور تمہیں خود سمجھنا چاہیے سب۔''
''ارے!'' درثمین کو خیال آیا۔
''سات دن بعد تو سعدون کی برتھ ڈے ہے۔ بابا جان! ہم سعدی کی برتھ ڈے کیسے سیلیبریٹ کریں گے؟''
وہ جو ابھی دل ہی دل میں ان سے ناراض تھی' بے اختیار پوچھ بیٹھی۔
''تم جیسے چاہو سیلیبریٹ کر لینا۔'' انہوں نے ایک نظر اس پر ڈالی۔
''سعدی! تم اپنے دوستوں کو بھی انوائٹ کر لینا اور میں بھی ڈیزی کو بلاؤں گی۔''
وہ تھوڑا سا سعدون کی طرف جھکی تو کھلے بال یکدم کندھوں پر آ گرے اور ملک فیروز خان چونکے۔
سنہری جھلک لیے براؤن بالوں کا آبشار۔
''زہرہ! جب تم بال کھولتی ہو تو جانتی ہو میرے دل پر کیا گزرتی ہے۔''
''میں سر تنویر کو بلاؤں گا۔'' سعدون سر اٹھائے انہیں دیکھ رہا تھا۔
''بلا لینا۔''
وہ اسے اجازت دے کر تیزی سے باہر نکل گئے اور سعدون کا چہرہ چمک اٹھا۔ کچھ دیر تک وہ یونہی سامنے دیکھتی رہی' جہاں سے ملک فیروز خان گئے تھے پھر سعدون کی طرف متوجہ ہو گئی اور برتھ ڈے کا پروگرام بنانے لگی۔
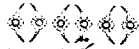
''ڈیڈ! آپ یقین کریں' وہ سو فیصد وہی تھی' لباس کا فرق تھا اور ہاں بال...... بالوں میں اس نے پونی نہیں لگا رکھی تھی بلکہ وہ اس کے کندھوں پر بکھرے تھے۔'' کاظم نے چوہدری جہانداد کی طرف دیکھا۔
''تمہیں تو ہر لڑکی ایک ہی جیسی نظر آتی ہے۔'' چوہدری جہانداد نے برا سا منہ بنایا۔
''نہیں ڈیڈ! لڑکیوں کے معاملے میں میری نظر کبھی دھوکا نہیں کھا سکتی۔ وہ سو فیصد وہی تھی اور اس روز وہ یہاں بہروپ بھر کر آئی تھی۔''
کاظم کا لہجہ پُر یقین تھا۔
''اور اگر وہ وہی لڑکی ہے تو اس سے وہ کہانی حاصل کرلو' ہر قیمت پر۔''
چوہدری جہانداد کے چہرے سے اضطراب جھلک رہا تھا۔
''یعنی پانچ لاکھ ادا کر کے۔'' کاظم مسکرایا۔
''تو ڈیڈ! ایسا کریں' وہ پانچ لاکھ مجھے دے دیں۔ میں آپ کو ابھی اسی وقت ایک شاندار کہانی لکھ کر دے دیتا ہوں' آپ کل کے اخبارات میں چھپوا دیں۔ ایک بار تو لوگ تڑپ اٹھیں گے پڑھ کر بعد میں بے شک ملک فیروز تردید چھپواتا اور ثبوت دیتا رہے۔''
''اس لڑکی کے پاس حقیقتاً کچھ سچ ہے کاظم! ورنہ وہ اتنی پُراعتماد نہ ہوتی۔'' چوہدری جہانداد نے پُرسوچ نگاہوں سے اسے دیکھا۔
''ڈیڈ! یہ لڑکیاں...... آپ مجھ سے زیادہ نہیں جانتے انہیں۔ بڑی لالچی ہوتی ہیں' پیسے کی بھوکی اور پیسے کے لیے بڑے ناٹک کرتی ہیں۔ وہاں اسٹیٹس میں......''
''یہ پاکستان ہے۔'' چوہدری جہانداد نے اسے ٹوک دیا۔
''ارے ڈیڈ!' وہ زور سے ہنسا۔ ''یہاں پاکستان میں بھی لڑکیاں کم نہیں ہیں۔ وہ نومی ایمان سے ڈیڈ! بہانے بہانے سے رقم جیب سے نکلوا لیتی ہے۔''
چوہدری جہانداد نے پھر برا سا منہ بنایا۔ انہیں کاظم کی یہ بے تکلفی کچھ زیادہ پسند نہ تھی۔
''تم نے پچھلے ماہ ایک لاکھ نکلوائے تھے۔''
''ہاں ڈیڈ!'' اس نے کان کھجائے۔ ''وہ تو بس خرچ ہو گئے۔ خیر یہ لڑکی آپ دیکھیے گا' اس نے باقاعدہ پلاننگ کی ہو گی پیسہ کمانے کے لیے اور اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہو گا' کوئی مرد پلاننگ کرنے والا۔''
''تم صرف تصوراتی گھوڑے ہی دوڑاتے رہو گے یا عملی طور پر بھی کچھ کرو گے۔''
''ڈیڈ! میں نے وہ جگہ دیکھ لی ہے' جہاں وہ کام کرتی ہے لیکن اسے پٹانے میں بہر حال کچھ دن تو لگیں گے ہی۔''

اعظم نے انہیں خاصا مایوس کیا تھا۔

''بابا جان! کیا ضروری ہے کہ سیاست میں ہمیشہ اوچھے ہتھکنڈے ہی استعمال کیے جائیں۔ اگر اس لڑکی کے پاس انکل فیروز خان کے متعلق کوئی راز ہے تو اسے راز ہی رہنے دیں۔ ضروری ہے کہ مخالف کے کردار پر کیچڑ اچھالا جائے۔ میں ایک ماہ تک آ رہا ہوں پھر کمپین کا کام خود دیکھ لوں گا۔''

سیاست میں اس طرح مولوی بن کر کامیاب نہیں ہوا جا سکتا پتر! داؤ پیچ تو لڑانے ہی پڑتے ہیں۔''

''لیکن یہ داؤ پیچ کسی کے کردار پر جھوٹا الزام لگانا تو نہیں ہوتا۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم بہت ایمانداری سے الیکشن لڑیں۔''

''ایمانداری سے اور الیکشن۔'' چوہدری جہانداد نے اونچا قہقہہ لگایا۔ ''اس ملک میں پچاس سال سے اب تک کتنے الیکشن ایمانداری سے لڑے گئے ہیں' ذرا یہ بتانا تو مجھے۔''

''جو کام پہلے نہیں ہوا' وہ اب تو ہو سکتا ہے نا بابا!''

''اوئے میں نے تمہیں مشورے کے لیے بلایا تھا نہ کہ سبق لینے کے لیے۔ بڑے صاحبزادے کو اپنی عشق و عاشقی سے فرصت نہیں اور چھوٹے صاحبزادے مولوی بن رہے ہیں۔ او بابا! مجھے یہ بتاؤ اس ملک میں کہاں کس شعبے میں ایمانداری ہے۔''

''بابا جان! ہم کوشش تو کر سکتے ہیں۔ آپ اگر الیکشن میں جیت جاتے ہیں تو اس بار کچھ نئے انداز سے کام کریں۔ گاؤں میں لڑکیوں کا ہائی اسکول نہیں ہے' وہاں دینی تعلیم کی کمی ہے۔''

''یہ سبق کسی اور کو پڑھانا جا کر پتر! مجھے اپنے کام کا پتا ہے۔ لگتا ہے فزکس کے بجائے فقہ اور حدیث پڑھ رہے ہو وہاں۔''

اعظم کو بلانا بے فائدہ ثابت ہوا' اس لیے کاظم کی واپسی پر انہوں نے پھر اسی سے مشورہ لیا۔

''خیر' یہ کام جلد کر لو تو بہتر ہے۔''

''ہو جائے گا ڈیڈ! بے فکر رہیں۔ چند روز میں لڑکی آپ کے سامنے ہوگی۔''

وہ کھڑا ہو گیا۔ ''اور ہاں ذرا ایک چیک پر سائن تو کر دیجیے۔''

انہوں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور دراز سے چیک بک نکال لی۔

''نومی اسلام آباد سے اس کے ساتھ ہی آئی تھی اور ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی اور مشکل یہ تھی کہ اسے کنگن پسند آ گئے تھے اور وہ انہیں خریدنے کی ضد کر رہی تھی جبکہ کاظم کی جیب میں اتنی رقم نہ تھی۔

''بیس ہزار۔'' اس نے میز پر دونوں ہاتھ ٹیکتے ہوئے جھک کر چیک دیکھا۔

''ڈیڈ! آپ بہت کنجوس ہو رہے ہیں آج کل۔''

''صاحبزادے پیسے درختوں پر نہیں اگتے۔''

''لیکن مجھے کم از کم پچاس ہزار کی ضرورت ہے۔'' چوہدری جہانداد نے خاموشی سے چیک پھاڑ کر دوسرا چیک لکھ دیا۔

''ڈیڈ! یو آر سو سویٹ۔''

اور اب یہ محض اتفاق ہی تھا کہ وہ وہاں سے نومی کی طرف جا رہا تھا کہ وہ اسے نظر آ گئی۔ اس نے نومی کے لیے پھول خریدنے کے لیے گاڑی پارک کی تھی کہ وہ اسے پھولوں والی دکان سے بکے لیتی نظر آ گئی۔

''ہیلو مس!'' اس کے بالکل قریب جا کر اس نے آہستگی سے کہا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر دکاندار کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''یہ والا بکے نکال دیں پلیز۔''

''کیسی ہیں آپ؟'' وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا' اس نے نظر انداز کر دیا۔

''اتنی بے نیازی تو مت دکھائیں پلیز۔'' کاظم کی نظریں اس کے چہرے پر تھیں۔

''اور ہاں' وہ کہانی جو آپ فروخت کرنا چاہتی تھیں' میرے والد اسے خریدنے کے لیے تیار ہیں۔''

''کک......کون سی کہانی۔'' لڑکی نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

''اتنی انجان تو مت بنیں مس!''

''آپ کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔'' اس نے بمشکل تھوک نگلا۔

''غلط فہمی کیسی۔ میڈم! لباس بدلنے سے چہرے تو نہیں بدل جاتے اور کاظم جہانداد خان کی نظر اتنی بھی کمزور نہیں ہے۔ بہر حال میں کل ایک بجے آپ کے آفس کے ساتھ والے کیفے میں آپ کا انتظار کروں گا اور وہاں اس معاملے پر بات چیت کر لیں گے۔''

وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکا' مسکرایا اور ایک لمبی ٹہنی جس پر صرف ایک آدھ کھلا گلاب تھا' کاؤنٹر سے اٹھائی اور پے منٹ کر کے باہر جاتے جاتے ایک نظر اس پر ڈالی۔ وہ ماتھے سے پسینے کے قطرے صاف کر رہی تھی۔

جب وہ چوہدری جہانداد کے آفس سے نکل رہی تھی تو یہ ہی شخص تھا جو اندر داخل ہو رہا تھا۔

''کاظم جہانداد......تو گویا یہ چوہدری جہانداد کا بیٹا ہے۔''

''پھول لے لیے امثل؟'' فریدوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیک لے لیا؟''

"ہاں اور تم...... کیا ہوا' پریشان لگ رہی ہو۔"

"نہیں' کچھ نہیں۔ بس یوں ہی ایک دم دل گھبرا گیا۔"

"مت گھبرایا کرو تو ما! آنٹی تو اب پہلے سے بہت بہتر ہیں۔"

"ہاں' اللہ کا شکر ہے۔"

"شاید ہومی کی وجہ سے پریشان ہو لیکن ہومی نے میری بات سمجھ لی ہے اچھی طرح سے اور میرا خیال ہے کہ اب تمہیں اس کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں اور پھر میں ہر روز اسے خود اسکول سے پک کرلوں گا۔"

"ہاں لیکن میں سوچ رہی تھی کہ اسکول بدل ڈالوں۔"

"لیکن یہ بہت اچھا اسکول ہے۔"

"لیجیے میڈم!" لڑکے نے کیک کا شاپر اس کے حوالے کیا۔

"پے منٹ کردی؟" فریدوں نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور فریدوں کے ساتھ باہر نکل آئی۔ بظاہر وہ فریدوں سے بات کر رہی تھی لیکن اندر ہی اندر بے حد پریشان تھی۔ جذبات میں آکر وہ ایک حماقت کر چکی تھی اور اب اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس شخص سے کیسے جان بچائے جو شاید اس کے تعاقب میں تھا۔

آج ہمایوں کی برتھ ڈے تھی اور وہ دفتر سے سیدھی فریدوں کے ساتھ کیک لینے آئی تھی کہ فریدوں نے اسے کیک خریدنے کے لیے کہا تھا۔ آج ہی آپا کی بھی برتھ ڈے تھی اور یہ کیک ان کے لیے تھا۔

"تومی! پلیز اتنا پریشان کیوں رہنے لگی ہو' جب میں ہوں تمہارے ساتھ پھر۔"

اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ نرم لہجے میں کہہ رہا تھا۔ فریدوں کا ساتھ ہمیشہ ہی اسے ہلکا پھلکا کر دیتا تھا لیکن اس وقت اس کا ذہن و دل بہت بوجھل تھا اور یہ کتنی بڑی حماقت ہوئی تھی اس سے اور حاصل حصول بھی کچھ نہ ہوا تھا۔ اس روز دراز صاف کرتے ہوئے یہ فائل نکل آئی تو وہ یونہی اسے پڑھنے لگی۔ جس اخبار میں وہ پہلے کام کرتی تھی' وہاں اکثر ملک فیروز خان اور چوہدری جہانداد کے متعلق کچھ نہ کچھ چھپتا ہی رہتا تھا' سو ناموں کی حد تک وہ ان سے واقف تھی۔

کہانی اتنی بڑی نہ تھی۔ بس یہ تھا کہ ملک فیروز خان کے پردادا لے پالک تھے اور انہوں نے ایک کوٹھے پر جنم لیا تھا۔ جہاں ان کا وجود غیر ضروری تھا۔ سو نہ جانے کیسے وہ ایک یتیم خانے تک پہنچے اور وہاں سے بے اولاد چوہدری کماندار خان نے انہیں گود لے لیا تھا۔ ان کی شادی اپنی بھانجی سے کی اور ان کے دو بیٹے پیدا ہوئے جس سے ایک ملک فیروز خان کے دادا

تھے۔ دادا کی چھ اولادیں تھیں۔ چار بیٹیاں' دو بیٹے۔ ایک بیٹا تو شادی سے پہلے ہی جوانی میں گھوڑے سے گر کر مر گیا تھا اور دوسرے بیٹے تھے ملک فیروز خان کے والد جن کا صرف ایک ہی بیٹا تھا ملک فیروز خان۔

ملک فیروز خان نے اپنے زمانے کی مشہور ماڈل گرل زہرہ جمال سے شادی کی تھی۔ زہرہ جمال کی والدہ کسی زمانے میں ریڈ لائٹ ایریے میں گانا گایا کرتی تھی۔ زہرہ جمال سے شادی کرنا تو اتنی خاص بات نہیں تھی کہ اکثر جاگیردار ایسی شادیاں کرتے رہتے ہیں لیکن اہم اور خاص بات یہ ہے کہ زہرہ جمال کی موت طبعی نہ تھی بلکہ فیروز خان نے اسے قتل کروادیا تھا کیونکہ اسے شبہ تھا کہ زہرہ جمال اس کے ساتھ بے وفائی کر رہی ہے۔

یہی وہ کہانی جس نے امثل کے ذہن میں وہ خیال پیدا کیا تھا اور وہ چوہدری جہانداد کے ہاں پہنچ گئی تھی کہ اسے ماما کے علاج کے لیے پیسے کی ضرورت تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اگر اس کے پاس پانچ لاکھ روپے ہوئے تو وہ ماما کا علاج بہتر طریقے سے کرواسکے گی لیکن اسے کچھ حاصل تو ہوا نہیں تھا' اوپر سے یہ مصیبت اور اگر فریدوں کو معلوم ہوگیا تو...... اور پتا نہیں یہ سب سچ بھی تھا یا جھوٹ۔

اس نے ساتھ ساتھ چلتے فریدوں کو دیکھا جو نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

"تم نے کچھ کہا فریدوں!"

"میں تو مسلسل کچھ کہہ رہا ہوں لیکن تمہارا ذہن کہیں اور ہے۔"

"نہیں تو بس یونہی میں ذرا ماما کے متعلق سوچ رہی تھی۔" وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

فریدوں نے کیک کا شاپر اسے پکڑا کر بائیک اسٹارٹ کی۔

"بیٹھو۔"

اور بائیک پر بیٹھتے بیٹھتے اس کی نظر پارکنگ میں موجود سفید کرولا پر پڑی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا شخص ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

امثل کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر فریدوں کی شرٹ کو مضبوطی سے تھام لیا اور کاظم جہانداد مسکرایا۔

"تو میرا اندازہ درست تھا۔"

"اور یہ ہے وہ شخص جس نے یہ کہانی تخلیق کی اور پلان بنایا۔"

"اور اب یہ شاید گھر تک ہمارا تعاقب کرے۔"

"فریدوں!" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔ "فریدوں! پلیز تھوڑی دیر یہاں کہیں رک جاؤ' میرا دل...... پتا نہیں کیا ہو رہا ہے مجھے۔"

فریدوں نے مڑ کر اس کے سپید ہوتے چہرے کو دیکھا۔

''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں تھی امثل تو تمہیں نہیں آنا چاہیے تھا۔'' امثل نے پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے۔

''کم آن۔ وہ سامنے کولڈ اسپاٹ ہے' وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔ کچھ پی لو' شاید طبیعت ٹھیک ہو جائے۔'' امثل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اور پھر کولڈ اسپاٹ کی طرف جاتے ہوئے اس نے دیکھا۔ کاظم جہانداد کی گاڑی ان کے پاس سے گزر کر دائیں طرف مڑ گئی تھی اور ایک اطمینان بھرا سانس لیتے ہوئے اس نے فریدوں کا ہاتھ تھام لیا جو تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔

❁❁❁

ہمایوں بہت خوش تھا اور بار بار اپنے تحائف دیکھ رہا تھا۔

''آپی! میں یہ گیم ٹی وی پر لگا کر دیکھ لوں۔'' اس نے امثل سے پوچھا تو ٹیبل پر سے برتن اٹھاتی امثل نے چونک کر اسے دیکھا۔

یہ کونٹرا گیم امثل نے ہی اسے گفٹ کیا تھا۔

''ہاں دیکھ لو لیکن صبح تمہیں اسکول بھی جانا ہے۔ خیال رکھنا ایک آدھ گیم کھیل کر سو جانا۔''

''ٹھیک ہے آپی!''

''امثل!'' مسز فاروق نے اسے آواز دی۔

''جی ماما!''

''برتن سمیٹ کر میرے پاس آنا۔''

''جی آ رہی ہوں' تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔''

''برتن رکھ دینا' صبح ماسی آ کر دھو دے گی۔''

ابھی کچھ دیر پہلے ہی لالہ' فریدوں' آپا اور آنٹی گئے تھے۔ سب نے ہمایوں کی برتھ ڈے میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا تھا۔ اس کا تو خیال تھا کہ ہومی کیک کاٹ لے گا اور وہ اسے گفٹ دے گی۔ لیکن جب وہ فریدوں کے ساتھ گھر آئی تو لالہ' آپا اور آنٹی کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ انہوں نے تو اچھا خاصا اہتمام کر ڈالا تھا۔ برآمدے میں ٹیبل لگا کر وہ اس کی منتظر تھیں۔ ہومی نئے کپڑے پہنے بے حد خوش سا بیٹھا تھا۔ لالہ' آنٹی سب ہی اس کے لیے تحفے لائے تھے۔

''لالہ! یہ سب۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ایک لفظ بھی مت کہنا ثومی! لالہ نے اسے تنبیہہ کی۔'' ہومی صرف تمہارا ہی بھائی نہیں ہے' ہمارا بھی حق ہے اس پر۔''

اس نے پلکیں جھپک کر آنسو روکے تھے اور یہ سب لوگ اگر نہ ہوتے تو زندگی کتنی مشکل ہو جاتی۔ پاپا کے بعد تو جیسے زندہ رہنا ہی مشکل ہو گیا تھا۔ ایسے میں فریدوں کی امی' ابو اور آپا

نے انہیں بہت سہارا دیا تھا۔ پاپا کی زندگی میں ہی ان لوگوں سے ان کے تعلقات تھے اور وہ اب تک نبھا رہے تھے۔ لالہ کی دوستی تو اپنی جگہ تھی ہی' فریدوں نے بھی ہر موقع پر ان کا ساتھ دیا تھا۔ ہر آن اس کا خیال رکھا تھا اور اس نے اتنی بڑی حرکت فریدوں سے پوچھے بغیر کی تھی۔

''چلو فٹافٹ فریش ہو کر آؤ۔'' لالہ نے اسے خاموش دیکھ کر کہا۔

''اور یہ کیک کا ڈبا مجھے دو۔''

وہ بنا کچھ کہے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اور بالوں میں برش کر کے جب وہ باہر آئی تو لالہ کیک پر موم بتیاں لگا چکی تھی۔ بہت خوشگوار ماحول میں کیک کاٹا گیا تھا۔

ہومی کے ساتھ ساتھ سب نے آپا کو بھی وِش کیا تھا اور فریدوں نے انہیں بکے دیا۔

ادھر ادھر کی باتیں کرتے اور کھاتے پیتے ہوئے اچانک آنٹی نے ماما سے اسے مانگ لیا۔

''بہن! امثل کو میری بیٹی بنا دیجیے۔ جب یہ چھوٹی سی تھی' تب سے میں سوچتی تھی کہ اسے اپنے فریدوں کی دلہن بناؤں گی۔''

''تمہاری ہی بیٹی ہے بہن!'' اس نے دیکھا' ماما کا چہرہ چمک اٹھا تھا۔

وہ چائے بنانے کے لیے اٹھی تھی کہ فریدوں بھی اس کے پیچھے کچن میں چلا لیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور آنکھیں اندرونی خوشی سے دمک رہی تھیں۔

''ثوما! تم نے سنا' امی کیا کہہ رہی تھیں؟'' خوشی اس کے لہجے سے چھلک رہی تھی۔

ثوما چائے کا پانی چولہے پر رکھ کر اس کی طرف مڑی۔ وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی' فریدوں چونکا اور اس کے مسکراتے لب بھینچ گئے۔

''امثل! کیا بات ہے' تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟ کیا تم کہیں اور......''

''فضول مت بکو۔'' امثل کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔

''کیا تم نہیں جانتے مجھے۔''

''تو پھر اتنی چپ کیوں ہو۔'' فریدوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''فریدوں! تم آنٹی کے اکلوتے بیٹے ہو۔ ظاہر ہے تمہارے لیے ان کے دل میں بہت ارمان ہوں گے۔ تم برسرِ روزگار ہو' وہ یقیناً تمہاری شادی جلد کرنا چاہیں گی جبکہ میں ابھی ایسا نہیں کر سکتی۔ میں ماما اور ہومی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتی فریدوں! انہیں میری ضرورت ہے۔ تم جانتے ہو بہت اچھی طرح سے کہ میں نے تمہاری رفاقت کا خواب دیکھا ہے ہمیشہ لیکن ہر خواب کی تعبیر نہیں ہوتی شاید۔'' اس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔

''میں تم سے یہ نہیں کہہ سکتی کہ تم اس وقت کا انتظار کرو جب میں......''

''تم کہہ کر تو دیکھو ثومی! میں قیامت تک تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔''

فریدوں کے لبوں پر مسکراہٹ تھی۔

''میں جانتی ہوں لیکن آنٹی اور انکل شاید انتظار نہ کرسکیں۔ ہم ہمیشہ اچھے دوست رہیں گے' تمہاری وجہ سے مجھے ہمیشہ تحفظ کا احساس رہا ہے۔ بس تم سے اتنی سی درخواست ہے کہ ہمیں کبھی اکیلا مت چھوڑنا۔''

''احمق لڑکی!'' فریدوں نے اسے سرزنش کی۔ ''میرا فی الحال شادی کا کوئی ارادہ نہیں۔ پہلے لالہ کی شادی ہوگی اور پھر مجھے آپا کا بھی سوچنا ہے۔ میں نے امی سے صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک لالہ کی شادی نہیں ہو جاتی' تب تک وہ میرے متعلق سوچیں بھی نہ اور وہ شاید ابھی تمہاری ماما سے بات نہ کرتیں لیکن وہ تمہارے لیے بہت پریشان تھیں اور چاہتی تھیں کہ جلد از جلد کہیں تمہاری بات بن جائے۔ سو اس خیال سے امی نے بات کی کہ وہ تمہارا رشتہ کہیں اور نہ کردیں اور پھر ان کو بھی اطمینان ہو جائے۔''

''لیکن فریدوں! میں کم از کم چھ سات سال تک تو بالکل شادی نہیں کرسکتی جب تک ہومی سمجھ دار نہ ہو جائے۔''

''جب تم اس طرح غیروں والی بات کرتی ہو نا تو جی چاہتا ہے کہ ایک جھانپڑ لگاؤں تمہارے منہ پر۔ ثوما! کیا ہم بچپن سے اکٹھے نہیں ہیں' کیا تم میرے شب و روز سے واقف نہیں' کیا تم اپنے اور تم سے متعلق لوگوں کے بارے میں میرے جذبوں سے آشنا نہیں ہو' کیا ہومی اور ماما میرے کچھ نہیں ہیں؟''

''فریدوں! تم......'' امثل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''ہاں اگر میں تمہیں پسند نہیں ہوں تو صاف صاف بتادو' میں ابھی جا کر آنٹی سے معذرت کرلیتا ہوں۔'' فریدوں کی آنکھوں کی شرارت امثل دیکھ نہ سکی اور غصے سے اسے دیکھا۔

''معذرت کرلیتا ہوں۔ بڑے آئے کہیں سے معذرت کرنے والے۔ فضول باتیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اب جاؤ۔''

''یعنی میں پسند ہوں تمہیں۔'' فریدوں کی آنکھوں میں بدستور شرارت تھی۔

''فریدوں...... تم جانتے ہو' میں نے تمہارے علاوہ کبھی کسی کے متعلق نہیں سوچا۔'' امثل جذباتی ہوگئی۔ ''میں کبھی کسی کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتی لیکن مجھے تمہارا خیال ہے کہ تم اتنا انتظار کیسے کرو گے' تمہاری بھی خواہشیں ہوں گی' تم بھی......''

''میں اپنا خیال خود بہتر رکھ رہا ہوں۔ تمہیں ضرورت نہیں ہے اور اب اس موضوع پر کوئی مزید بات مت کرنا' سمجھیں' ورنہ......'' اس نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی۔

''آج کتنا اچھا دن تھا' کتنا خوبصورت اور یادگار۔ اس دن کے لیے میں نے ہزاروں دعائیں کی تھیں اور تم نے اسے فضول باتوں میں گنوا دیا۔ ثومی! یوں تو ہم بچپن سے اکٹھے تھے' ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا اور دوستی تھی۔ میں ہمیشہ ہی تمہیں ہر کھیل میں پارٹنر بنانا پسند

کرتا تھا لیکن پتا ہے پہلی بار تمہیں کب دیکھ کر میرا دل عجیب انداز سے دھڑکا تھا اور کب مجھے لگا تھا کہ جیسے تمہارا وجود میری زندگی کے لیے بہت ضروری ہے۔ جب تم میٹرک میں تھیں اور تمہیں ٹائیفائیڈ ہو گیا تھا۔ میں فورتھ ایئر میں تھا اور امی کے ساتھ تمہارے گھر آیا تھا۔ آنٹی تمہارے ماتھے پر پٹیاں رکھ رہی تھیں اور تمہیں آنکھیں بند کیے لیٹے دیکھ کر میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا تھا۔ آنٹی نے بتایا کہ تمہیں ایک سو چار بخار ہے اور انکل فاروق اسلام آباد گئے ہوئے تھے۔ آنٹی ہمیں دیکھ کر رو پڑیں۔ امی نے انہیں تسلی دی کہ کوئی بات نہیں اور مجھے فوراً ڈاکٹر کی طرف دوڑا دیا لیکن تمہارا بخار شام تک ایک سو پانچ ہو گیا تھا اور تمہیں ہاسپٹل لے جانا پڑا اور اس روز مجھے لگا جیسے تمہارا ہونا میرے لیے بہت ضروری ہے۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو اس تصور سے ہی میرا دل جیسے ڈوب جاتا۔ تمہیں ہنسی آئے گی ثومی! لیکن یہ حقیقت ہے۔ انکل فاروق رات کو پہنچ گئے تھے' سو میں گھر آ گیا تھا اور گھر آ کر میں نے رو رو کر اللہ سے تمہاری زندگی کی دعا مانگی۔ میں کوئی ننھا بچہ نہیں تھا اور نہ ہی تمہیں کوئی خطرناک بیماری تھی لیکن پوری رات مجھے لگتا رہا جیسے تم مر جاؤ گی اور میں پوری رات روتا رہا۔ اللہ سے دعا میں کرتا رہا اور پتا ہے' میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر تمہیں کچھ ہو گیا نا تو میں بھی خود کو ختم کرلوں گا۔ بھلا ایسی زندگی جی کر کیا کروں گا میں' جس میں تم نہیں ہو گی۔''

''ارے۔'' لالہ نے صحن میں آتے ہی پکارا۔ ''تم دونوں کیا سیلون میں چائے کاشت کرنے چلے گئے تھے۔''

اس کے ہونٹوں پر ہنسی تھی۔

امثل جلدی سے چائے دم کرنے لگی۔ اس کا دل فریدوں کی اتنی بے پایاں محبت پا کر سرشار سا تھا اور وقتی طور پر وہ ہر پریشانی بھول گئی تھی۔

فریدوں نے مڑ کر لالہ کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

''یہ اپنی ہونے والی بھابھی کو سمجھاؤ کہ اتنی بے اعتباری اچھی نہیں ہوتی۔''

''میری بھابھی کو ہم پر اعتماد ہے۔ شاید آپ پر نہ ہو۔''

''اور زندگی تو اس نے میرے ساتھ گزارنا ہے نہ کہ تمہارے ساتھ۔''

''تو اتنی دیر سے آپ اپنا اعتبار بحال کر رہے تھے۔ کیا کچھ کامیابی ہوئی؟'' لالہ قریب آ گئی تھی۔

''پتا نہیں' ابھی کچھ اندازہ نہیں ہوا۔'' اس نے شرارت سے امثل کی طرف دیکھا۔ امثل نے ایک نظر اس پر ڈالی۔

''کیا اسٹامپ پیپر پر لکھ کر دوں۔''

''نہیں' زبان سے کہہ دو۔ دل کے اسٹامپ پر لکھ لوں گا۔''

"چلیں بھاگیں یہاں سے، مت تنگ کریں میری بھابھی کو۔" وہ ٹرالی میں کپ رکھنے لگی۔

چائے کے بعد آنٹی نے اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنادی۔ شاید وہ گھر سے یہ سب طے کر کے آئے تھے۔ اس کا دل انوکھے انداز میں دھڑک رہا تھا۔ فریدوں ہمیشہ سے ہی اس کے قریب تھا لیکن آج تو جیسے اور بھی قریب ہو گیا تھا۔ لالہ اور آپا کے ساتھ مل کر اس نے سب سمیٹ لیا تھا۔ صرف ٹیبل پر ہومی کے کھانے کا کچھ سامان پڑا تھا کیونکہ وہ پڑوس میں اپنے دوست کو کیک دینے چلا گیا تھا۔

کچن کا دروازہ بند کر کے وہ کمرے میں آئی تو مسز فاروق بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ امثل!" وہ ان کے بیڈ کے سامنے ہی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

"میں نے تمہاری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ تم سے پوچھے بغیر کر دیا۔ دراصل شمی نے مجھے مہلت ہی نہیں دی اور سچ یہ ہے کہ میری اپنی بھی یہی خواہش تھی۔ تمہیں کوئی اعتراض۔"

"ماما!" اس نے حیران سا ہو کر انہیں دیکھا، وہ بے حد سنجیدہ لگ رہی تھیں۔

"مجھے آپ کے کسی فیصلے پر کوئی اعتراض کیسے ہو سکتا ہے۔ البتہ آپ شادی کے لیے جلدی نہیں کریں گی۔ میں فی الحال شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے امثل! اور میری خواہش ہے کہ میں اپنی زندگی میں ہی تمہیں اپنے گھر کا کر دوں۔"

"ماما پلیز...... میں آپ کو اور ہومی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔ میں نے فریدوں سے بات کر لی ہے۔ یوں بھی فریدوں بھی لالہ کی شادی سے پہلے......"

"خیر اس پر پھر بات کریں گے، اس وقت مجھے تم سے کچھ اور بھی پوچھنا ہے۔" مسز فاروق نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کیا؟" اس نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"تم پچھلے دنوں نینی کی طرف گئی تھیں؟" امثل کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس نے سر جھکا لیا۔

"کیوں گئی تھیں تم وہاں؟" ان کا لہجہ خوفناک حد تک سنجیدہ تھا۔ "میں نے تمہیں منع کیا تھا، سمجھایا تھا کہ تمہیں وہاں کبھی نہیں جانا۔ جب تمہارے پاپا زندہ تھے تب اور اب جب وہ زندہ نہیں تو تب بھی میں نے تمہیں نینی کی حقیقت بتادی تھی۔ حالانکہ اس میں خود میری بھی رسوائی تھی۔ وہ میری بہن ہے اور تم میرے متعلق بھی کچھ غلط سوچ سکتی تھیں پھر بھی میں نے تمہیں حقیقت بتادی، محض اس لیے کہ تم نینی سے بہت مانوس تھیں۔ آٹھ برس تک نینی نے تمہاری پرورش کی اور اس کی وجہ میں نے تمہیں بتادی تھی کہ میں بیمار تھی اور میں مجبور ہو گئی تھی کہ تمہیں اماں اور نینی کے پاس چھوڑنے کو، ورنہ تم جانتی ہو کہ تمہارے پاپا کی سوسائٹی میں کتنی عزت اور

مقام تھا۔ گو کہ وہ بہت دولت مند تھے پھر بھی، اور جب میں تمہیں سنبھالنے کے قابل ہوئی تو لے آئی۔ اگر تمہارے پاپا کے والدین یا بہن بھائی ہوتے تو میں کبھی بھی تمہیں اماں کی طرف نہ چھوڑتی۔" انہوں نے ایک نظر سر جھکائے بیٹھی امثل پر ڈالی۔

"نینی کی تمہارے ساتھ محبت ایک فطری بات ہے لیکن تمہاری ہی بہتری کے لیے اس نے کبھی تم سے ملنے کی ضد نہیں کی۔ جب دل چاہا، سال دو سال بعد یہاں آ کر تم سے مل لیا۔ کبھی تمہیں گھر لے کر نہیں گئی پھر بھی تم اس کی طرف چلی گئیں۔"

"سوری ماما! دراصل......"

"امثل! نینی نے آج صبح مجھے فون کیا تھا کہ تم پچھلے دنوں پانچ چھ دفعہ اس کی طرف گئی ہو اور وہاں سے ڈریس چینج کر کے کہیں اور......"

"کہاں...... امثل! مجھے اور تمہارے پاپا کو تم پر ہمیشہ بہت اعتماد رہا۔"

"ماما!" اس نے تڑپ کر ان کی طرف دیکھا۔

"مجھے نینی کی بات پر یقین نہیں آیا تھا امثل!" ان کی آواز ڈھے سی گئی۔

"بالکل بھی نہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں تم سے کیا کہوں، کیا پوچھوں کہ تم ایک انتہائی ماڈرن ڈریس میں چند گھنٹوں کے لیے کہاں گئی تھیں۔ تم نے اماں اور نینی کے سامنے میرا سر جھکا دیا امثل!"

"ماما!" اس نے بے دردی سے اپنے ہونٹ کاٹے۔ "میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس پر آپ کو شرمندگی ہو۔"

مسز فاروق نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا۔ یونہی اس کے چہرے پر نظریں جمائے اسے دیکھتی رہیں۔ ان کے چہرے پر کرب سے لکیریں سی بن گئی تھیں اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

امثل کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسے کس طرح ماما کو مطمئن کرے۔

"اور اماں مجھ پر ہنس رہی تھیں۔" انہوں نے آہستگی سے کہا۔

"ان کی ہنسی کی آواز میں نے صاف سنی تھی امثل! یہ تم نے کیا کیا۔"

"ماما!" امثل کا ضبط جواب دے گیا۔

"ماما...... میں نے آپ کے لیے، آپ کی خاطر......"

"کیا کیا تم نے میری خاطر؟" ان کی آواز بلند ہو گئی۔ "کیا کیا تم نے بولو؟"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا ماما! کچھ نہیں۔"

آنسو امثل کے رخساروں پر بہنے لگے اور اس نے سچ میں تھوڑے سے جھوٹ کی آمیزش کر کے انہیں مطمئن کرنا چاہا۔

"میں...... میں تو پارٹ ٹائم جاب کرنا چاہ رہی تھی اور وہ جاب ایسی تھی کہ وہاں یہ لباس نہیں چل سکتا تھا۔ ایک ہوٹل میں ریسپشن کی جاب تھی۔ وہاں جینز پہننا ضروری تھی ماما! بہت اچھی سیلری تھی۔ میں نے سوچا تھا اس طرح میں کچھ رقم اکٹھی کرلوں گی اور آپ کا علاج"

"اس سے اچھا تھا کہ تم نے مجھے مرجانے دیا ہوتا۔"

"ماما!" وہ ان سے لپٹ گئی اور بری طرح رونے لگی۔

"ایسا مت کہیں پلیز مجھے معاف کردیں۔ پلیز ماما! مجھ سے غلطی ہوگئی۔"

"ثومی! مجھے چھوڑ دو پلیز۔" انہوں نے اس کی بانہیں اپنے گلے سے لگالیں۔

"اور جا کر آرام کرو۔"

"ماما! مجھ سے خفا مت ہوں۔" وہ سسکی۔

لیکن مسز فاروق اس کی بات کا جواب دیے بغیر لیٹ گئیں اور دیوار کی طرف کروٹ بدل لی۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی اور پھر اٹھ کر آنسو پونچھتے ہوئے ہومی کو آواز دی اور اپنے بیڈ پر لیٹ گئی۔ آنسو اس کے تکیے میں جذب ہونے لگے۔

آج کا دن کتنا خوش کن تھا۔

اور کتنا اذیت ناک بھی۔

آج اس کے اور فریدوں کے درمیان ایک بندھن بندھا تھا۔

اور اس زندگی میں پہلی بار ماما اس سے خفا ہوگئی تھیں۔ کاش...... اے کاش...... اس سے اتنی بڑی حماقت نہ ہوتی' وہ پھر آنسو بہانے لگی۔

❖❖❖

"بابا جان...... بابا جان......" درثمین خوشی سے تقریباً بھاگتے ہوئے ملک فیروز خان کے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ وہ موبائل پر کسی سے باتوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے موبائل آف کر کے اس کی طرف دیکھا۔

"کیا بات ہے ثمین؟"

"وہ...... وہ بابا جان! میرا رزلٹ آنا تھا آج۔"

"تو کیا رہا؟" انہوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ابھی عباس نے بتایا ہے فون پر' بہت اچھے نمبر ہیں میرے۔ اے پلس گریڈ ہے۔" پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان اس نے بتایا۔

"اچھا' مبارک ہو۔" وہ پھر سے نمبر ڈائل کرنے لگے۔

درثمین کا دل یکدم بجھ گیا اور اندر کھلتے خوشی کے پھول مرجھا گئے۔ کچھ دیر وہ یونہی کھڑی انہیں دیکھتی رہی کہ شاید وہ اس کی طرف متوجہ ہوں اور اس کی کامیابی کے متعلق کچھ کہیں لیکن وہ

بدستور موبائل پر مصروف تھے۔

"عباس کہہ رہے تھے کہ میرے نمبر اپنے کالج میں سب سے زیادہ ہیں۔"

انہوں نے صرف سر ہلانے پر اکتفا کیا' تب وہ مرے مرے قدموں سے باہر نکل آئی اور اپنے کمرے تک آتے آتے آنسو اس کی آنکھوں سے چھلک پڑے تھے۔

"بابا جان کو مجھ سے ذرا بھی پیار نہیں۔" وہ بیڈ پر تکیہ گود میں رکھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے ناحق اتنی محنت کی۔ "بابا جان کو تو ذرا بھی پروا نہیں کہ میں فیل ہو جاؤں یا پاس' اور سعدون کے لیے وہ کتنا پریشان تھے' اس کا رزلٹ اچھا نہیں تھا تو......"

تکیے پر دونوں کہنیاں رکھے وہ بڑی سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ شاید وہ بابا جان کی حقیقی بیٹی نہیں ہے' شاید میری اماں جان کی شادی بابا کے ساتھ شادی ہونے سے پہلے کہیں اور ہو چکی ہو اور میں اماں جان کے پہلے شوہر کی اولاد ہوں۔ تب ہی تو اس روز بابا جان کہہ رہے تھے کہ قصر زہرہ تمہاری اماں کا ہے۔

اور اس خیال سے جیسے اس کا دل پانی ہو کر بہنے لگا۔ بلا سے بابا جان اس سے بے نیاز رہتے تھے لیکن اسے ان سے بے حد محبت تھی۔ وہ ان کی توجہ کے لیے تڑپتی رہتی تھی۔ کچھ آنسو اس کی آنکھوں میں چمک رہے تھے اور کچھ رخساروں پر لڑھک آئے تھے۔ تب ہی کھلے دروازے میں عباس کا چہرہ نظر آیا اور اس کے ہاتھ میں ایک بے حد خوبصورت بکے تھا۔

"ویل ڈن لڑیا! مبارک ہو۔" اور پھر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی پریشان ہوگیا۔

"کیا ہوا ثمین! آپ کیوں رو رہی ہیں؟" پھول اس کے پاس رکھتے ہوئے وہ پریشانی سے اسے دیکھنے لگا۔ ثمین کے آنسو اور روانی سے بہنے لگے۔

"ثمین پلیز...... اس طرح مت روئیں۔ کیا ملک صاحب نے کچھ کہا ہے؟" وہ بے چین سا ہوگیا تھا۔

"نہیں۔" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا اور ہاتھوں کی پشت سے آنسو صاف کیے۔

"بابا مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتے عباس! کیا میں ان کی سگی بیٹی نہیں ہوں؟"

"آپ بہت فضول سوچتی ہیں ثمین!" عباس نے اطمینان بھرا سانس لیا۔

"نہیں عباس! پلیز سچ سچ بتائیں۔ آپ کو میری قسم! جھوٹ مت بولیے گا۔ کیا بابا جان میرے سگے باپ ہیں؟ کیا اماں جان کی پہلی شادی تھی بابا جان سے؟" اور عباس کے ہونٹوں پر ایک مدھم سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

"ہاں' سو فیصد۔ آپ بابا جان کی سگی بیٹی ہیں اور آنٹی کی پہلی شادی ہی ہوئی تھی ملک صاحب سے۔"

"آپ کو یقین ہے نا؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں' پورا۔'' عباس ابھی تک کھڑا تھا۔

''پھر بابا جان کو مجھ سے محبت کیوں نہیں ہے؟''

اور اس کے لہجے کی تڑپ نے عباس کے دل کو بھی تڑپا دیا اور وہ اس کے سامنے ہی بیٹھتے ہوئے سمجھانے کے سے انداز میں بولا۔

''ایسا نہیں ہے ثمین گڑیا! ملک صاحب کو آپ سے بہت محبت ہے' بہت چاہتے ہیں وہ آپ کو۔''

''لیکن انہیں میری کامیابی کی ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔ سچ بتائیں' اگر میری جگہ سعدی ہوتا تو کیا یہی ردعمل ہوتا۔ ایسا روکھا' اتنا اجنبی۔''

''نہیں' ایسا نہ ہوتا۔'' عباس نے ایک گہری نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔

''لیکن اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ انہیں آپ سے محبت نہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ سعدون لڑکا ہے اور اس کو ہی سارا بزنس سنبھالنا ہے' اس لیے وہ اس کی تعلیم پر زیادہ توجہ نہیں دیتے ہیں اور آپ کی ظاہر ہے ایف ایس سی یا بی ایس سی کے بعد شادی ہو جائے گی۔ آپ کو گھر سنبھالنا ہے۔''

''جی نہیں۔'' اس نے اسے ٹوک دیا۔

''مجھے نہیں کرنی شادی وادی۔'' اس کے رخساروں پر پھیلی شفق نے عباس کو محظوظ کیا۔

''اچھا' فی الحال تو یہ پھول قبول کریں اپنی کامیابی پر۔''

''تھینک یو۔'' اس نے بکے تھام لیا۔

''بہت خوبصورت پھول ہیں۔''

''شکریہ کہ آپ کو پسند آئے۔ ملک صاحب کہہ رہے ہیں کہ آپ شام کو سعدون اور میرے ساتھ جا کر اپنی پسند سے کوئی بھی خوبصورت سا گفٹ لے لیں۔''

''بابا نے ایسا کہا؟'' اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''ہاں۔''

''اور یہ پھول۔'' اس نے پھولوں کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ بھی ملک صاحب نے لانے کو کہا تھا آپ کے لیے۔''

گو کہ وہ یہ پھول اپنی مرضی اور خوشی سے لایا تھا لیکن اس وقت در ثمین کی آنکھوں میں جو چمک تھی' وہ اسے بہت بھلی لگ رہی تھی' اس لیے اس نے اس کے گمان کو جھٹلایا نہیں۔

''اور کیا تھا اگر بابا جان زبان سے بھی کچھ کہہ دیتے۔'' اس نے افسردگی سے سوچا لیکن پھر بھی اس کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

''لنچ کے بعد تیار رہیے گا' میں آ کر لے جاؤں گا۔'' عباس کھڑا ہو گیا۔

''آپ کے کالج کب کھل رہے ہیں؟''

''۲۲ اگست کو۔'' ثمین نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا پھر ہوسٹل ہی جانا ہے؟''

''ہاں' وہ تو جانا ہی ہے۔ بہر حال ابھی تو بیس دن ہیں...... اور یہ سعدون کہاں ہے' اس کا ٹیوٹر کہہ رہا تھا کہ وہ دل لگا کر نہیں پڑھ رہا' بہت سست ہو رہا ہے۔''

''اپنے کمرے میں ہے ناشتے کے بعد سے ہی۔ میں اپنے رزلٹ کا بتانے گئی تھی تو سو رہا تھا۔ عباس! میرا خیال ہے سعدی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں رہتی۔ جب سے چھٹیاں ہوئی ہیں' بہت سست رہنے لگا ہے۔''

عباس باہر چلا گیا تو وہ سوچنے لگی کہ وہ کیا خریدے۔

کوئی اچھا سا ڈریس۔ کوئی جیولری یا پھر...... یا پھر......!

''عباس سے کہوں گی وہ بتائیں۔''

عباس کی چوائس بہت اچھی ہے اور پھر وہ ہمیشہ صحیح مشورہ دیتے ہیں اور اگر عباس نہ ہوں تو......

تب ہی باہر سے عباس کی اونچی آواز سنائی دی تھی اور پھر تیز تیز قدموں سے سیڑھیوں سے نیچے اترنے کی دھمک۔

عباس تو کبھی اونچی آواز میں نہیں بولتے' وہ گھبرا کر ننگے پاؤں ہی باہر چلی آئی۔

''عباس...... عباس...... کیا ہوا؟''

اس نے گھبرا کر پوچھا۔ آخری سیڑھی پر کھڑے عباس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

''سعدون...... سعدون کے کمرے میں جائیں۔'' اور پھر تقریباً بھاگتے ہوئے ملک فیروز خان کے کمرے تک پہنچ کر انہیں آوازیں دینے لگا۔ اس نے مڑ کر سعدون کے کمرے کے کھلے دروازے کو دیکھا اور پھر بھاگتے ہوئے اندر آئی۔ سعدون بیڈ پر بے ہوش پڑا تھا۔

''سعدی...... سعدی......!'' اس نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اس کی پلکیں بند تھیں اور ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔

''سعدی!'' اس نے بے قرار ہو کر اس کے سینے پر کان رکھ کر دھڑکن سننا چاہی۔

دل کی دھڑکن بہت مدھم تھی۔

''سعدی......'' وہ اس کے ہاتھوں اس کی پیشانی اور چہرے کو چومتے ہوئے بے اختیار رونے لگی' تب ہی ملک فیروز خان اور ان کے ساتھ عباس اندر داخل ہوئے۔

''کیا ہوا' کیا ہوا سعدی پتر......! آنکھیں کھولو۔'' اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے فیروز خان' سعدون پر جھک گئے۔

''ڈاکٹر.....ڈاکٹر کو فون کرو عباس!'' انہوں نے مڑ کر عباس کو دیکھا۔

''کر دیا ہے۔'' عباس ان سے زیادہ گھبرایا ہوا تھا اور ضبط کے باوجود اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور اس کی نم آنکھیں دیکھ کر ثمین کا ضبط تو بالکل ہی جواب دے گیا۔ اسے اپنی چیخوں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ ملک فیروز خان نے جو سعدون کا ہاتھ پکڑے اس کی ہتھیلیاں سہلا رہے تھے، مڑ کر اسے دیکھا۔

''اپنے کمرے میں جاؤ ثمین!''

''بابا.....سعدی.....''

''عباس! اسے سمجھاؤ، دعا کرے، روئے مت۔'' ملک فیروز خان کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔ تب بمشکل اپنی چیخیں اور سسکیاں روکتی ہوئی وہ زیرِ لب دعا مانگنے لگی۔ سعدون اسی طرح بے سدھ پڑا تھا۔ ڈاکٹر عامر فوراً ہی آ گئے۔

انہوں نے انجکشن دیا، کچھ دیر انتظار کیا اور پھر ہاسپٹل لے جانے کا مشورہ دیا۔

''بے ہوشی کی نوعیت کا اندازہ تو ہاسپٹل میں مختلف ٹیسٹوں سے ہی ہو گا۔''

''سعدی.....سعدون ٹھیک تو ہو جائے گا؟'' ملک فیروز خان بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھ رہے تھے اور ضبط کی کوشش میں نڈھال ہو رہے تھے۔

''ان شاءاللہ۔'' ڈاکٹر عامر نے انہیں تسلی دی۔ ''آپ پریشان نہ ہوں، اچانک کمزوری کا اٹیک بھی ہو سکتا ہے۔''

عباس نے بے ہوش سعدون کو دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا تھا۔ اور وہ ننگے پاؤں ہی اس کے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی اور اس کے لبوں پہ دعائیں تھیں۔ اور اس کی دعائیں سن لی گئی تھیں کہ ہاسپٹل پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہی سعدون نے آنکھیں کھول دیں لیکن ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ وہ بارہ گھنٹے اسے انڈر آبزرویشن رکھیں گے تاکہ پتا چل سکے کہ بے ہوشی کی وجہ کیا تھی۔

وہ ہراساں سی سعدون کے بیڈ کے پاس کھڑی اسے دیکھ رہی تھی۔ کتنا کمزور لگ رہا تھا وہ۔ رنگت بھی پہلے جیسی نہیں رہی تھی۔

''کہیں اسے کوئی خطرناک بیماری نہ ہو گئی ہو، بلڈ کینسر یا ایسے ہی کچھ۔''

اس کا دل بڑے زور سے لرزا اور وہ یکدم گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی اور سعدون کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، وہ خاموش لیٹا تھا۔

''سعدی.....سعدی..... کیا ہوا ہے تمہیں، کہیں درد ہو رہا ہے کیا؟'' سعدون نے نفی میں سر ہلایا۔ تب ہی ملک فیروز خان کمرے میں داخل ہوئے اور سعدون کے سرہانے کی طرف کھڑے عباس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔

''عباس! کچھ ٹیسٹ ڈاکٹر نے لکھ کر دیے ہیں، یہ تو یہاں سے ہو جائیں گے لیکن میں چاہتا

ہوں، تم ڈاکٹر مصطفیٰ احمد سے بھی وقت لے لو تو انہیں بھی دکھا لیتے ہیں۔ یوں ڈاکٹر فرخ نے بہت تسلی دی ہے کہ خطرے کی کوئی بات نہیں لیکن پھر بھی۔''

تب ان کی نظر گھٹنوں کے بل بیٹھی ثمین پر پڑی جس نے سعدون کے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا اور اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

''اور ہاں، پہلے تم ثمین کو گھر چھوڑ آؤ۔''

''بابا! میں یہیں رہوں گی سعدی کے پاس۔'' اس نے ملتجی نظروں سے ملک فیروز خان کی طرف دیکھا۔

سوجی ہوئی آنکھیں، بھیگی پلکیں، التجا کرتی ہوئی ثمین۔

ان کی نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ وہ کھڑی ہو گئی۔

''بابا پلیز، مجھے ادھر ہی رہنے دیں، سعدی کے پاس۔''

ملک فیروز خان کی نظریں اس کے ننگے پاؤں پر جم گئیں اور زہرہ جمال ان کے تصور میں چلی آئی۔ تب ثمین سال بھر کی تھی کہ جانے کیسے کاٹ سے نیچے گر گئی، اس کا سر پھٹ گیا تھا اور وہ یونہی ننگے پاؤں اسے گود میں اٹھائے ہاسپٹل بھاگی چلی آئی اور ٹانکے لگنے کے بعد ملک فیروز خان کی نظر ان کے پاؤں پر پڑی تھی۔

''زہرہ! تم ننگے پاؤں۔''

''یہ اولاد ایسی ہی ظالم ہوتی ہے فیروز خان۔'' وہ تو آفس سے اس کے فون کرنے پر سیدھے ہاسپٹل آئے تھے اور زہرہ ایمرجنسی روم کے باہر دیوار سے سر ٹکائے زار و قطار رو رہی تھی اور عباس پاس کھڑا اسے مسلسل تسلیاں دے رہا تھا۔

''اور ثمین نے ماں کو ہوش سنبھالنے کے بعد نہیں دیکھا پھر بھی وہ کئی باتوں میں زہرہ جمال سے ملتی ہے۔''

ایک گہری سانس لیتے ہوئے انہوں نے ثمین کو تسلی دی۔

''ٹیک اٹ ایزی۔ سعدون ابھی ٹھیک ہے۔ چند ایک ٹیسٹ بھی ڈاکٹر نے یوں ہی محض تسلی کے لیے کہے ہیں۔ ہم رات کو آ جائیں گے۔''

اور وہ مڑ مڑ کر سعدون کو دیکھتی عباس کے ساتھ باہر آ گئی۔

عباس بے حد سنجیدہ تھا۔ وہ بھی سارا وقت خاموش بیٹھی بار بار امڈتے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کرتی رہی اور گھر پہنچ کر اسے باہر ہی چھوڑ دینے کے بجائے عباس اس کے ساتھ اندر تک چلا آیا۔

''آپ کو واپس ہاسپٹل نہیں جانا؟'' اسے اپنے ساتھ اندر آتے دیکھ کر ثمین کو حیرت ہوئی۔

''جانا ہے۔''

عباس نے ایک نظر اسے دیکھا اور بغیر تبصرہ کیے ٹی وی لاؤنج میں ایک لمحے کو ٹھہرا۔
''بیٹھ جائیں ثمین!'' سیڑھیوں کی طرف جاتی درثمین رک کر اسے دیکھنے لگی۔
''مجھے کچھ کہنا ہے آپ سے۔''
''کیا......؟'' اس کا دل یکدم زور سے لرزا اور وہ وہاں پڑے صوفے پر بیٹھ گئی۔
اس کی سوالیہ نظریں عباس کی طرف اٹھیں۔
''دیکھیں ثمین! یہ زندگی بہت مشکل ہے۔ اس میں بعض اوقات بڑے مشکل مقام آتے ہیں اور آدمی کو حوصلے اور ہمت سے کام لے کر ان مقامات سے گزرنا چاہیے۔ آپ اتنی سی بات پر گھبرا گئیں۔ کبھی اس سے مشکل مرحلہ آیا تو کیا کریں گی؟ آپ کو اپنے اندر وہ حوصلہ پیدا کرنا چاہیے جو......''
''خدا کے لیے آپ یہ لیکچر بند کریں۔ مجھے یہ بتائیں' سعدون کو بلڈ کینسر ہے کیا؟'' اس کی آواز اندر کے اضطراب کی وجہ سے قدرے بلند تھی۔
''خدا نہ کرے۔'' عباس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''تو پھر یہ لیکچر دینے کا کون سا موقع ہے۔ یہ وعظ بعد میں بھی کسی وقت کر سکتے تھے۔ جب بات خونی رشتوں کی ہو تیمور عباس! تو سارے حوصلے اور سارے صبر جواب دے جاتے ہیں مگر آپ کو کیا پتا۔'' عباس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا۔ ہونٹ بھینچ کر اس نے اپنے اندر کے ابال پر قابو پانے کی کوشش کی۔
''ہاں بھلا مجھے کیا پتا درثمین...... لیکن گڑیا! میں نے آپ سے' سعدون سے اور ملک صاحب سے خونی رشتوں سے بڑھ کر محبت کی ہے۔'' وہ یکدم مڑا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں اور اندر کہیں تہی دامنی کا' اکیلے پن کا' تنہائی کا احساس پوری شدت سے ابھرا تھا جو اس سے پہلے اتنی شدت سے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔
''سوری۔'' درثمین کو احساس ہوا کہ اسے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ انجانے میں اس کے کئی زخموں کے ٹانکے ادھڑ گئے تھے۔ وہ کون تھا' اس کے والدین کون تھے اور وہ یہاں کیوں تھا۔ یہ لوگ...... ان سے بھلا اس کا کیا رشتہ تھا' کچھ بھی نہیں۔
''عباس! پلیز۔'' درثمین نے اسے خاموش کھڑا دیکھ کر ہولے سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
''میں تو ایسے ہی بلا سوچے سمجھے بولتی رہتی ہوں' ورنہ ہم...... میں اور سعدون بھی آپ سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں' جتنی آپ ہم سے۔ آپ نے ہمیں بابا جان سے زیادہ محبت دی ہے اور ہمیں بھی شاید بابا جان سے زیادہ محبت ہے آپ سے۔'' اس نے نرمی سے اپنے بازو سے اس کا ہاتھ ہٹایا۔

''اٹس او کے۔'' اس کی نظریں درثمین سے ملیں جو حیران سی اپنے ہاتھ کو دیکھ رہی تھی۔ یہ کیسا لمس تھا جس نے پورے وجود میں کرنٹ دوڑا دیا تھا۔
وہ یکدم ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور عباس نے بھی اپنی نظریں جھکا لیں۔ اندر کہیں دل بہت زور سے دھڑکا تھا اور اس نے دل کو بری طرح ڈپٹ کر لہجے کو قدرے خوشگوار بنانے کی کوشش کی۔
''ناؤ ریلیکس گڑیا! پریشان مت ہوئیے گا' میں وہاں سے فون کرتا رہوں گا۔'' اور پھر اس کی طرف دیکھے بغیر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔
وہ پیچھے ہٹ کر صوفے پر بیٹھ گئی۔
عفیرہ کے ریمارکس ذہن میں گونجے۔
''یار! یہ تیرا کزن بڑا زبردست ہے۔''
''ایسا شاندار کزن ہو تو......'' دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔
''نہیں۔''
اپنی ہی سوچ پر وہ حیران سی بیٹھی رہ گئی تھی۔

امثل نے وقت دیکھا اور پھر ارد گرد کی میزوں پر نظر دوڑائی۔ قریبی دفتروں سے کچھ لوگ لنچ بریک میں ادھر آ جاتے تھے' لیکن چونکہ ابھی لنچ بریک میں کچھ وقت تھا' اس لیے اکا دکا میزوں پر کچھ لوگ تھے۔
کالج کے یونیفارم میں ملبوس لڑکی والی ٹیبل پر کولڈ ڈرنکس پڑی تھیں اور لڑکا اس کی طرف جھکا کچھ کہہ رہا تھا۔
''اور کتنی ناعاقبت اندیش ہوتی ہیں یہ لڑکیاں جو والدین کے اعتماد کو دھوکا دیتی ہیں اور خود اپنے ہاتھوں اپنی زندگیاں تباہ کر لیتی ہیں۔''
''اور کیا تم ناعاقبت اندیش نہیں ہو امثل فاروق! جو کچھ تم نے کیا' کیا وہ صحیح تھا؟'' اس کے دل نے چپکے سے کہا۔
''لیکن میں نے کسی غلط مقصد کے لیے وہ سب کچھ نہیں کیا تھا۔ مجھے ماما کا علاج کروانا تھا اور......'' اس نے کمزور سا جواز پیش کیا جس پر دل ہولے سے ہنسا۔
''تم نے بہت غلط کیا امثل فاروق! اور اس غلطی کا کیا خمیازہ بھگتنا پڑے گا' یہ آنے والا وقت بتائے گا تمہیں بلکہ ابھی جو تم یہاں موجود ہو' یہ بھی تو......''
وہ آج آفس سے جلدی اٹھ کر اس ریسٹورنٹ میں آ گئی تھی جہاں ملنے کو کاظم جہانداد نے کہا تھا۔ کبھی سوچتی' نہ جانے وہ کیا کرے گا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ مکر جائے کہ یہ لڑکی وہ نہیں تھی

لیکن کاظم جہانداد کا پُر یقین لہجہ پُر اسرار مسکراہٹ۔نہیں وہ اس سے نہیں بچ سکتی۔وہ تو اس کے آفس تک سے باخبر ہے' وہ کسی اسکینڈل کی متحمل نہیں ہوسکتی۔اگر وہ اس کے آفس تک چلا آیا تو......نہیں' مسلسل ایک عذاب سے بہتر ہے کہ وہ ایک ہی بار اس تکلیف سے گزر جائے اور کاظم جہانداد سے مل کر پوچھ لے کہ وہ کیا چاہتا ہے اور کیوں اس کا تعاقب کر رہا ہے اور شکر تھا کہ آج فریدوں بھی آفس نہیں آیا تھا ورنہ ضرور جلد چھٹی کی وجہ پوچھتا اور فریدوں سے جھوٹ بولنا اور کچھ چھپانا اسے بہت مشکل لگتا تھا بلکہ ناممکن۔

''ہیلو میم!''

تب ہی بالکل اس کی ٹیبل کے پاس آ کر کاظم جہانداد نے بے تکلفی سے کہا تو اس نے چونک کر کالج گرل سے نظریں ہٹائیں۔کاظم جہانداد کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

''مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گی۔''

''میں اس سب کا مقصد پوچھ سکتی ہوں مسٹر!''

''کاظم جہانداد۔'' وہ مسکرایا اور ہاتھ میں پکڑا موبائل ٹیبل پر رکھا۔

''مقصد کیا آپ نہیں جانتیں مس......'' اس کی تیز نظریں امثل کو اپنے وجود میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔

''بہرحال بتائے دیتا ہوں کہ مجھے آپ کی اس اسٹوری سے دلچسپی ہے جسے آپ میرے ڈیڈ کو فروخت کرنے آئی تھیں۔''

''کون سی کہانی اور آپ کے ڈیڈ کون ہیں' میں نہیں جانتی۔''

''آہا......'' کاظم نے قہقہہ لگایا۔پسینہ امثل کے جسم کے ہر مسام سے چھوٹ پڑا تھا۔

''معصوم مت بنیے۔آپ کا یہاں آنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ وہی لڑکی ہیں جو ڈیڈ کے پاس ایک کہانی لے کر گئی تھیں۔'' اور امثل کو یکدم یہاں آنے کے فیصلے پر افسوس ہوا۔

''اور اگر آپ یہاں نہ بھی آتیں۔'' کاظم جیسے اس کے خیالات پڑھ رہا تھا۔

''تب بھی آپ کاظم جہانداد کی نظروں سے چھپ نہیں سکتی تھیں۔میں کسی لڑکی کو ایک نظر دیکھ لوں تو لاکھوں کے ہجوم میں اسے پہچان سکتا ہوں۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں مجھ سے؟'' امثل نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''یہ ہوئی نا بات۔'' اس نے چٹکی بجائی اور بیرے کو اشارے سے بلا کر کولڈ ڈرنکس لانے کو کہا۔

''مجھے وہ اسٹوری چاہیے۔''

''اسٹوری' کوئی ایسی خاص نہیں۔'' اس کا حلق خشک ہونے لگا۔

''مجھے پتا چلا تھا کہ ملک فیروز خان نے ایک ماڈل گرل سے شادی کی تھی۔میں چند ماہ پہلے

تک ایک مقامی اخبار میں کام کر رہی تھی' وہیں ذکر ہوا تھا۔وہ اخبار' یونو'' ندا'' ہفت روزہ ہے اور......''

''اچھا' وہ سلیمی بلیک میلر؟''

''جی......سلیمی صاحب بھی ادھر اسی اخبار میں ہوتے ہیں۔'' امثل بہت مضطرب سی ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

''اور یہ بھی کہ ملک صاحب کے پردادا لے پالک تھے۔میں نے......میں نے سوچا یونہی شاید اس طرح کچھ پیسہ مل جائے' ورنہ کہانی تو کچھ نہ تھی۔''

''اپنے رویوں سے تو آپ پیسے کی لالچی نہیں لگتیں۔'' کاظم بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''اصل بات بتائیں۔''

''یہی بات ہے' پلیز آپ یقین کریں۔دراصل میری ماما بیمار ہیں' ان کا ایک گردہ خراب ہو چکا ہے اور دوسرا بھی......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''میرے والد کا انتقال ہو چکا ہے اور میں نے......میں نے یہ پلان بنایا کہ اس طرح شاید میں کچھ رقم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔''

''لیکن جس کہانی کے بل بوتے پر رقم حاصل کرنے ڈیڈ کے پاس آئی تھیں' اس میں تو کوئی جان نہیں ہے۔یہ تو اکثر لوگوں کو معلوم ہوگا۔'' آنسو اس کی آنکھوں میں چمکنے لگے تھے۔

''آپ شکل سے تو اتنی بے وقوف نہیں لگتیں۔'' کاظم کی نظریں ہنوز اس کے چہرے پر تھیں۔

''پلیز بلیومی' میں نے ماما کی خاطر......'' آنسو اس کے رخساروں پر پھیلے تو اس نے چہرہ جھکا لیا۔

کاظم کو لگا یہ لڑکی سچ کہہ رہی ہے۔اس نے یقیناً اپنی بیمار ماں کی خاطر ہی یہ سب کیا ہوگا لیکن یہ لڑکی ان ساری لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی جو اب تک اس کی زندگی میں آئی تھیں۔بہت خالص اور بہت معصوم لگ رہی تھی وہ۔اس کی ایک تیز نظر سے اس کے چہرے پر جو رنگ آ رہے تھے' وہ رنگ اس سے پہلے کبھی کاظم نے نہیں دیکھے تھے۔

''اگر آپ کی بات سچ مان بھی لی جائے میم! تو وہ ٹینشن جو ڈیڈ کو ہوئی اور جس کی وجہ سے ان کی الیکشن کمپین متاثر ہوئی' اس کا کیا ہرجانہ دیں گی آپ؟''

''ہرجانہ......میں......'' امثل کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

یہ تو وہی ہوا تھا کہ گئے تھے نماز بخشوانے' الٹے روزے گلے پڑے۔اس نے اس لمحے پر لعنت بھیجی جب یہ بے ہودہ خیال اس کے دل میں آیا تھا۔

''ہاں ہرجانہ......ظاہر ہے' ڈیڈ ٹینشن کی وجہ سے توجہ نہیں دے سکے اپنے جلسوں پر۔''

''نہیں' یہ غلط ہے۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میری ماما بیمار ہیں' والد فوت ہو چکے ہیں۔ میرے پاس اگر رقم ہوتی تو میں اسے حاصل کرنے کے پلان کیوں بناتی۔ میری جاب بہت معمولی سی ہے۔ مسٹر! آپ زیادتی کر رہے ہیں۔'' اس کی پیشانی کی شکنیں اس کے اندر کے اضطراب کا پتا دے رہی تھیں۔

''آپ تو خود بڑی امیر ہیں' سرتاپا۔'' کاظم کی نظریں جیسے اس کے وجود میں کھب گئیں' وہ اپنے آپ میں سمٹ گئی۔

''کچھ وقت عنایت کر دیجئے گا' یہ ہی ہرجانہ ہے۔''

''شٹ اپ۔'' اشل کی قوت برداشت ختم ہو گئی۔

''آپ غلط سمجھ رہے ہیں مجھے۔ میں اس طرح کی لڑکی نہیں ہوں۔''

فوراً ہی اس نے غصے پر قابو پانے کی کوشش کی اور کھڑی ہو گئی اور تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے باہر نکل گئی۔ کاظم اس کی پشت پر نظریں جمائے اسے دیکھتا رہا۔

''لڑکی' تمہارا ہر انداز قاتلانہ ہے۔ چوہدری جہانداد کے سامنے بیٹھی اعتماد سے بات کرتی' بےبسی سے روتی ہوئی اور غصے سے تپی ہوئی۔

تب ہی موبائل کی بپ ہوئی' اس نے نمبر دیکھا نومی کا تھا۔

اس نے موبائل آف کر دیا۔ یکا یک وہ نومی سے بیزار ہو گیا تھا اور اس سے اس کی دلچسپی بالکل ختم ہو گئی۔

''یہ تو کمبل ہی ہو گئی ہے۔'' اور اتنے دنوں میں وہ ایک لاکھ سے زیادہ اس پر خرچ کر چکا تھا۔

''ناؤ اٹس ٹو مچ۔'' وہ موبائل اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔

''اب تمہاری چھٹی ہوئی میڈم نومی۔'' اور اس کے تصور میں اشل آ گئی۔

دلکش' خوبصورت' معصوم' ننھی سی چڑیا۔

''ایک دن تم میرے جال میں پھنسی ہو گی۔''

وہ ہنسا اور پلیٹ میں بل کی رقم ڈال کر باہر نکل گیا۔

❖❖❖

مسز فاروق بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں اور ان کے بالکل سامنے کرسی بچھائے ان کی بڑی بہن نینا بیٹھی تھی۔

''رحمو بہت بیمار ہے اور تم سے ایک بار ملنا چاہتا ہے۔''

''میں نے کہا نا نینی! کہ میں اب وہاں نہیں جاؤں گی۔ میں نے اماں سے کہا تھا کہ دوبارہ اس دہلیز پر قدم نہ رکھوں گی' سوا اپنے عہد پر قائم ہوں۔''

''اور رحمو کی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ یہاں آئے۔'' نینی نے آہستگی سے کہا۔

''لیکن وہ کیوں ملنا چاہتا ہے مجھ سے' کوئی وجہ تو ہو۔''

''پتا نہیں' اس نے وجہ نہیں بتائی لیکن وہ پچھلے ایک ہفتے سے میری منت کر رہا ہے کہ ایک بار' صرف ایک بار بے بی سے ملوا دو۔ میں نے فون پر تم سے بات کی' تو تم نے انکار کر دیا آنے سے' اس لیے خود چلی آئی۔''

رحمو کو اس نے ہوش سنبھالتے ہی اماں کے ساتھ ہی دیکھا تھا۔ جوانی میں طبلہ بجاتا تھا' بعد میں گھر کا سودا سلف لانے اور دوسرے کاموں پر مامور ہو گیا تھا۔ چھوٹا ملازم لڑکا نہ ہوتا تو چائے بھی وہی سرو کر دیتا۔ ٹرالی سجا کر لے آتا۔ علاوہ ازیں لڑکیوں کو اسکول و کالج پہنچانے کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔ فاروق مرزا سے شادی کے بعد انہوں نے رحمو کی شکل نہ دیکھی تھی۔ اماں نے جس طرح اس شادی کی مخالفت کی تھی اور ہر ممکن طریقے سے اسے شادی سے روکا تھا بلکہ یہاں تک کہا تھا کہ ''ایک دن پھر یہاں آؤ گی تو میرے گھر کے دروازے بند ہوں گے'' اور انہوں نے اماں سے کہا تھا۔

''میں پھر کبھی اس در پر نہ آؤں گی' چاہے کچھ ہو جائے۔'' سوا پنے عہد پر قائم تھیں۔ فاروق کی وفات کے بعد کئی مشکل لمحے بھی آئے تھے' لیکن انہوں نے مڑ کر پیچھے نہیں دیکھا تھا۔ نینی سے البتہ فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ نینی کا دل جب اشل سے ملنے کو چاہتا تو دو تین ماہ بعد چکر لگا جاتی تھیں کہ اشل کو نو دس سال کی عمر تک نینی نے ہی پالا تھا اور مسز فاروق' نینی کو منع نہ کر سکتی تھیں لیکن اشل کو انہوں نے نینی اور اماں سے ملنے کو منع کر رکھا تھا اور اب رحمو کا ان سے ملنے کی خواہش کرنا یقیناً اچنبھے کی بات تھی۔

''تو پھر کیا کہوں رحمو سے؟'' نینی نے انہیں سوچ میں ڈوبے دیکھ کر پوچھا۔

''اگر وہ یہاں آ سکے کسی طرح تو...... ورنہ میں گھر نہیں آؤں گی۔''

''تمہارا اماں سے ملنے کو دل نہیں چاہتا؟''

''نہیں۔'' انہوں نے سختی سے کہا۔

''آخر انہوں نے تمہیں جنم دیا ہے۔ پالا پوسا' پڑھایا لکھایا۔''

''اس کے لیے میں ان کی احسان مند ہوں نینی!'' مسز فاروق بہت سنجیدہ تھیں۔

''اگر اماں مر گئیں تو تمہیں افسوس نہیں ہو گا؟''

''پتا نہیں۔'' وہ اپنے تاثرات چھپا گئیں۔

''شاید تم اپنی جگہ صحیح ہو' اماں نے واقعی تمہارے ساتھ اچھا نہیں کیا۔ کبھی کبھی میں سوچتی ہوں اماں اگر اس روز......''

''پلیز نینی! جو باب ختم ہو چکا' اسے مت کھولو۔'' اماں کو بھلا اس سے کیا فائدہ ہوا' تم تو پھر

بھی ان کے ہاتھ نہ لگیں۔'' نینی عجیب طرح سے ہنسیں اور کھڑی ہوگئیں۔

''اچھا میں اب چلتی ہوں۔ رحمو کی طبیعت اگر سنبھلی تو اسے لے کر آؤں گی۔''

''کیا اماں کو پتا ہے' تمہارے یہاں آنے اور رحمو کی خواہش کا؟'' مسز فاروق نے اچانک پوچھا۔

''نہیں' رحمو نے منع کیا تھا اماں کو بتانے سے اور جب میں یہاں آتی ہوں تو اماں کو پتا نہیں ہوتا۔ اماں زیادہ تر اوپر ہوتی ہیں اور رحمو نیچے ہوتا ہے گیراج میں۔'' نینی نے تفصیل بتائی۔

''رحمو کو ایسے وقت لانا جب بچے گھر پر نہ ہوں۔'' نینی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''ہمایوں کیسا ہے؟''

''اچھا ہے۔''

''امثل کو بہت محبت ہے اس سے؟''

''ظاہر ہے بھائی ہے اس کا۔''

''امثل سے پوچھا تھا تم نے؟''

''ہاں' پاگل ہے وہ۔ کسی ایسی جاب کے لیے جا رہی تھی جہاں کا تقاضا اس طرح کا ڈریس تھا۔'' انہوں نے تفصیل بتائی۔

''پھر.....'' نینی نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ ''میں نے منع کر دیا۔''

''کتنی خوش قسمت ہو تم۔'' نینی کی آواز میں حسرت تھی۔

''کتنی محبت کرتی ہے امثل تم سے۔ کاش تم امثل کو واپس نہ لیتیں۔'' مسز فاروق نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اچھا میں چلتی ہوں۔''

''اللہ حافظ۔'' مسز فاروق اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

''کچھ رقم کی ضرورت ہو تو.....'' نینی جاتے جاتے مڑیں۔

''نہیں۔'' مسز فاروق نے انکار کر دیا۔

''اتنی غیرت کیوں برتتی ہو؟'' نینی نے شکوہ کیا۔

''میرے پاس میرے ذاتی اکاؤنٹ میں کچھ رقم ہے۔ اماں کا اس سے کوئی واسطہ نہیں۔ ایک بار منیر خان نے کچھ رقم میرے لیے اکاؤنٹ کھلوا کر جمع کروائی تھی اور اماں کو بتانے سے منع کیا تھا کہ مشکل وقت میں کام آئے گی۔''

''منیر خان تمہارے ساتھ مخلص تھا؟''

''پتا نہیں' میں رسک لے کر اماں کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی پھر وہ پہلے سے شادی شدہ اور بچوں کا باپ تھا۔''

''کیا اب بھی آتا ہے تم سے ملنے؟''

''نہیں' اپنے بچوں کے پاس امریکہ چلا گیا ہے۔ کبھی مشکل پڑے تو جھجکنا مت۔'' مسز فاروق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اپنا خیال رکھا کرو' بہت کمزور ہوگئی ہو۔ دوا باقاعدگی سے لیا کرو۔'' مسز فاروق کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''امثل بہت خیال رکھتی ہے بلکہ اکثر آفس سے فون کر کے یاد کرواتی ہے دوا کے لیے۔'' ان کے چہرے پر مامتا کا نور تھا۔

''کب آتی ہے آفس سے؟''

''چار بجے تک۔''

''پھر تو ابھی دو گھنٹے ہیں' ورنہ مل کر چلی جاتی خیر پھر کبھی آؤں گی شام میں۔''

وہ ایک بار پھر خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر نکلیں اور صحن عبور کر کے گیٹ تک پہنچی ہی تھیں کہ دروازہ کھلا اور امثل شولڈر بیگ کندھے پر لٹکائے اندر داخل ہوئی۔ نینی کو دیکھ کر یکدم پہلے تو اس کا چہرہ چمک اٹھا پھر بجھ گیا۔ نینی بے اختیار اس کی طرف بڑھیں۔

''ناراض ہو میری جان؟''

''بس آپ مجھ سے بات نہ کریں خالہ! اک ذرا سی بات آپ اپنے دل میں نہ رکھ سکیں۔''

''میں ہزاروں باتیں اپنے دل میں رکھ سکتی ہوں جانی! لیکن یہ بات..... تمہارا وہ انداز' وہ طریقہ۔ کل کو کوئی بات ہو جاتی تو تمہاری ماما نے تو مجھے ہی موردِ الزام ٹھہرانا تھا نا۔''

''کیا آپ مجھے ایسی ویسی لڑکی سمجھتی ہیں؟''

''نہیں میری جان! تم کیا ہو' میں جانتی ہوں پھر بھی یہ ماحول' یہ دنیا' کچھ بھی اچھا نہیں ہے۔''

''ناؤلیواٹ' آیئے نا۔''

''نہیں' بہت دیر سے آئی ہوئی تھی' اب جا رہی ہوں۔ ابھی کچھ شاپنگ بھی کرنا ہے۔''

''اچھا۔'' امثل کچھ پریشان لگ رہی تھی۔ نینی نے غور سے اسے دیکھا۔

''طبیعت ٹھیک ہے تمہاری' آفس سے جلدی آ گئی ہو؟''

''جی' سر میں درد تھا اس لیے چھٹی لے لی۔''

''اپنی خالہ سے ناراض ہو؟''

''نہیں' آپ نے اپنے حساب سے ٹھیک ہی کیا جو ماما کو بتا دیا۔ میں ہی غلط تھی۔''

''ڈپریس مت ہو جانو! ٹھیک ہو جائے گا سب' میں ہوں نا۔ جب بھی کوئی مسئلہ ہو مجھے بتانا۔'' اس نے ایک تشکر بھری نظر ان پر ڈالی۔

''کمال ہے' مجھے نینی کا خیال ہی نہیں آیا۔''

''نینی تھیں' فریدوں تھا اور میں...... بلا سوچے سمجھے...... کیا کر ڈالا میں نے۔''

اس کی پیشانی چوم کر نینی باہر نکل گئیں تو گیٹ بند کر کے وہ اندر آئی۔ مسز فاروق کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اسے ایک نظر دیکھا۔

''ناراض ہیں ابھی تک؟'' وہ ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''پلیز ماما! اس طرح مت کریں۔ آپ کی ناراضی مجھ سے برداشت نہیں ہو رہی' میں......''

اس نے ہونٹ بھینچ کر آنسو روکنے کی کوشش کی لیکن دل تو بھرا ہوا تھا ہی' روکنے کے باوجود آنسو نہ رک پائے۔ مسز فاروق لحہ بھر اسے دیکھتی رہیں پھر ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ماں کے سینے سے لگ کر روتے ہوئے اسے لگا کہ صبح سے دل پر جو بوجھ پڑا تھا' کچھ کم ہو گیا ہے۔

❖❖❖

''سعدی! یہ تم نے کیا کیا' کیوں کیا ایسا؟''

درثمین' سعدون کے سامنے بیٹھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اور وہ ہاتھ گود میں دھرے خاموش بیٹھا تھا۔ چودہ پندرہ سالہ سعدون اس سے عمر میں دو سوا دو سال ہی تو چھوٹا تھا۔ گو اس کی عمر تو چودہ پندرہ سال تھی۔ وہ اس وقت نویں جماعت کا طالب علم تھا لیکن دیکھنے میں وہ اپنی عمر سے کم ہی لگتا تھا۔ بلا کی جاذبیت تھی اس میں۔

''میں نے کچھ نہیں کیا' مجھے کچھ نہیں پتا۔'' وہ رو دینے کو تھا۔

''ہاں ہاں' ہم سب جانتے ہیں سعدی! تم نے کچھ نہیں کیا۔ دراصل سر تنویر......''

''نہیں' پلیز ثمین! انہیں کچھ مت کہنا' وہ بہت اچھے ہیں' بہت اچھے ہیں اور مجھ سے تو بہت محبت کرتے تھے۔ بابا نے ان کے ساتھ اچھا نہیں کیا' بالکل بھی اچھا نہیں کیا۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگا۔

''نہیں سعدی! تم۔ بچے ہو' ابھی بہت چھوٹے ہو' تمہیں نہیں معلوم وہ اچھے آدمی نہیں تھے' وہ بالکل بھی اچھے آدمی نہیں تھے۔''

''میں بچہ نہیں ہوں۔'' اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا کر ثمین کو دیکھا۔

''پندرہ سال کا ہونے والا ہوں۔''

اور سر تنویر...... آپ کو یا بابا کو کیا پتا کہ وہ کیسے تھے۔''

''دیکھو سعدون! تم بچے نہیں ہو' اور اتنا تو جانتے ہو نا کہ نشہ کرنا بری بات ہے اور یہ تمہارے سر تنویر تمہیں نشے کے انجکشن لگاتے رہے تھے۔ تمہارے بازوؤں پر انجکشن کے نشان تھے اور پھر تمہاری بلڈ رپورٹ سے بھی پتا چلا کہ اس میں نشے......''

''جھوٹ بولتے ہیں ڈاکٹر اور آپ سب بھی' اور بابا جان کو تو پہلی ملاقات میں ہی سر تنویر اچھے نہیں لگے تھے' اس لیے کہ ان کی شکل اچھی نہیں ہے' وہ غریب ہیں' ان کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے لیکن ان کا دل بہت خوبصورت ہے' محبت کرنے والا دل......''

کم گو سا سعدون روانی سے بول رہا تھا اور درثمین حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ سر تنویر نے کتنی گہرائی تک اس کے دل میں جگہ بنا رکھی تھی کہ وہ یہ جاننے کے باوجود کہ سر تنویر اسے نشہ آور اشیاء کھلاتے اور کبھی کبھار انجکشن لگاتے رہے تھے' انہیں برا ماننے کو تیار نہ تھا۔

جب ڈاکٹرز نے بتایا کہ آپ کا بچہ نشہ کرتا ہے' خون میں اس کے اثرات موجود ہیں تو ملک فیروز خان کو کتنی ہی دیر تک یقین نہ آیا تھا۔

''کیسے' یہ کیسے ممکن ہے۔ گھر میں تمام ملازمین با اعتبار ہیں پھر......''

''اسکول میں کسی دوست کے ذریعے۔'' ڈاکٹر نے خیال ظاہر کیا۔

اور جب تحقیق کی گئی تو پتا چلا کہ سعدون کا تو کوئی دوست نہیں' نہ ہاسٹل میں' نہ کلاس میں۔ چھوٹی کلاس کے ایک بچے ہمایوں کے ساتھ کبھی کبھی وہ بریک میں بیٹھا ہوتا ہے۔

''اسکول میں یا ہوسٹل میں یہ نہیں ہو سکتا۔'' پرنسپل نے ملک فیروز خان کو یقین دلایا۔

''یہاں بہت سخت ڈسپلن ہے۔ ہاں ویک اینڈ میں آپ کا بچہ آپ کی اجازت سے ہوسٹل سے باہر جاتا ہے' شاید وہاں۔''

''کہاں' کہاں جاتا ہے وہ؟'' انہوں نے تیمور عباس سے پوچھا۔

''ایک بار اس کے ٹیچر نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ سعدون کو اپنے ساتھ گھر لے جانا چاہتے ہیں۔ اسکول کے عقب میں ان کا گھر ہے' خود سعدون بھی میتھس کے ٹیسٹ کی تیاری کرنا چاہتا تھا تو میں نے اجازت دے دی۔ بتایا تو تھا آپ کو۔''

''لیکن وہ تو ہر ویک اینڈ پر جاتا ہے۔'' وارڈن نے بتایا۔

''اس نے کہا تھا سر تنویر ان کے عزیز ہیں اور بابا جان نے اسے اجازت دے رکھی ہے۔''

''یہ ہے آپ کا ڈسپلن؟'' ملک فیروز خان تڑپ اٹھے تھے۔

''آپ اس ٹیچر کو یہاں سے نکال دیں پرنسپل صاحب!''

''میں ایسے کیسے نکال سکتا ہوں' اس کے لیے محکمانہ کارروائی ہوتی ہے۔'' پرنسپل نے معذرت کی۔

''چاہے بچوں کا اخلاق خراب ہوتا رہے۔'' ملک فیروز خان پیچ و تاب کھا رہے تھے۔

''ہماری مجبوری ہے سر! آپ اپلی کیشن دیں' ہم اوپر بھجوا دیں گے پھر محکمہ ثبوت بھی مانگتا ہے۔ آپ کے بچے کو گواہی دینا ہوگی کہ سر تنویر نے اسے نشہ آور اشیاء کھلائیں اور......'' ملک فیروز خان اٹھ کھڑے ہوئے۔

"شکریہ پرنسپل صاحب! میں خود ہی کچھ کروں گا اب۔"

اور پھر انہوں نے سب سے پہلے تنویر کے متعلق معلومات اکٹھی کیں۔ دو دن بعد ہی اس کی پوری زندگی کی رپورٹ ان کے سامنے تھی۔ اس کے والدین کون تھے' یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ ایک چنے فروخت کرنے والے نے اسے یتیم خانے سے لیا تھا' پڑھایا لکھایا' اس کا تعلیمی ریکارڈ اچھا تھا۔ اسے گود لینے والے اس کے والدین کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ یہاں آنے سے پہلے وہ ساہیوال کے ایک اسکول میں تھا' جہاں کچھ والدین نے اس کی شکایت کی تھی کہ وہ غیر اخلاقی حرکتوں کا مرتکب ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس کا تبادلہ یہاں کر دیا گیا تھا اور اس سے پہلے وہ ایک چک میں پڑھا رہا تھا' وہاں سے بھی اس کا تبادلہ اس کے خلاف شکایتوں کی بنا پر کر دیا گیا تھا۔ ایک بار وہ کچھ عرصہ تک ایک ماہر نفسیات کے پاس زیر علاج بھی رہا۔

اور کس قدر بے حس ہیں ہم کہ ایسے افراد جن کے ہاتھوں قوم کا مستقبل ہے' انہیں ہم نے ان کا مستقبل کو تباہ کرنے کے لیے کھلا چھوڑ رکھا ہے۔ بجائے اس کے ایسے افراد کو معطل کر دیا جائے' ان کا تبادلہ کر دیا جاتا ہے کہ وہ دوسری جگہ دوسرے بچوں کا اخلاق تباہ کریں۔ ملک فیروز خان کے اختیار میں ہوتا تو وہ سر تنویر کا گلا گھونٹ دیتے۔ سعدون ان کا اکلوتا بیٹا' ان کی تمام جائیداد اور دولت کا وارث اور...... انہوں نے اوپر تک تمام محکموں کو ہلا کر رکھ دیا اور نتیجتاً سر تنویر کا تبادلہ ایک اور دور دراز قصبے میں کر دیا گیا۔ وہ پیچ و تاب کھا کر رہ گئے اور انہوں نے کئی جگہ فون کھڑکائے۔

"آپ کا مسئلہ حل ہو گیا نا ملک صاحب!"

"ہاں لیکن آپ جانتے ہیں' وہ قوم لوط کا ایک فرد اب جا کر دوسرے بچوں کو تباہ کرے۔"

"ہاہاہا......" وزیر تعلیم نے قہقہہ لگایا۔

"ابھی تو آپ الیکشن میں کامیاب نہیں ہوئے اور ابھی سے آپ کے دل میں قوم کا درد جاگ رہا ہے۔" اور مارے غصے کے انہوں نے ٹیلی فون پٹخ دیا۔

"بہر حال میں دیکھ لوں گا اسے۔"

فی الحال انہیں سعدون کی فکر تھی۔ اسے کچھ دن ہاسپٹل میں رکھا گیا تاکہ اسے اس تکلیف سے نجات دلائی جائے جو نشہ نہ ملنے کی صورت میں اس کے جسم کو برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔ شروع میں تو وہ کچھ بتانے کو تیار ہی نہ تھا۔ ملک صاحب کے سامنے تو وہ ہونٹ سختی سے بھینچ لیتا اور خوف سے اس کا رنگ سفید پڑ جاتا تھا اور عباس کے سامنے بھی خاموش رہتا لیکن پھر عباس نے ہی اس سے باتوں باتوں میں سب کچھ اگلوایا تھا۔ وہ نشہ آور ادویات کے استعمال سے قطعی بے خبر تھا۔ اس کی لاعلمی میں کسی چیز میں شامل کر کے دی جاتی رہی تھیں یا پھر بے ہوشی کے عالم میں اسے انجکشن لگائے گئے تھے۔ کافی دن ہاسپٹل میں رہنے کے بعد وہ آج ہی گھر آیا تھا اور

بے حد چڑچڑا ہو رہا تھا۔ عجیب سی کیفیت تھی اس کی۔

اگرچہ عباس نے بہت ہولے ہولے' نرمی سے تنویر کے متعلق ہر بات اسے سمجھائی تھی کہ وہ کس قدر غلیظ آدمی تھا۔ وہ اس کا دوست نہیں' دشمن تھا پھر بھی وہ بہت ڈسٹرب تھا۔ وہ جب سے آیا تھا درثمین زیادہ تر اس کے پاس ہی رہتی تھی۔ اس وقت رات کے آٹھ بج رہے تھے۔

"مجھے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دو ثمین! میری نگرانی مت کرو۔"

"میں تمہاری نگرانی نہیں کر رہی سعدون! میں ویسے ہی تمہارے پاس رہنا چاہتی ہوں۔ کچھ وقت تمہارے ساتھ گزارنا چاہتی ہوں۔ کل سے کالج کھل رہے ہیں۔ مجھے شاید بابا جان پھر ہوسٹل بھیج دیں یا ہو سکتا ہے اگر تم گھر پر رہے تو میں بھی گھر پر ہی رہوں۔"

وہ کچھ متذبذب سی تھی' سعدون کی حالت کے پیش نظر ہو سکتا ہے بابا جان اسے ابھی ہوسٹل نہ بھیجیں۔ اسے یقین سا ہونے لگا۔

"کل ۲۰ اگست ہے؟" سعدون نے پوچھا اور ہاتھوں کی پشت سے اپنے رخسار صاف کیے۔

"ہاں۔"

"تو کل میرا اسکول بھی کھل جائے گا۔"

"ظاہر ہے۔" درثمین مسکرائی کہ وہ کسی اور بات میں دلچسپی لے رہا ہے۔

"تو کیا بابا جان مجھے کل اسکول بھیجیں گے یا اب ہمیشہ گھر میں ہی قید رکھیں گے؟"

"کیوں بھلا' گھر میں کیوں قید رکھیں گے۔ سعدی! تمہیں پڑھنا ہے۔ بابا جان کی خواہش ہے کہ تم لمز سے ایم بی اے کرو پھر شاید وہ تمہیں باہر بھی بھیجیں گے پڑھنے کے لیے۔"

"اچھا' تو میں بھی صبح اسکول جاؤں گا؟"

"ہاں' کیوں نہیں۔" اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"تم دل لگا کر پڑھنا سعدی! تم جب کراچی میں تھے تو کتنے اچھے تھے' پڑھائی میں فرسٹ آتے تھے۔"

"ہاں لیکن اب میرا پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ سر تنویر کہتے تھے' میں پڑھ نہیں سکتا۔"

"وہ جھوٹ بولتے تھے سعدون! وہ خوبصورت' ذہین اور امیر لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ کچھ عرصہ وہ جس ڈاکٹر کے پاس زیر علاج رہے تھے' اس کی رپورٹس سے پتا چلا تھا کہ ایک بار دوران تعلیم اس کے والد علاج کی غرض سے اسے ان کے پاس لائے تھے۔ سعدون! وہ ذہنی مریض تھے۔"

سعدون کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں لیکن وہ خاموش ہی رہا' تب ہی عباس نے دروازے پر دستک دی۔

''عباس......'' درثمین کی آنکھیں یکدم لو دینے لگیں' وہ اس کی دستک کا انداز پہچانتی تھی۔
''آ جائیں عباس!'' اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔
عباس شلوار قمیص میں ملبوس تھا اور قمیص کے کف کہنیوں تک مڑے ہوئے تھے۔
''ہیلو سعدی بابا! کیسے ہیں آپ؟''
''اچھا ہوں۔'' سعدون سنجیدہ ہو گیا۔
''اور آپ!'' اس نے درثمین کی طرف ایک نظر دیکھا اور پھر فوراً ہی نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔ ثمین اسے ہی دیکھ رہی تھی۔
''آپ آج رات پیکنگ کر لیجئے گا' صبح آپ کو ہاسٹل چھوڑ دوں گا۔''
''کیا سعدون بھی صبح ہاسٹل جائے گا؟''
''نہیں' ابھی نہیں۔''
''تو پھر جب تک سعدون گھر میں ہے' میں یہاں رہ لیتی ہوں؟''
''ملک صاحب نے کہا ہے' آپ کو جانا ہے صبح اور سعدون کا ایڈمیشن دوسرے اسکول میں ہو گیا ہے۔ اسے وہاں جانا ہے۔ ذرا اس کی طبیعت اچھی ہو جائے تو۔''
''لیکن سر تنویر تو اس اسکول سے چلے گئے ہیں پھر؟''
''وہاں سعدون کا جانا اب مناسب نہیں۔ سر تنویر کے متعلق لوگ خوامخواہ فضول سوال کریں گے' اس لیے ملک صاحب نے اسے اسلام آباد کے امریکن گرامر اسکول میں داخل کروا دیا ہے۔''
''تو سعدون وہاں چلا جائے گا؟'' وہ یکدم اداس ہو گئی۔
''ہاں' اسی میں بہتری ہے۔''
عباس اس کی طرف دیکھے بغیر بات کر رہا تھا' اس کی نظریں سعدون پر تھیں۔
''اور سعدون بابا! وہ اسکول بہت اچھا ہے' آپ کو پسند آئے گا۔''
''سارے اسکول اور سارے ہاسٹل ایک جیسے ہی ہوتے ہیں' مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''
سعدون کا چہرہ سپاٹ تھا۔
''اور کیا فیل کر رہے ہیں آپ سعدون! کچھ گپ شپ کا موڈ ہے۔ ایک کیرم کی بازی ہو جائے۔''
''نہیں' مجھے سونا ہے' میں تھک گیا ہوں۔ صبح سے باتیں کر کر کے ثمین نے میرا دماغ کھا لیا ہے۔''
''اوکے۔'' عباس اس کے پاس بیٹھتے بیٹھتے اٹھ گیا۔
''لیکن آپ نے کھانا تو کھانا ہے نا' ملک صاحب ابھی کچھ مہمانوں کے ساتھ مصروف ہیں'

فارغ ہو لیں تو کھانا لگایا جائے گا۔''
''نہیں' مجھے بھوک نہیں ہے۔''
''ٹھیک ہے' میں دودھ بھجوا دیتا ہوں۔''
''نہیں۔'' سعدون نے منع کر دیا۔
درثمین بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی اور دونوں آگے پیچھے سعدون کے کمرے سے باہر نکل آئے۔
''اگر دو تین دن میں گھر میں ہی رک جاؤں تو کیا حرج ہے؟''
''نہیں' حرج تو کوئی نہیں۔'' عباس نے ذرا کی ذرا پلکیں اٹھائیں۔
''لیکن ملک صاحب کا حکم ہے۔''
''اور ملک صاحب آپ کے ہی مشورے پر چلتے ہیں۔'' وہ جل کر بولی۔
''آپ کو غلط فہمی ہے۔'' عباس ٹیرس کی ریلنگ پر ہاتھ رکھ کر نیچے جھانکنے لگا۔
''ملک صاحب! اپنی مرضی سے فیصلہ کرتے ہیں۔''
''فیصلہ تو وہ کرتے ہیں لیکن راہ آپ ہی دکھاتے ہیں۔'' عباس نے تھوڑا سا رخ موڑ کر اپنی بے ساختہ مسکراہٹ چھپائی۔ کم از کم اس بار یہ حقیقت تھی کہ اس نے ہی ملک صاحب سے کہا تھا کہ ثمین کو ہاسٹل بھیج دیا جائے۔ حالانکہ وہ چاہ رہے تھے کہ جب تک سعدون گھر پر ہے' وہ بھی گھر میں ہی رہے لیکن چونکہ وہ خود صبح کی فلائٹ سے لندن جا رہے تھے ایک ماہ کے لیے تو عباس نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ ان کی موجودگی میں ہی ثمین کو ہاسٹل چھوڑ دے اور سعدون کو تو بہر حال ہفتہ بھر تک تو ابھی گھر پہ ہی رہنا تھا۔
''اور یہ آپ مجھ سے منہ موڑے کیوں کھڑے ہیں' کیا نظر لگا دوں گی آپ کو۔''
''کیسی باتیں کرتی ہیں آپ؟''
عباس نے ایک ہاتھ ریلنگ پر رکھے رکھے اس کی طرف رخ کر لیا۔
''یا تو آپ بڑے آدمی ہو گئے ہیں یا پھر مجھ سے بھاگ رہے ہیں۔ کئی دنوں سے میں محسوس کر رہی ہوں۔'' اندر چھپے چور نے دل میں چٹکی سی لی۔ درثمین کا مشاہدہ غضب کا تھا۔
چند دنوں سے اس کے دل کی عجیب حالت تھی اور وہ خود اپنی اس حالت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ اس نے اپنے دل کی آواز کی نفی تو کر دی تھی لیکن درثمین کو سامنے پاتے ہی دل بغاوت کرنے لگتا۔ وہ خود کو سرزنش کرتے کرتے تھک گیا تھا۔
''میرے سامنے کی ننھی سی بچی ہے وہ۔'' اسے یاد آتا کہ زہرہ جمال کی وفات کے بعد کیسے راتوں کو وہ اسے کندھے سے لگائے' ٹہل ٹہل کر خاموش کروایا کرتا تھا اور وہ روئے چلی جاتی تھی۔

"درثمین! کیا ہو گیا ہے آپ کو' میں بھلا آپ سے کیوں بھاگوں گا۔ میری زندگی کا محور تو آپ' ملک صاحب اور سعدون ہی ہیں۔ آپ کو تو یاد نہ ہو لیکن مجھے یاد ہے کہ کیسے میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر آپ کے رونے پر آپ کو کندھے سے لگائے ٹہلتا رہتا تھا اور اس ڈر سے کہ کہیں کاٹ میں ڈالنے پر آپ پھر نہ رونے لگیں' جاگ نہ جائیں' صبح ہونے تک ٹہلتا رہتا تھا۔"

درثمین کی چمکتی آنکھیں لمحہ بھر کو ماند پڑ گئیں اور اس نے عباس کے چہرے سے نظریں ہٹالیں تو عباس نے بھی اطمینان بھرا سانس لیا۔ آج کل اسے ثمین کا رویہ بھی کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا لیکن وہ اسے کوئی اہمیت دینے پر تیار نہ تھا۔

"دراصل یہ میرے اپنے دل کا چور ہے' ورنہ بھلا ثمین......"

"تو آپ پیکنگ کرلیں۔ ڈنر شاید کچھ دیر سے سرو ہو گا' مہمانوں کے جانے کے بعد۔"

"کون لوگ ہیں؟" درثمین اب اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

"شاید الیکشن کے سلسلے میں پارٹی کے لوگ آئے ہیں۔"

"یہ بابا جان پہلے کیا کم مصروف رہتے ہیں جو یہ نیا کھٹ راگ پال لیا۔" درثمین نے برا سا منہ بنایا۔

"سعدون! شاید سو گیا ہے۔" عباس نے مڑ کر پیچھے سعدون کے کمرے کی طرف دیکھا جس کی لائٹ آف تھی۔

"ہاں بہت ڈسٹرب ہے' اس ذلیل شخص نے بہت اٹیچڈ کرلیا تھا اپنے ساتھ۔"

"چلیں اب تو اس سے جان چھوٹی۔ اولیول کے بعد ملک صاحب اسے باہر بھیجنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔" عباس نے بتایا۔

"وہاں کی کیا ضمانت ہے۔ اتنی کم عمری میں تو اسے بابا جان کی گائیڈنس کی ہر وقت ضرورت ہے۔ آپ کو بابا جان کو سمجھانا چاہیے۔"

"آپ صحیح کہتی ہیں۔" عباس نے تائید کی۔

"بات کروں گا ملک صاحب سے' فی الحال تو ایک سال ہے اولیول میں بھی۔"

"میں سعدی کے لیے بہت پریشان ہوں۔"

"لیکن اب پریشانی والی بات نہیں ہے ثمین!"

عباس نے اسے تسلی دی اور نیچے جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ثمین وہیں ٹیرس پر مدھم روشنی میں کھڑی سوچنے لگی' سعدون کے متعلق' عباس کے متعلق اور بابا جان کے متعلق۔ باہر ٹیرس پر خاموشی ہوتے ہی اندر کمرے میں سعدون بیڈ سے اٹھا اور بیڈ کی دراز سے موبائل نکال کر سرتنویر کے موبائل کا نمبر ملانے لگا۔

"ڈیڈ! وہ لڑکی فراڈ تھی۔ دراصل اسے اپنی بیمار ماں کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔" کاظم جہانداد نے چوہدری جہانداد کو کوئی تیسری بار یقین دلایا۔

"ٹھیک ہے' تمہارا اگر یہی خیال ہے تو ورنہ......"

"ڈیڈ! لڑکیوں کے متعلق میں بہر حال آپ سے بہتر نظر رکھتا ہوں۔" چوہدری جہانداد نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ "اور مجھے ہر طرح کی لڑکیوں کو ڈیل کرنے کا تجربہ ہے۔" چوہدری جہانداد نے برا سا منہ بنایا۔

"مجھے لگتا ہے جیسے تم امریکہ پڑھنے نہیں بلکہ لڑکیوں پر ریسرچ کرنے گئے تھے۔"

"اسے آپ پارٹ ٹائم جاب سمجھ لیں ڈیڈ!" اس نے قہقہہ لگایا۔

"میں نے پڑھ تو لیا ہے۔ ڈگری لے کر آیا ہوں' خالی ہاتھ نہیں۔"

"تو اس لڑکی نے تمہیں اتنی سی کہانی سنائی ہے کاظم؟" چوہدری جہانداد کی سوئی وہیں پر اٹکی ہوئی تھی۔

ان کے آدمیوں نے انہیں بتایا تھا علاقے میں ہونے والے ملک فیروز کے تین چار جلسوں میں لوگوں کی تعداد پہلے سے دگنی تھی اور ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ملک فیروز خان کے جلسوں میں پنڈال کو خالی ہی کر دیں۔

کاظم نے چوہدری جہانداد پر ایک گہری نظر ڈالی اور پاؤں پھیلاتے ہوئے تجویز پیش کی۔

"گو بقول آپ کے یہ بات کم و بیش سب ہی جانتے ہیں لیکن ملک فیروز خان کی شادی کو چھبیس ستائیس سال تو ہو گئے ہوں گے اور اگر اس وقت یہ خبر پھر نئے سرے سے...... تو لوگ ضرور متوجہ ہوں گے' مثلاً ملک فیروز خان کے پڑدادا کی کوئی شناخت نہ تھی' لے پالک لیے جانے والا یہ بچہ......"

"میرا خیال ہے تم صحیح کہہ رہے ہو۔" چوہدری جہانداد نے اسے ٹوک دیا۔

"پہلی بار تم نے کوئی صحیح مشورہ دیا ہے۔"

وہ دائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور شہادت کی انگلی سے مونچھوں کو بل دینے لگے۔

"اس کے پڑدادا والی خبر یقیناً دلچسپ ہو گی اور اسی پڑدادا کے پڑپوتے نے ایک گائیکہ کی بیٹی سے جس کا تعلق اس بازار سے تھا' شادی کرلی اور وہ بیٹی اس وقت کی مشہور ماڈل گرل تھی۔"

"گڈ۔" وہ مسلسل مونچھوں کو بل دے رہے تھے۔

"یہ عوام اور لوگ' ان کی نیچر میں بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں' وہ اس خبر میں ایسے دلچسپی لیں گے جیسے پہلی بار سن رہے ہیں اور اس کا کوئی اور فائدہ نہ ہو' ملک کے بچے کا امیج تو خراب ہو جائے گا عوام میں۔" وہ بہت لطف لے رہے تھے اور کاظم ان کے تاثرات کا جائزہ لے رہا تھا۔

''تو اسی بات پر لائیے ایک تگڑا سا چیک۔ پانچ لاکھ کی بچت کروادی آپ کی۔''
''کاظم!'' وہ یکدم سنجیدہ ہو گئے۔
''تم بہت فضول خرچ ہو۔ روپیہ پیسہ درختوں پر نہیں اگتا۔''
''ارے ڈیڈ! کہاں فضول خرچ ہوں۔ میں تو اپنی حیثیت سے بہت کم خرچ کرتا ہوں اور ہماری زمینیں تو سونا اگلتی ہیں۔ سو پیسہ درختوں پر تو نہیں لیکن زمین پر ضرور اگ رہا ہے۔''
''کاظم! اب تم سنجیدہ ہو جاؤ اور یہ نومی جیسی لڑکیوں پر پیسہ لٹانا چھوڑ دو۔ تمہاری ماں کہہ رہی تھی کہ اب تمہیں شادی کر لینا چاہیے۔''
''کرلوں گا شادی بھی ڈیڈ! ابھی تو زندگی انجوائے کرنے دیں اور نومی جیسی لڑکیوں سے میرا بھی دل بھر گیا ہے اب۔ اب تو......'' اور تصور میں امثل کا چہرہ جگمگایا۔
اتنا مکمل حسن جسے سادگی، پاکیزگی اور حیا نے مل کر اور بھی دو آتشہ کر دیا تھا۔
''امثل۔'' اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ اس کے متعلق بہت ساری معلومات وہ حاصل کر چکا تھا۔ اس نے جو بتایا تھا، تقریباً ٹھیک تھا۔
وہ چوہدری جہانداد سے چیک لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔
''کیا تمہارے اپنے اکاؤنٹ میں بالکل کچھ نہیں رہا کاظم! کہ تم ہر ہفتے میرے سامنے ہاتھ پھیلائے کھڑے ہوتے ہو۔''
''مجھے بھی ہاتھ پھیلانا پسند نہیں ہے ڈیڈ! لیکن مجبوری ہے۔ آپ کچھ ایسا بندوبست کر دیں تا کہ ہاتھ نہ پھیلانا پڑے اور رقم براہِ راست میرے اکاؤنٹ میں جمع ہوتی رہے۔''
''کپاس کی فروخت کی ساری رقم تمہارے اکاؤنٹ میں گئی تھی، کیا ہوئی؟'' چوہدری جہانداد سنجیدہ ہو گئے۔
''یہ کب کی بات کر رہے ہیں ڈیڈ! اب تو پھر کپاس کی چنائی ہونے والی ہے۔'' وہ مسکرایا اور ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے چوہدری جہانداد کی طرف دیکھا۔
''اور خبر کی آپ فکر نہ کریں، چھپ جائے گی۔ سلیمی اپنا یار ہے۔'' اور چوہدری جہانداد کے تصور میں ملک فیروز خان کا چہرہ آ گیا، تلملایا ہوا سا۔
''اور جو بات لوگ بھول چکے ہیں، اسے پھر یاد دلا دیا جائے تو کیا حرج ہے۔'' چوہدری جہانداد نے خود سے کہا۔

◈◈◈

''کیا بات ہے ثومی! میں دیکھ رہا ہوں، کچھ دنوں سے تم بہت پریشان لگ رہی ہو۔'' فریدوں نے بہت غور سے امثل کے چہرے کی طرف دیکھا جو مرجھایا مرجھایا سا لگ رہا تھا۔ آنکھوں کی وہ شوخ چمک جو ہمیشہ اس کی دلکش آنکھوں میں نظر آتی تھی، اس وقت مفقود تھی اور

وہ بہت نڈھال اور افسردہ لگ رہی تھی۔ حالانکہ وہ ہمیشہ بہت چاق و چوبند اور فریش رہتی تھی۔
فریدوں کافی دیر سے نوٹ کر رہا تھا کہ وہ کام کرتے کرتے کھو سی جاتی تھی۔ لیکن چونکہ آج وہ خاصا مصروف تھا، اس لیے وہ اس کی ٹیبل پر نہ آ سکا۔ البتہ اس کی ٹیبل کے پاس سے گزرتے ہوئے کئی بار اس کا جائزہ لیا تھا اور اب لنچ بریک ہوتے ہی وہ سیدھا اس کے پاس آیا تھا۔ یوں بھی وہ لنچ اکٹھے ہی کرتے تھے۔ امثل گھر سے ہی سینڈوچ لے آتی تھی اور چائے کے ساتھ دونوں سینڈوچ کھا لیتے تھے۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا تھا کہ وہ قریبی ریسٹورنٹ میں چلے جاتے۔
''نہیں تو، تمہیں وہم ہوا ہے فریدوں!'' وہ افسردگی سے مسکرائی۔
''نہیں ثوما! مجھے وہم نہیں ہوا۔ میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ تم کب خود مجھ سے اپنی پریشانی شیئر کرتی ہو۔ آنٹی کی طبیعت پہلے سے کافی بہتر ہے۔ ہمایوں کا بھی اب کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ اس ٹیچر کا تبادلہ ہو گیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ ہمارا ہومی بچ گیا۔''
''ہاں لیکن مجھے اس بچے کا بھی بہت دکھ ہوا تھا جسے وہ نشے کا عادی بنا رہا تھا۔''
''سنا ہے اس کا باپ کوئی بڑا صنعت کار ہے، ورنہ ہم جیسے لوگوں کی تو کوئی شنوائی ہی نہیں ہوتی۔ خدا ہماری درسگاہوں کو اور ہمارے بچوں کو ایسے افراد سے محفوظ رکھے۔'' فریدوں نے بات مکمل کر کے اس کی طرف دیکھا۔
''کیا خیال ہے، آج لنچ کے لیے باہر نہ چلیں؟''
''نہیں، آج ماما نے صبح صبح چکن سینڈوچ بنائے تھے ہومی کو لنچ میں دینے کے لیے، میں بھی وہی لے آئی۔''
''اللہ پاک کی قسم گھر کی بنی چیزوں کی بات ہی اور ہوتی ہے۔'' غفور صاحب پاس سے گزرتے ہوئے کھنکھارے اور پھر امثل کی طرف دیکھتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔
''آپ بہت اچھا کرتی ہیں مس امثل! جو گھر سے کچھ بنا کر لے آتی ہیں۔'' امثل نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ اپنے سے آگے چلتے حمید صاحب کے کندھوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔
''اور پھر ریسٹورنٹ میں یہ تنہائی بھی تو نہیں ہوتی، اللہ پاک کی قسم۔'' فریدوں نے مڑ کر ایک تیز نظر غفور صاحب پر ڈالی اور پھر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔
''یہ غفور صاحب جیسے لوگ۔ میرا جی چاہتا ہے شوٹ کر دوں ان کو۔''
''اور خود جیل چلا جاؤں۔'' امثل پہلی بار مسکرائی تو فریدوں کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔
''اچھا اب لنچ نکالو اور جلدی سے شروع ہو جاؤ۔''
''جب کوئی بات ہی نہیں تو کیا بتاؤں۔'' اس نے نظریں چرا لیں اور دراز کھینچ کر لنچ باکس باہر نکالا۔ تب ہی چپڑاسی نے چائے لا کر رکھ دی۔

''تم مجھ سے جھوٹ کیوں بول رہی ہو ثومی!'' فریدوں کے لہجے میں دکھ تھا۔
''آنٹی اور ہومی کے علاوہ کوئی اور بات ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔''
امثل کا دل چاہا وہ سب کچھ فریدوں سے کہہ دے لفظ لفظ۔ اور سارا بوجھ فریدوں کے کندھوں پر ڈال کر خود مطمئن ہو جائے لیکن نہیں' اگر فریدوں کو اس کی یہ حرکت بری لگی' اگر وہ اس سے متنفر ہو گیا' اگر اس نے اس سے شادی سے انکار کر دیا تو۔ اس نے اپنے ہاتھ کی طرف دیکھا اور پھر اس انگوٹھی کو جس نے اس کے اور فریدوں کے درمیان ایک بندھن باندھ دیا تھا جو مضبوط بھی تھا اور کمزور بھی۔
کل سے وہ بہت پریشان تھی' چھٹی کے وقت حسب معمول وہ فریدوں کے ساتھ ہی آفس سے نکلی تھی اور آفس سے نکل کر اسٹاپ کی طرف جاتے ہوئے اس نے کاظم کو دیکھ لیا تھا۔ وہاں قریب ہی اس نے ایک طرف اپنی گاڑی پارک کر رکھی تھی اور اس کے آفس سے نکلتے ہی وہ اسے حرکت میں لے آیا تھا۔ اس کی نظریں اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے کاظم سے ملی تھیں اور غیر ارادی طور پر وہ فریدوں کے قریب ہو گئی تھی اور کسی قدر گھبرا کر فریدوں سے کہا۔
''فریدوں...... پلیز آج...... گھر تک ہی چلے چلو۔''
''جو حکم۔'' فریدوں نے سرخم کرتے ہوئے شوخی سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ بے حد پریشان سی اس سفید گاڑی کی طرف دیکھ رہی تھی جو فٹ پاتھ کے ساتھ رینگ رہی تھی۔
''کیا تمہاری پریشانی کا تعلق اس سفید گاڑی سے ہے ثومی!'' بالکل اچانک ہی فریدوں نے پوچھا تو وہ سٹپٹا گئی۔
''ہاں' نہیں تو۔'' تب ہی حمید صاحب کے کیبن میں رکھے فون کی بیل ہوئی تو چپڑاسی نے اٹینڈ کر کے اسے آواز دی۔
''مس امثل! آپ کا فون ہے۔''
''خدایا خیر' ماما ٹھیک ہوں۔'' وہ گھبرا کر اٹھی اور شیشے کے کیبن میں جا کر ریسیور اٹھایا۔
''ہیلو مس امثل۔'' آواز اجنبی تھی۔
''آپ کون پلیز؟''
''ارے اتنی جلدی بھول گئیں' آپ کا خادم کاظم چوہدری۔''
وہ حیران رہ گئی کہ اس کا نام اور فون نمبر اسے کیسے ملا۔
''فرمایئے۔'' اس نے لہجے کو مضبوط بنانے کی کوشش کی۔
''میرا خیال ہے ہمارے درمیان بات ختم ہو چکی تھی۔''
''آپ کے نزدیک' میرے نزدیک تو بات اب شروع ہوئی ہے۔ سچ بتاؤں' میری تو راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ مجھ سے دوستی کر لیں' فائدے میں رہیں گی۔ ماں کا علاج بھی

ہو جائے گا اور ہمارے درد دل کا بھی۔''
''مسٹر کاظم! میں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔ میں نے جو حرکت کی تھی اس کے لیے معذرت کر چکی ہوں۔ اگر آپ کہتے ہیں تو میں آپ کے والد سے بھی معذرت کر لیتی ہوں اور خدا کے لیے آپ میرا پیچھا چھوڑ دیجیے۔''
بار بار پسینے کے قطرے پیشانی سے پونچھتی امثل کو چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے فریدوں نے بہت غور سے دیکھا۔
''پیچھا تو اب نہیں چھوٹے گا بی بی! آپ کاظم چوہدری کے دل کو بھا گئی ہیں۔'' اس کے ہاتھ کپکپانے لگے۔
''اور ہاں کل میں نے پورا ایک گھنٹہ آپ کا انتظار کیا لیکن آپ کے ساتھ وہ لڑکا یعنی آپ کا فیانسی تھا آپ کے ساتھ' لیکن یاد رکھنا کل دم چھلا ساتھ نہ ہو آفس ٹائم کے بعد لینے آؤں گا میں۔'' اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور خود کو مضبوط کرتے ہوئے بولی۔
''مجھے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جانا مسٹر!''
لیکن لہجے کی کمزوری اس سے چھپی نہ رہ سکی۔
''یاد رکھنا' کل آفس ٹائم کے بعد۔''
لہجے میں سفاکی تھی' اس کا پورا وجود کانپ کر رہ گیا۔ دوسری طرف فون بند ہو گیا تھا۔ وہ کیبن سے باہر نکلی تو اس کی رنگت خطرناک حد تک زرد ہو رہی تھی اور آنکھوں میں وحشت تھی۔
''کیا اسی کار والے کا فون تھا؟'' اس کے بیٹھنے کے بعد فریدوں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ بے حد سنجیدہ تھا۔
امثل نے اس کی طرف دیکھا۔ گلابی پھول کی پنکھڑیوں ایسے ہونٹ کانپے اور وہ یکدم میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ فریدوں کچھ دیر اسے یونہی روتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر آہستہ سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔
''ناؤ ریلیکس ثومی! لنچ ٹائم ختم ہونے والا ہے۔'' امثل نے سر اٹھایا۔ دلکش آنکھیں رونے سے یکدم سرخ ہو گئی تھیں۔
''چہرہ صاف کرو امثل! جانتی ہو یہاں اس آفس میں غفور صاحب جیسے لوگ کیسے بات کا بتنگڑ بنانے میں ماہر ہیں۔'' امثل نے چہرہ صاف کیا۔ ٹھنڈی چائے اٹھا کر ایک ہی گھونٹ میں حلق سے نیچے اتاری۔ سینڈوچ اسی طرح پڑے تھے۔ فریدوں نے بھی نہیں کھائے تھے۔
''آج غفور صاحب نے ہمارے لنچ کو نظر لگا دی ہے۔'' فریدوں نے اسے ریلیکس کرنے کے لیے ہنس کر کہا۔
بہر حال اپنے بیگ میں رکھ لو گھر چل کر کھا لیں گے۔''

لوگ واپس آنا شروع ہو گئے تھے۔ فریدوں اٹھ کھڑا ہوا۔

"گھر چل کر بات ہو گی اور میرے پاس ایک خوشخبری بھی ہے۔" وہ مسکرایا۔ اور اسے ریلیکس رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اپنی سیٹ پر چلا گیا۔

❖❖❖❖

درثمین لان میں بہت دیر سے خاموش بیٹھی مالی کو پانی پودوں کو دیتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی دھوپ میں بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا اسے، وہ کل شام ہی عباس کے ساتھ ہاسٹل سے گھر آئی تھی۔ دس دن کے لیے کالج میں سردیوں کی چھٹیاں ہو گئی تھیں اور اسے بابا جان اور سعدون سے ملے تین ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے۔

سعدون اسلام آباد میں امریکن گرامر اسکول میں داخل ہو گیا تھا۔ بابا جان الیکشن میں کامیابی کے بعد اکثر اسلام آباد چلے جاتے تھے اور جب لاہور میں ہوتے تب بھی ان کے پاس اس سے ہاسٹل آ کر ملنے کا وقت نہ ہوتا۔ حالانکہ وہ ان سے ملنا چاہتی تھی اور ان سے بہت ساری باتیں پوچھنا چاہتی تھی۔ پچھلے ایک ماہ سے وہ بہت ٹینس تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اس کی روم میٹ ڈیزی ویک اینڈ پر جب گھر سے آئی تو اس کے سامان میں ہفت روزہ "ندا" کا ایک پرچہ بھی تھا جس میں غالباً اس نے کوئی چیز لپیٹ رکھی تھی۔ زمین پر پڑا اخبار کا وہ ورق ثمین نے اٹھا کر یونہی پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ اسے پڑھنے سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی لیکن اس وقت وہ بہت بور ہو رہی تھی۔

"ملک فیروز خان کی بیوی ماضی کی مشہور ماڈل گرل زہرہ جمال ہے۔"

وہ حیرانی سے تفصیلات پڑھتی چلی گئی۔

ملک فیروز خان نے کبھی اس سے ماں کے متعلق بات نہ کی تھی، ہاں ان کے بیڈ روم میں ان کی شادی کی تصویریں لگی ہوئی تھیں اور ان ہی تصویروں میں اس نے ماں کو دیکھا تھا اور سوچا تھا کہ اس کی ماں یقیناً ایک بے حد خوب صورت عورت تھی۔ اس کی آنکھیں اپنی امی کی طرح نیلی تھیں اور بالوں کا رنگ بھی سنہری مائل براؤن تھا، ہاں باقی نقوش مختلف تھے۔ ملک فیروز خان نے دوسری شادی نہ کی تھی۔

"شاید وہ مما سے بہت محبت کرتے تھے۔" اس نے سوچا۔

اس نے باقی کی خبر نہیں پڑھی تھی۔ لیکن وہ سوچ رہی تھی، کیا خبر اس کی نانی زندہ ہوں۔ کیا پتا اس کی کوئی خالہ یا ماموں بھی ہوں۔ لیکن وہ کبھی اس سے ملنے نہیں آئے لیکن نہیں اس نے اخباری خبر پر نظر دوڑائی۔

"زہرہ جمال کی ماں ایک گائیکہ تھی جس کا تعلق۔" اسے اپنے رخسار گرم ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔

"یعنی۔" اس نے ایک لمحہ کو سوچا اور پھر اخبار کے اس ورق کو گول مول کر کے اپنے بیگ میں ٹھونس دیا۔

اور اب بابا جان کو وہ یہ خبر دکھا کر کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن بابا جان اسلام آباد میں بیٹھے تھے اور جانے وہ کب آتے۔ عباس شام کو اسے ہاسٹل سے لے آیا تھا اور گھر میں حویلی سے تائی فاطمہ غالباً بابا جان کی ہدایت پر آ گئی تھیں۔

تائی فاطمہ بابا جان کے کسی چچیرے بھائی کی دوسری بیوی تھیں جو شوہر کی وفات کے بعد حویلی میں ہی رہتی تھیں، اولاد کوئی نہیں تھی۔ جب پہلی بیوی اور ان کے بچوں نے گھر سے نکالا تو ملک فیروز خان کے والد ازراہ ہمدردی گھر لے آئے تھے۔ گو اب تو وہ بوڑھی ہو چکی تھیں۔ تقریباً ساٹھ سال کی ہوں گی لیکن بہت چست اور چاق و چوبند تھیں۔ حویلی کا سارا انتظام بابا جان نے ان ہی کے حوالے کر رکھا تھا۔ سارے ملازمین کو دیکھنا اور حویلی سنبھالنا ان کی ذمہ داری تھی۔ تائی فاطمہ کو دیکھ کر وہ خوش ہوئی تھی۔ وہ بڑی محبت کرنے والی خاتون تھیں۔

"فیروز نے فون کیا تھا کہ ثمین کی چھٹیاں ہونے والی ہیں تو کچھ دن کے لیے میں بھی لاہور آ جاؤں۔"

"بہت دل کو ہڑک لگی تھی تمہاری، جب کراچی میں تھیں تو کبھی کبھی آ جاتی تھیں، اب تو جب سے لاہور آ گئی ہو کبھی فیروز لایا ہی نہیں تمہیں۔" تائی فاطمہ نے آتے ہی گھر کا انتظام سنبھال لیا تھا۔

"تائی! آپ نے میری امی کو دیکھا تھا۔" اس نے اچانک ہی پوچھا۔

"ہاں ہاں، کیوں نہیں دیکھا تھا، بیاہ کر تو پہلے حویلی میں آئی تھی۔ دس پندرہ دن رہی تھی وہاں۔ سیپ سے نکلے موتی کی طرح تھی تیری ماں۔ ایسی اجلی، نیک، محبت کرنے والی بے حد خوش اخلاق تھی اور شکل تو اتنی پیاری کہ بس دیکھتے رہ جاؤ۔"

"امی کا انتقال کیسے ہوا تھا؟"

"پتا نہیں بیٹی! وہ تو کراچی میں تھی۔ حویلی میں تو بس عید وغیرہ پر ہی آتے تھے دونوں، بس ایک دن کراچی سے خبر آئی کہ فیروز کی دلہن چل بسی، ابھی تو حویلی میں سعدون پتر کی پیدائش کا جشن ختم نہیں ہوا تھا کہ یہ خبر آ پہنچی، بس کہرام مچ گیا تھا۔"

"بس اچانک ہی ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ تمہاری دادی تو پہلے ہی وفات پا چکی تھیں۔ دادا جب تک زندہ رہے فیروز کی منتیں کرتے رہے کہ جانے والی تو چلی گئی تم گھر بساؤ، لیکن فیروز نہیں مانا۔"

اس نے اپنے تیل میں چپڑے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

"یہ تائی اماں بھی خوب ہیں، لے کے تیل سے چپڑ دیا سارا سر لیکن ان سے مالش کروانے

میں کتنا سکون ملتا ہے۔جی چاہتا ہے بس آنکھیں بند کر کے سو جاؤ۔''

''میرا خیال ہے ہاتھ لے لوں بابا جان اور سعدون کے آنے سے پہلے۔''

وہ اٹھنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اپنی انیکسی کی طرف سے عباس آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ کرتا شلوار میں ملبوس تھا۔ پاؤں میں سیاہ پٹی والے چپل تھے' بال بکھرے ہوئے تھے۔اسے لان میں بیٹھا دیکھ کر وہ ٹھٹکا پھر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔آج اتوار کا دن تھا اس لیے وہ گھر پہ ہی تھا۔

''آپ یہاں بیٹھی ہیں ٹھنڈ میں؟''

''نہیں' ہلکی دھوپ ہے تو سہی اچھی لگ رہی ہے۔''

عباس نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا' اس وقت سورج بادلوں کے پیچھے چھپا تھا۔اکا دکا بادل نظر آ رہے تھے۔ پھر دوسرے ہی لمحے سورج نے بادلوں سے جھانکا تو دھوپ نے درثمین کے بالوں کو چھوا جو دلچسپی سے عباس کو دیکھ رہی تھی۔

''آسمان پر کیا تلاش کر رہے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔'' وہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''بابا جان اور سعدون کب آ رہے ہیں؟''

''ایک دو روز تک اسمبلی کا اجلاس متوقع ہے' اس لیے وہ تو فی الحال نہیں آ سکے اور سعدون کو بھی وہ تسلسل سے اپنے ساتھ ایم این اے ہوسٹل لے گئے ہیں۔ جب آئیں گے تو ساتھ ہی لائیں گے سعدون کو۔'' عباس نے متوقع ردعمل کو جاننے کے لیے اس کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں یکدم ملال کے بادل چھا گئے تھے اور چہرے کی چمک ماند پڑ گئی تھی۔

''تو گویا تائی فاطمہ کو اسی لیے بلایا گیا ہے۔یعنی اس کا مطلب ہے کہ بابا جان کا ارادہ ان چھٹیوں میں آنے کا نہیں ہے۔''

ذہین تو وہ بلا کی تھی' عباس نے ہمیشہ ہی اس کی ذہانت کو ایڈ مائر کیا۔

''کم از کم سعدون کو تو لے آتے آپ۔'' اس نے شکوہ بھری نظروں سے عباس کو دیکھا۔

''آ جائیں گے ملک صاحب ایک دو روز میں۔''

''مت بہلائیں مجھے۔'' رنج سے اس کی آواز بھرا گئی۔کچھ دیر تو وہ یونہی ہونٹ کاٹتی رہی' عباس کچھ فاصلے پر کھڑا گاہے گاہے اسے دیکھتا رہا۔اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح وہ اسے اس دکھ سے نکالے' تب ہی اس نے سر اٹھا کر عباس کی طرف دیکھا۔

''مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''کیا؟''

''ایک ہفت روزہ اخبار ہے ''ندا'' اس میں بابا جان کے متعلق......''

''آپ کو وہ اخبار کہاں سے ملا؟'' عباس نے اس کی بات کاٹ دی۔اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

''ڈیزی کے پاس تھا۔''

''دراصل......''

عباس اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''وہ خبر چوہدری جہانداد نے لگوائی تھی کہ اس خبر کے چھپنے سے شاید ملک صاحب کا امیج خراب ہو جائے اور وہ جیت نہ سکیں۔لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا اور ملک صاحب جیت گئے۔''

لیکن ثمین کو ملک صاحب کے جیتنے یا ہارنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی' وہ تو صرف اپنی ماں کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔

''کیا میری امی واقعی ماڈل گرل تھیں؟''

''ہاں' انہوں نے ایک یا دو اشتہارات میں کام کیا تھا پھر ملک صاحب سے ان کی شادی ہو گئی۔''

''اور میری نانی' کیا وہ زندہ ہیں؟''

''معلوم نہیں۔'' عباس نے نظریں چرا لیں۔

''آپ کی امی کی زندگی میں بھی ملک صاحب کا اور آپ کی امی کا ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔''

''کیا وہ اب بھی' میرا مطلب ہے اب بھی ان کا تعلق ریڈ لائٹ ایریا سے ہے؟'' ثمین کے رخساروں پر اس سوال سے سرخی دوڑ گئی تھی۔

''معلوم نہیں' لیکن جب ملک صاحب کی شادی ہوئی تھی تو تب بھی وہ ایک پوش علاقے میں رہتی تھیں۔ہاں ماضی میں وہ کبھی......''

''کیا میری نانی کراچی میں رہتی تھیں یا ادھر لاہور میں؟''

''کیا بات ہے ثمین! بہت فضول سوال کر رہی ہیں آپ۔'' عباس تلملا گیا۔

''میرا بہر حال ان سے رشتہ تو ہے نا' چاہے وہ جیسی بھی ہیں۔''

''کیا میری ممی کے کوئی بہن بھائی بھی تھے؟''

''میرے خیال میں کوئی نہیں۔''

''کیا میں صرف ممی کی بیٹی ہوں۔بابا جان کی نہیں؟''

ایک دم ہی برسوں پرانی سوچ نے ذہن میں ڈنک مارا تھا۔

''کیا کہہ رہی ہیں ثمین! پتا نہیں کیا فضول سوچتی رہتی ہیں۔آپ ملک صاحب کی شادی کے آٹھ سال بعد پیدا ہوئی تھیں اور آپ کی پیدائش پر حویلی میں مہینہ بھر تک خوشیاں منائی گئی

تھیں۔

''کیا...... شادی کے آٹھ سال بعد......'' درثمین کے اندر وہ جو برسوں سے ایک کانٹا سا چبھا تھا' وہ نکل گیا۔

''تو پھر عباس۔'' درثمین کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''بابا جان مجھ سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ وہ صرف سعدون کو چاہتے ہیں۔''

''ایسا نہیں ہے گڑیا۔'' عباس کا دل تڑپ اٹھا۔

''ملک صاحب کو آپ سے بھی بہت محبت ہے لیکن سعدون وارث ہے ان کا، پہلے بھی میں نے آپ کو سمجھایا تھا کہ وہ اس کا زیادہ خیال اس لیے کرتے ہیں کہ وہ کہیں بگڑ نہ جائے اور وہ خواب جو ملک صاحب اس کے حوالے سے دیکھتے ہیں' وہ بکھر نہ جائیں۔''

''کیا میں نہیں بگڑ سکتی عباس؟''

اس نے معصومیت سے عباس کی طرف دیکھا اور عباس کے دل میں یکدم ہلچل سی مچی۔ دل نے بے اختیار انہونی سی خواہش کی لیکن دل کی خواہش کو سختی سے دبا کر وہ مسکرایا۔

''کیا مزید گنجائش ہے۔'' اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

ثمین کچھ کہتے کہتے رک گئی اور قدرے روٹھے ہوئے انداز میں بولی۔

''میں بالکل بھی بگڑی ہوئی نہیں ہوں۔''

''لیکن پنجے تو بہت مارتی ہیں اور وہ بھی مجھے۔ ملک صاحب کے سامنے تو بھیگی بلی بن جاتی ہیں۔''

عباس کے ہونٹوں پر بہت دلکش مسکراہٹ تھی۔ لیکن ثمین اس کے پاؤں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سادہ چپلوں میں سفید سفید پاؤں بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔

''اور کیا بابا جان نے میرے متعلق کبھی خواب نہیں دیکھے عباس؟'' اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

''کیوں نہیں' لیکن ان خوابوں کی نوعیت الگ ہے۔ سعدون کے لیے ان کا خواب ہے کہ وہ اعلا تعلیم حاصل کر لے اور ان کے اس پھیلے ہوئے کاروبار کو سنبھال لے اور آپ کے لیے۔''

وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''وہ کسی اچھے سے لڑکے کا خواب دیکھتے ہیں جس کے سنگ وہ آپ کو رخصت کریں جوان کا ہم پلہ ہو' آپ کے قابل ہو۔'' یکدم ہی ثمین نے سر اٹھا کر عباس کی طرف دیکھا۔

''اور کیا وہ اچھے لڑکے آپ نہیں ہو سکتے عباس؟'' ہمیشہ کی طرح بلا سوچے سمجھے اس نے دل میں آئی بات کہہ دی تھی۔ عباس ایک دم ہی کھڑا ہو گیا۔ اس کے مسکراتے ہونٹ بھنچ گئے اور چہرے پر سرخی چھا گئی۔

''سوچ سمجھ کر بولا کریں' کیا کہہ رہی ہیں آپ؟''

''تو اس میں غلط کیا ہے عباس! عفیرہ کہتی ہے کہ تمہارا کزن بہت اسمارٹ ہے' بہت کشش ہے اس کی شخصیت میں۔''

''نہیں ہوں میں آپ کا کزن' آپ کے والد کا ایک ملازم ہوں جس پر انہوں نے بچپن میں ترس کھایا' اسے پالا' اولاد جیسی محبت دی۔ لیکن اس سے میری حیثیت نہیں بدل گئی۔ اور پھر اپنی اور میری عمر دیکھیں آپ' شرم آنا چاہیے آپ کو ایسی بات کہتے ہوئے' اپنے ذہن کو ان خرافات سے پاک کر لیں۔''

وہ تیز تیز قدم اٹھاتا واپس انیکسی کی طرف چلا گیا اور وہ کچھ دیر وہیں بیٹھی سوچتی رہی کہ بھلا اس میں اتنے غصے کی کیا بات تھی۔ اور عمروں کے فرق سے کیا ہوتا ہے۔ عفیرہ کہہ رہی تھی کہ عباس اور میں ساتھ ساتھ کھڑے بہت اچھے لگ رہے تھے' بہت خوبصورت کپل۔ اس نے سر جھٹکا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''دراصل بابا جان نے اسے بہت سر چڑھا رکھا ہے اور ہو سکتا ہے بابا جان نے اس کے لیے کوئی لڑکی بھی پسند کر رکھی ہو۔ اس روز کہہ رہے تھے کہ الیکشن کے بعد وہ عباس کی شادی کا ارادہ رکھتے ہیں تو کر دیں شادی کسی سے بھی مجھے کیا۔'' اور دل کو جیسے کچھ ہوا لیکن وہ اسے نظر انداز کرتی زور سے دروازہ کھولتی اندر لاؤنج میں آ گئی' جہاں تائی فاطمہ اپنی نگرانی میں صفائی کروا رہی تھیں۔

''آپتر! ادھر بیٹھ جا میرے پاس۔ یہ فیروز کا کوئی فون شون آیا۔ کب آنا ہے اس کو۔''

''عباس بتا رہے تھے کہ ابھی فی الحال وہ نہیں آ رہے۔''

''بیٹی! وہ تم سے بڑا ہے' سولہ سترہ سال تو بڑا ہوگا اور تم اسے نام لے کر بلاتی ہو۔''

''سعدون بھی ایسے ہی بلاتا ہے۔'' اس نے لاپروائی سے کہا۔

''فیروز خان نے تو بالکل فراموش کر دیا بچوں کو۔ اپنے کاروبار میں ہی الجھ کر رہ گیا۔''

''بچوں کو نہیں صرف مجھے۔''

''نہ بیٹی! ایسا نہ کہہ تجھے تو گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ اتنی خوشیاں منائی تھیں تیری پیدائش پر جیسے بیٹی نہیں بیٹا ہوا ہو۔ ہمارے علاقے میں تو لڑکی کی پیدائش پر کہاں کوئی خوشی مناتا ہے۔ ادھر عورت کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔''

''پر کیوں تائی؟''

''شروع سے ایسا ہی چل رہا ہے۔ میں جب بیاہ کر آئی تھی تو مجھے رسم و رواج کا اتنا پتا ہی نہیں تھا۔ کھانا پکا کر میں بھی تمہارے تایا کے ساتھ کھانا کھانے بیٹھ گئی تو میری ساس نے میری بڑی بے عزتی کی کہ گھر کے مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی ہے بڑی ملکہ یا شہزادی آ گئی

ہے کہیں سے۔ وہاں عورتیں گھر کے مردوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتیں‘ نہ مائیں‘ نہ بیویاں‘ نہ بیٹیاں۔ میں تو شہر سے گئی تھی تمہارے تایا نے مجھے الگ گھر میں رکھا ہوا تھا۔ ایک روز میرے گھر میرے سسر اور دیور آ گئے‘ میں نے کھانا بنا کر ٹیبل پر لگایا اور خود اس خیال سے ایک طرف بیٹھ گئی کہ کہیں میرے سسر یہ نہ کہیں کہ بہو کھانا رکھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ کچھ ضرورت نہ پڑ جائے۔ خیر کھانا کھا کر سب رخصت ہوئے تو میں کچن میں آ کر کھانا کھانے لگی تو تمہارے تایا آ کر بہت غصے ہوئے کہ تم وہاں کیوں بیٹھیں۔ کیا کہیں گے ابا اور بھائی کہ تمہیں تمیز ہی نہیں کہ شوہر اور سسر کھانا کھا رہے ہیں اور تم وہاں لقمے گننے بیٹھ گئی ہو۔ یہ فیروز ہی تھا جو دھڑلے سے تمہاری ماں کے ساتھ ٹیبل پر بیٹھ کر کھانا کھاتا اور اسے گھمانے کے لیے ساتھ ساتھ لیے پھرتا تھا۔“

وہ وہیں صوفے پر بیٹھی تائی فاطمہ کی باتیں سنتی رہی اور حیران ہوتی رہی۔

❖❖❖

تین چار دن گزر گئے تھے عباس اس کا سامنا کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ صبح وہ بہت جلد ناشتہ کر کے مل چلا جاتا اور رات کو دیر سے آتا۔ ایک دو روز تائی فاطمہ نے کھانے پر انتظار کیا لیکن اس نے کہلوا دیا کہ وہ انتظار نہ کیا کریں اسے دیر ہو جاتی ہے۔

اس کا موڈ عباس کی اس ناراضی سے بے حد خراب ہو رہا تھا۔ اس نے تو محض رائے دی تھی۔ اگر عباس کو اس سے اتفاق نہیں تھا تو نہ سہی‘ اتنی ناراضی کی کیا ضرورت ہے۔ وہ عباس سے پوچھنا چاہتی تھی۔ اور اگلی صبح وہ بہت جلدی اٹھی تھی لیکن عباس جا چکا تھا۔ غصے سے اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا اور فل آواز سے ڈیک لگائے آنکھیں موندے کمرے میں پڑی تھی۔ فون کی بیل ہوئی‘ دوسری طرف عباس تھا۔

”تائی کہاں ہیں؟“ انتہائی سنجیدہ سا لہجہ۔

”کچن میں ہیں‘ بلاؤں۔“ ثمین نے پوچھا تو ایک لمحہ کو وہ سنجیدہ سا ہو گیا۔ پھر بولا۔

”نہیں‘ آپ کی کتنی چھٹیاں باقی ہیں؟“

”سات۔“

”ٹھیک ہے‘ ملک صاحب نے کہا ہے کہ آپ تیاری کریں اور آپ تائی کے ساتھ ایک ہفتے کے لیے حویلی چلی جائیں۔ ڈرائیور اور اس کی بیوی ساتھ جائیں گے آپ کے۔ میں ایک ہفتے کے لیے بنکاک جا رہا ہوں۔ واپس آ کر آپ کو لے آؤں گا‘ تب تک کالج کھل جائیں گے۔“

”بابا اور سعدی بھی حویلی آئیں گے؟“

”نہیں‘ ملک صاحب اور سعدی آج صبح کی فلائٹ سے نیویارک چلے گئے ہیں۔“

”اور مجھے بتایا تک نہیں‘ فون تک نہیں کیا۔“ غصے اور رنج سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”اتنی غیر اہم ہوں میں بابا کے لیے اور سعدی‘ اس نے بھی فون نہیں کیا۔“

”میں جلدی آ جاؤں گا‘ آپ اپنی پیکنگ کر لیں اور تائی کو بھی بتا دیں۔ آپ لوگوں کے جانے کے بعد ہی میں جاؤں گا۔ یا اگر میری ایک دن بعد کی فلائٹ ہوئی تو شاید میں خود چھوڑ آؤں۔“ اس نے بغیر کچھ کہے فون رکھ دیا۔

یوں اسے حویلی میں جانا اور رہنا بہت پسند تھا۔ اتنے لوگ تھے وہاں‘ ہر وقت رونق لگی رہتی تھی۔ تائی فاطمہ کے پاس علاقے کی خواتین آتی رہتیں۔ سرسبز کھیت‘ کھلی فضا‘ وہ وہاں جتنے دن رہتی بہت خوش رہتی۔ لیکن اس وقت غصے میں اسے کچھ نہیں سوجھ رہا تھا۔ تین ماہ سے زیادہ ہو گئے تھے اسے سعد اور بابا سے ملے‘ بات کیے اور......

”میں حویلی نہیں جاؤں گی اور جہاں میرا دل چاہے گا رہوں گی۔“

اس نے فیصلہ کر لیا تو تیزی سے کچھ کپڑے بیگ میں ٹھونسے۔ دراز کھول کر کچھ پیسے نکالے۔ لاکر سے چوڑیاں نکال کر پہنیں۔

”کسی کو میری حفاظت کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود اپنی حفاظت کر سکتی ہوں۔ رائٹنگ ٹیبل پر پڑے لیٹر پیڈ پر اس نے دو جملے گھسیٹے اور فون کر کے کراچی کی فلائٹ کا پتہ کیا۔

”قصر زہرہ‘ میری ماں کا گھر ہے‘ میرا اپنا گھر اور میں وہیں جا کر رہوں گی‘ اب مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔ نہ بابا کی‘ نہ سعدی کی اور نہ ہی عباس کی۔“ کبھی کبھی وہ غصے میں یوں ہی بدحال ہو جاتی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد بیگ لٹکائے وہ گیٹ سے باہر نکل گئی اور قریب آتے رکشے کو ایئرپورٹ کا کہہ کر کھولتے ہوئے دماغ کے ساتھ اس میں بیٹھ گئی۔

❖❖❖

”یہ لڑکی۔“ کاظم نے مٹھیاں بھینچیں۔

اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کسی طرح اس کے ہاتھ آ جائے تو وہ اسے توڑ پھوڑ کر رکھ دے‘ کرچی کرچی کر دے۔ اس کے اندر آگ لگی تھی اور امشل تھی کہ اس کے ہاتھ ہی نہیں آ رہی تھی۔ اس فون کے بعد سے وہ ایک بار بھی اسے اکیلی دکھائی نہ دی تھی۔ ہمیشہ اس کے ساتھ وہ لڑکا ہوتا تھا اور وہ مزے سے لڑکے کی گاڑی میں بیٹھ جاتی تھی۔ کتنے ہی دن وہ آفس ٹائم کے بعد وہاں کھڑا رہا‘ کتنی ہی بار فون کیا لیکن وہ تو فون ہی اٹینڈ نہیں کرتی تھی۔ ان دنوں وہ سب لڑکیوں کو بھولا ہوا تھا۔

”یہ لڑکی۔“

اس نے پھر مٹھیاں بھینچیں اور اس کی زیر لب بڑبڑاہٹ سن کر چوہدری جہانداد نے ایک

نا گواری سی نظر اس پر ڈالی۔

''کبھی لڑکیوں کے علاوہ بھی کچھ سوچ لیا کرو۔ ہر وقت لڑکیاں سوار رہتی ہیں تمہارے ذہن پر۔''

چوہدری جہانداد کا موڈ بے حد خراب تھا۔ الیکشن میں اپنے ہی علاقے میں ملک فیروز خان کے ہاتھوں شکست پر وہ سخت طیش کا شکار تھے۔ گو ایک اور جگہ سے انہوں نے صوبائی اسمبلی کی سیٹ کے لیے بھی الیکشن لڑا تھا اور کامیاب بھی ہو گئے تھے لیکن اپنے ہی علاقے میں ہارنا ان کے لیے بہت اذیت ناک تھا اور انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس شکست کا بدلہ کیسے لیں ملک فیروز خان سے۔ پچھلے دو تین ماہ سے انہوں نے کئی منصوبے بنا ڈالے تھے۔ اخبار میں ملک فیروز خان کا ماضی دہرا کر بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ زمانہ بدل گیا تھا' بڑے بڑے گھرانوں کی لڑکیاں ماڈلنگ میں آ رہی تھیں' سو اگر فیروز خان کی بیوی ماڈل گرل تھی تو اس سے لوگوں کو کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا بلکہ یہ تو ان کا پلس پوائنٹ بن گیا تھا کہ انہوں نے ایک ماڈل گرل کو عزت دی' گھر دیا۔ ملک فیروز خان نے اخبار میں خبر چھپتے ہی انہیں فون کیا تھا۔

''یہ اوچھے ہتھکنڈے ہیں چوہدری جہانداد۔''

''تم جانتے ہو فیروز خان جنگ اور محبت میں سب جائز ہوتا ہے۔''

''تمہیں اگر اس سیٹ سے اتنا ہی پیار تھا تو تم مجھے یوں ہی کہہ دیتے' میں تو پرانی دوستی کا خیال کر کے سیٹ چھوڑ دیتا۔ لیکن تم نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ بہت غلط ہے' اس لیے اب تم دیکھنا کہ جیت میری ہو گی۔ ابھی تم نے خود کہا نا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے تو پھر گلہ مت کرنا۔''

انہوں نے فون بند کر دیا تھا اور چوہدری جہانداد غصے سے بل کھا کر رہ گئے تھے۔

محبت اور جنگ میں سب جائز ہے' کہ مقولے پر وہ پورا یقین رکھتا تھا' تب ہی تو زہرہ جمال کو حاصل کرنے کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا اس نے' پہلی بار زہرہ جمال کو اس نے فیروز خان کے ساتھ ہی دیکھا تھا۔

''تمہاری ہونے والی بھابھی زہرہ۔''

ملک فیروز خان نے تعارف کروایا تھا اور اسے لگا تھا جیسے اس کا دل پہلو سے نکل کر زہرہ جمال کے قدموں میں جا گرا ہو۔ پھر زہرہ جمال کو اپنی طرف مائل کرنے اور ملک فیروز خان سے بدگمان کرنے کی کتنی ہی کوششیں کر ڈالی تھیں انہوں نے' لیکن ہر کوشش ناکام ہو گئی تھی اور ملک فیروز خان نے بہت دھوم دھام سے زہرہ جمال سے بیاہ کر لیا تھا اور وہ تلملا کر رہ گئے تھے۔ لیکن انہوں نے ان دونوں کو ایک دوسرے سے متنفر کرنے کی کوششیں جاری رکھی تھیں۔

کوئی بھی غیرت مند مرد یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کی بیوی دوسرے مردوں کے ساتھ انوالو ہو اور

وہ جانتے تھے کہ ملک فیروز خان کتنا غیرت مند ہے۔ ان کا بچپن کا ساتھ تھا۔ اگر زہرہ جمال بیچ میں نہ آتی تو شاید اب بھی وہ گہرے دوست ہوتے۔ لیکن حیرت کی بات تھی کہ ملک فیروز خان خاموش تھا۔

وہ بہت سوچ سوچ کر اپنے پتے چل رہے تھے اور اس خبر کے منتظر تھے کہ کب فیروز خان' زہرہ جمال کو طلاق دے اور وہ آگے بڑھ کر زہرہ جمال کے زخموں پر مرہم رکھ دیں۔ لیکن طلاق کے بجائے زہرہ جمال کی موت کی خبر نے ایک لمحے کو تو انہیں حیران کر دیا تھا اور یہ خیال بھی دل میں آیا تھا کہ کہیں غیرت میں ملک فیروز خان نے تو اپنی بیوی کو نہیں مار دیا۔ لیکن بعد میں اس خیال کو انہوں نے خود ہی رد کر دیا۔ اور پھر زہرہ جمال کی موت اپنی ماں کے گھر پر لاہور میں ہوئی تھی۔ اور ملک فیروز خان غالباً کراچی یا اپنے گاؤں میں تھا' اور انہوں نے خود زہرہ کی ماں کو فون کر کے اس کی موت کی تصدیق کی تھی۔ زہرہ جمال کی بہن نے فون پر بتایا تھا کہ یہ خبر سچ ہے۔ زہرہ کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

زہرہ نے مر کر انہیں جس شکست سے دوچار کر دیا تھا اس نے انہیں اور بھی غضب ناک بنا دیا تھا۔ پہلے ملک فیروز خان سے پارٹنر شپ ختم ہوئی پھر وہ ان کے حریف بن گئے۔ اور ہر مقام پر انہیں شکست سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ اگرچہ ملک فیروز کو سیاست سے کبھی دلچسپی نہ رہی تھی اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ اس ملک کی سیاست بہت گندی ہے اور انہیں گند میں ہاتھ ڈالنے کا کوئی شوق نہیں۔ ان جیسے لوگ اگر سیاست میں آئیں تو مارے جاتے ہیں لیکن اب وہ سیاست میں آ چکے تھے۔

اور ملک جہانداد کا خیال تھا کہ وہ محض انہیں شکست دینے کے خیال سے آئے ہیں۔ اور یہ بات ان کے کاغذات جمع ہونے کے بعد فون کر کے کہہ بھی دی تھی۔

''ایسا نہیں ہے جہانداد...... میرا مقصد ملک و قوم اور علاقے کے لیے کچھ کام کرنے کا ہے۔ پیسہ اور دولت پہلے بھی میرے پاس بہت ہے۔ میں اپنے علاقے کو ترقی دینا چاہتا ہوں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا ہائی اسکول' دستکاری سینٹر' ٹیکنیکل کالج۔ میرے ذہن میں بہت سے منصوبے ہیں۔''

''تمہارا خیال ہے میں نے علاقے کے لیے کچھ نہیں کیا؟''

''میں نے ایسا کچھ نہیں کہا جہانداد! اپنی اپنی اپروچ کی بات ہوتی ہے۔ تمہاری سوچ اور میری سوچ میں فرق ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرا خیال تھا اور ہے کہ ہمارے ملک میں سیاست بہت بری چیز ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں اگر کچھ تعمیری سوچ رکھنے والے لوگ سیاست میں آ جائیں تو بہت کچھ بہتر کیا جا سکتا ہے۔ تم اور میں مل کر بھی بہت کچھ کر سکتے ہیں۔''

لیکن ملک فیروز خان کی بات ان کے سر سے گزر گئی تھی اور انہوں نے الیکشن میں کامیابی کو

زندگی اور موت کا مسئلہ بنالیا تھا اور نتیجہ...... انہوں نے اپنے سامنے بیٹھے کاظم کو دیکھا جو خاموش بیٹھا اندر ہی اندر امثل کو قابو کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ اس لڑکی نے اس کی راتوں کی نیند حرام کر رکھی تھی۔

''جو زہر سے نہ مرے اسے گڑ سے مارتے ہیں ڈیڈ! آپ ملک فیروز سے دوستی کرلیں اور اس کی جڑوں کو کاٹیں۔''

کاظم نے مشورہ دیا' گو اس کا اپنا ذہن الجھا ہوا تھا لیکن پھر بھی اس نے جہانداد کو مشورہ دیا تو لمحہ بھر سوچنے کے بعد چودھری جہانداد کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''کیا خیال ہے اس دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہوئے اس کی بیٹی کا رشتہ نہ مانگ لوں تمہارے لیے۔''

''بیٹی کا رشتہ؟ ڈیڈ! میں نے کہا تھا کہ میں ابھی یہ زنجیر پاؤں میں ڈالنا نہیں چاہتا۔''

''تو میں کب کہہ رہا ہوں کہ اسے زنجیر بناؤ' بس بیوی بنا کر گھر لے آؤ۔''

''ٹھیک ہے ڈیڈ!'' اس نے بے زاری سے کہا اور سوچنے لگا۔

''پڑی رہے گی گھر پر اور جب...... اچھا ہے۔'' یک دم اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا۔

''مفت میں بیوی کا ساتھ مل جائے گا اور یہ کمبخت تھرڈ کلاس لڑکیاں جیبیں خالی کروالیتی ہیں۔''

''کیا انکل فیروز مان جائیں گے؟''

''منالوں گا' آخر پرانا یار ہے۔'' چوہدری جہانداد مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مسکرائے۔

''صحیح معنوں میں اب اس کے بال آئیں گے میرے پاؤں تلے۔''

انہوں نے چٹکی بجائی۔

''ویری گڈ آئیڈیا' میں بہت جلد تمہاری ماں کے ساتھ جاتا ہوں ملک فیروز خان سے ملنے اور تمہاری ماں کی بہت عزت کرتا ہے وہ' اس کی بات نہ ٹال سکے گا۔ برابری کا رشتہ ہے۔ خاندان برادری سب برابری کے۔''

''او کے ڈیڈ!'' کاظم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے بھی سوچا تھا کہ وہ امثل کو اپنی محبت سے رام کرنے کی کوشش کرے گا۔ حتیٰ کہ مرنے کی دھمکی بھی دے دے گا۔ وہ دل ہی دل میں منصوبے بناتے ہوئے گاڑی کی چابی اٹھا کر باہر نکل گیا اور چوہدری جہانداد وہیں ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے اپنی مونچھوں کو بل دیتے رہے۔

❖❖❖

مسز فاروق گہری نیند سو رہی تھیں اور امثل ان کے بیڈ کے قریب ہی کرسی پر بیٹھی انہیں بغور دیکھ رہی تھی۔ ان کی آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے تھے اور چہرے کی رنگت میں بھی وہ اجلا پن

نہیں رہا تھا۔ بیماری بہرحال ان پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ گو بہت دنوں سے انہیں تکلیف نہیں ہوئی تھی اور یورین بھی صحیح پاس ہو رہا تھا۔ انہیں دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اگر ماما کو پتا چل جائے میری اس حرکت کا تو شاید زندگی بھر وہ مجھ سے بات نہ کریں۔ اور شکر ہے فریدوں نے بھی ماما کو کچھ نہیں بتایا۔''

گو کہ اس کا موڈ ابھی تک خراب تھا۔

اس روز آفس سے واپسی پر وہ فریدوں کے ساتھ ہی آئی تھی' اپنی مخصوص جگہ پر گاڑی پارک کیے وہ کھڑا تھا۔

''کاظم جہانداد!'' مارے خوف کے اس نے فریدوں کا ہاتھ تھام لیا۔ فریدوں نے مڑ کر سفید کرولا کو دیکھا اور اس کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے پارکنگ کی طرف بڑھا۔

''یہ...... یہ ادھر کہاں جا رہے ہو فریدوں؟'' وہ خوف سے پیلی پڑ گئی۔

''ادھر وہ خوشخبری ہے جو میں تمہیں دینا چاہ رہا تھا لیکن......'' وہ ایک نئی سوزوکی کار کے سامنے کھڑا تھا۔

''تم نے گاڑی لے لی۔ بہت مبارک ہو۔'' اسے بے حد خوشی ہوئی لیکن پھر فوراً ہی اس کی نگاہ کرولا کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے کاظم پر پڑی تو جیسے خوف سے اس کا رنگ نچڑ گیا۔

''ڈرو مت۔'' فریدوں نے اسے تسلی دی۔

''یوں تو میں ابھی اسی وقت اس امیر زادے کو سبق سکھا سکتا ہوں لیکن مجھے پہلے اصل بات تو معلوم ہو کہ تم اس سے اتنی خوف زدہ کیوں ہو۔'' اور جب گھر آ کر اس نے سب کچھ فریدوں کو بتا دیا تو کتنی ہی دیر تک وہ حیرت سے اسے دیکھتا رہا۔

''تم...... امثل تم......'' اور پھر یکدم ہی اس کا رنگ سرخ ہو گیا۔

''بہت خوب امثل فاروق...... ویل ڈن! تم نے کیا زندگی کو جاسوسی کہانی سمجھ لیا تھا اور تم بہت بڑی اور ماہر بلیک میلر بننے جا رہی تھیں...... کیا کہنے۔'' وہ ہنسا۔

''کیا سمجھ کر تم نے ایسا کیا امثل فاروق! کیا تم کسی کہانی کا کردار تھیں یا کوئی ڈرامہ ایکٹ کر رہی تھیں۔ کیا عام زندگی میں اوسط گھرانے کی لڑکیاں یہ حرکت کر سکتی ہیں؟'' وہ سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔

''میں دراصل مما......'' وہ بات ادھوری چھوڑ کر زیادہ شدت سے رونے لگی تھی۔

''دل تو چاہتا ہے تمہاری اس حرکت پر تمہیں شوٹ کر دوں یا پھر ہمیشہ کے لیے تمہاری زندگی سے نکل جاؤں۔''

''نہیں' پلیز فریدوں! ایسا مت کہو۔'' اس نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''جو لڑکی آج یہ حرکت کر سکتی ہے' وہ کل اس سے بھی بڑی حرکت کر سکتی ہے۔ کیا خبر کل تم

مجھے ہی بلیک میل کرنے لگو۔ ایک بلیک میلر بیوی سے تو بہتر ہے کہ میں ساری زندگی شادی ہی نہ کروں۔"

"فریدوں! پلیز ایسا مت کرنا ورنہ میں مر جاؤں گی۔"

"لیکن......" فریدوں نے جیسے اس کی التجا کی پروا ہی نہ کی۔

"ایک چیز ہے جو مجھے انتہائی قدم اٹھانے سے روک رہی ہے امثل! اور وہ ہے اس منصوبے کے پیچھے چھپا تمہارا مقصد۔ احمق لڑکی! کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ کیا کبھی میں نے تمہارے مسائل کو خود سے الگ سمجھا؟"

وہ تھک کر چپ ہو گیا تھا' نہ اس نے اسے خاموش کرایا تھا نہ مزید کوئی بات کی۔ امثل یوں ہی سر جھکائے روتی رہی۔

"اب رونا دھونا بند کرو۔"

اس کا لہجہ ابھی تک تپا ہوا تھا۔

"آنٹی جاگ جائیں گی۔" وہ دونوں اس وقت گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مسز فاروق دوا کے زیر اثر سو رہی تھیں اور ہمایوں ان کے آتے ہی اجازت لے کر پڑوس میں طاہر کی طرف چلا گیا تھا۔

"اب کیا ہوگا فریدوں!" اس نے آنسو پونچھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

"ہونا کیا ہے ایک عدد کرائے کا قاتل ابھی وہ دوسرے صاحب بھی بھیج دیں گے۔ بھلا جس شخص نے اپنی بیوی کو قتل کروا دیا اس کے لیے تمہیں قتل کروانا کیا مشکل ہے۔"

"پلیز فریدوں! مجھے ڈراؤ مت۔"

"اچھا تو آپ ڈرتی بھی ہیں۔ اتنا جرأت مندانہ کام جو آپ نے کیا وہ یا تو فلموں میں ہوتا ہے یا کہانیوں میں' پھر بھی آپ کہہ رہی ہیں آپ کو ڈر لگتا ہے۔" اس کا لہجہ طنز برساتا ہوا تھا۔

"غلطی ہوگئی۔ بس مجھے یہی سمجھ میں آیا تھا تب۔ اور دیکھو اگر مجھے مار دیا گیا تو پلیز میرے بعد ماما کا اور ہومی کا خیال رکھنا' انہیں اکیلا مت چھوڑنا۔"

آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے تھے۔ اور فریدوں کا دل پسیج گیا۔ یہ صحیح تھا کہ اس نے بہت بڑی غلطی کی تھی' لیکن یہ بھی اس کے حد سے بڑھے ہوئے خلوص اور محبت کی وجہ سے تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے' اب جا کر چائے بنا کر لاؤ۔" وہ جلدی سے اٹھ کر چائے بنانے چل دی۔

اور پھر اس دن کے بعد سے فریدوں چھٹی کے وقت اسے اپنی گاڑی میں ڈراپ کرنے لگا تھا۔ اس دوران کاظم جہانداد نے دو تین بار آفس فون بھی کیا تھا۔ ہر بار اس کے بجائے فریدوں فون اٹینڈ کرنے گیا تھا اور اس نے کاظم سے کہا تھا کہ جو کہنا ہے اسے بتا دے اور کاظم نے تلملا کر فون رکھ دیا تھا۔

آج فریدوں کو کسی کام کے لیے اسلام آباد جانا تھا' اس لیے اس نے امثل کو آفس جانے سے منع کر دیا تھا۔ اور اس وقت وہ ماما کے کمرے میں ہی بیٹھی مسلسل سوچ رہی تھی کہ اس مسئلے کا کوئی مستقل حل ہونا چاہیے۔ فریدوں کب تک یہ ڈیوٹی دیتا رہے گا اور پھر اسے آفس کے علاوہ بھی تو کسی کام سے نکلنا ہوتا تھا۔ ماما کی دوائیاں ختم ہو رہی تھیں۔ ہومی کا یونیفارم خاصا پرانا ہو رہا تھا اور وہ نئے جوگرز کے لیے بھی کہہ رہا تھا۔ فریدوں نے تو لالہ تک سے اس مسئلے کو ڈسکس نہیں کیا تھا اور اسے بھی سختی سے منع کر دیا تھا۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں امثل! اور پھر تمہیں بچپن سے جانتا ہوں۔ محبت میں آدمی محبوب کی بڑی سے بڑی غلطی معاف کر دیتا ہے لیکن میں گھر کے ہر فرد کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ لالہ بھی تمہاری دوست ہے۔ ہوسکتا ہے وہ بھی اسے اگنور کر دے۔ آپا اور اماں گو تم سے بے حد محبت کرتی ہیں لیکن پھر بھی وہ روایتی سوچ رکھتی ہیں۔ ہم انسانوں سے فرشتہ بننے کی توقع نہیں کر سکتے۔"

"باجی...... باجی......"

ٹی وی لاؤنج میں بیٹھ کر ہوم ورک کرتا ہوا ہمایوں قلم ہاتھ میں لیے کمرے میں آیا تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"باجی! وہ تھا نا میرا دوست سعدون!" جس نے اسکول چھوڑ دیا تھا۔

"وہ اسلام آباد چلا گیا ہے' اس کے بابا نے اسے وہاں کے اسکول میں داخل کروا دیا ہے۔"

"اچھا" امثل نے بے دھیانی سے اسے دیکھا۔

"اس نے مجھے ای میل بھیجی ہے' ظاہر ہے کہ کمپیوٹر پر۔ باجی! مجھے بھی کمپیوٹر لے دیں نا۔"

"لے دوں گی۔ اگر تم نے میٹرک میں ۸۵ مارکس لیے تو۔"

"میٹرک میں تو ابھی پورے تین سال پڑے ہیں۔"

"تو بس تین سال تم دل لگا کر پڑھو۔" امثل نے محبت سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"اور ہاں' تمہارے دوست نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں بس اپنا ای میل ایڈریس بھیجا ہے اور لکھا ہے کہ وہ وہاں بہت محنت کر رہا ہے اور سر تنویر اسے بہت یاد آتے ہیں۔"

"لیکن سر تنویر تو اچھے آدمی نہیں تھے جانو!"

"ہاں مگر۔" وہ جھجکا۔

"سب کہتے ہیں اس کے بابا نے خوامخواہ ہی سر تنویر پر الزام لگایا۔ قصور ان کے اپنے بچے کا تھا' ہوسکتا ہے نوکروں وغیرہ نے اسے نشے کا عادی بنا دیا۔ دراصل اس کے بابا جان جو ہیں نا وہ

اسمبلی کے ممبر ہیں۔ بہت بڑے آدمی ہیں وہ۔ ان کی تصویر بھی آئی تھی اخبار میں اور پرنسپل کہہ رہے تھے کہ جو بڑے لوگ ہوتے ہیں اپنی غلطیاں دوسروں پر ڈال دیتے ہیں۔ سر تنویر مخلص کے بہت اچھے استاد تھے۔''

''نہیں ہمایوں! ایسا نہیں ہے۔ سعدون کے بابا جان نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔''

''ان کا نام ملک فیروز خان ہے۔'' ہمایوں نے بتایا۔

''کیا مطلب فیروز خان اسمبلی کے ممبر؟'' وہ چونکی۔

''آپ جانتی ہیں ان کو؟''

''نہیں تو' بس اخبار میں نام پڑھتی رہتی ہوں۔''

''تو سعدون ملک فیروز خان کا بیٹا ہے۔'' وہ حیرت میں گھری تھی۔

''سعدون بھی کہتا ہے اس کے بابا جان نے خوامخواہ ہی سر تنویر کا تبادلہ کروایا۔''

مسز فاروق یکدم اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ وہ آنکھیں موندے ہمایوں اور امثل کی باتیں سن رہی تھیں۔ امثل نے ان کی طرف دیکھا' ان کا چہرہ جو ابھی کچھ دیر پہلے تک بے حد زرد تھا' اب اس پر ہلکی سی سرخی چھائی ہوئی تھی۔

''کیا...... ابھی کیا کہہ رہے تھے ہومی تم...... کس کا ذکر تھا؟''

''کچھ نہیں ماما! یہ اپنے دوست سعدون کی بات کر رہا تھا۔'' امثل نے ان کی طرف دیکھا۔

''وہ ہمایوں سے دو سال سینئر ہے لیکن یہ اسے اپنا دوست کہتا ہے۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔

''ابھی تم نے اس کے بابا جان کا کیا نام بتایا تھا؟''

''ملک فیروز خان۔''

''اچھا تو اپنے دوست کو کسی دن گھر لاؤ نا ہومی؟''

''لیکن ماما! وہ تو چلا گیا اسلام آباد۔'' مسز فاروق خاموش بیٹھی ہمایوں کی طرف دیکھتی رہیں۔

''ماما! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے نا؟''

''ہاں۔''

وہ مسکرائیں لیکن آنکھوں میں نمی تھی اور دل اندر کسی بسمل کی طرح تڑپ رہا تھا۔

''لیکن آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی مجھے۔ فریدوں آ جائے تو آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے ہیں۔'' تب ہی فون کی بیل ہوئی۔ امثل اٹھ کر لاؤنج میں آئی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو جان من!'' دوسری طرف کاظم جہانداد کی آواز سن کر ریسیور اس کے ہاتھوں میں کانپنے لگا اور رخساروں پر زردی چھا گئی۔

''ہم تو تمہارے عشق میں خوار ہو رہے ہیں اور تم اس لم ڈھینگ کے ساتھ عیش کر رہی ہو۔ وہ بھلا تمہیں کیا دے گا گریڈ ۱۹ کا آفیسر۔ ہم تمہیں سونے چاندی سے لاد دیں گے ڈیر!''

اس کا لہجہ انتہائی عامیانہ تھا۔ وہ ساکت کھڑی تھی۔ گھر کا فون نمبر اگر کاظم کو مل گیا تھا تو گھر تک پہنچنا کون سا مشکل تھا۔ اک ذرا سی جلد بازی اور غلطی کا خمیازہ اسے پتا نہیں کب تک بھگتنا تھا۔

''سنو۔'' یکا یک اس کا لہجہ بدل گیا۔

''تم مجھے پسند آ گئی ہو لڑکی' اور کاظم چوہدری کو جو پسند آ جائے وہ پھر اسے حاصل کیے بغیر نہیں رہتا۔ یاد رکھنا' تمہارا وہ نام نہاد منگیتر بھی کچھ نہ کر سکے گا۔ بہتر تو یہ ہے کہ اپنی مرضی سے کچھ وقت دے دو ورنہ......''

اور اس کا پورا وجود لرزنے لگا تھا۔ ریسیور کریڈل پر ڈال کر وہ وہیں بے جان سی ہو کر کرسی پر ڈھے گئی۔

اور اندر کمرے میں مسز فاروق بہت اشتیاق سے ہمایوں سے سعدون کے متعلق پوچھ رہی تھیں۔

◈◈◈

''تو تم اس خود سر ہو گئی ہو ثمین! کہ تمہیں اپنے بابا کی عزت کا خیال بھی نہیں رہا' کوئی بات ہو جاتی تو کیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل تھا؟''

ملک فیروز خان کمرے میں ادھر ادھر بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ درثمین سر جھکائے ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار گھر سے اکیلی نکلی تھی۔ عباس بچپن سے ہی اُس کا اور سعدون کا سایہ بنا رہا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ اسکول یا کالج جاتے ہوئے بھی عموماً وہ ساتھ ہوتا تھا۔ حالانکہ ڈرائیور بھی پرانا آدمی تھا لیکن ملک فیروز خان سوائے عباس کے کسی پر اعتبار نہ کرتے تھے۔

جب وہ کراچی ایئر پورٹ پر اتری تھی تو ایک لمحے کو اسے خیال آیا تھا کہ یہ اس نے کیا کیا۔ بابا جان کا رویہ کوئی نئی بات تو نہیں تھی۔ پھر کیا وہ عباس کے رویے سے ہرٹ ہوئی تھی؟ کوئی بھی بات تھی لیکن اس وقت وہ کراچی ایئر پورٹ پر کھڑی تھی اکیلی اور تنہا۔ اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ باہر آ کر اس نے ٹیکسی ڈرائیور کو ''قصر زہرہ'' کا پتہ بتایا۔ اس کا وہ ازلی اعتماد اور کانفیڈنس ایک دم عود کر آیا تھا۔ ڈرائیور نے ایک بار مڑ کر پیچھے دیکھا اور پھر خاموشی سے گاڑی ''قصر زہرہ'' کے گیٹ کے پاس لا کر روک دی تھی۔ چوکیدار حاکم خان اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''آپ چھوٹی بی بی! اکیلے؟ عباس صاحب یا بڑے صاحب نہیں آئے؟''

''نہیں۔''

''قصرِ زہرہ'' ایسا ہی تھا جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ ویسا ہی شاندار۔ لان میں گھاس تازہ تازہ لگائی گئی تھی۔ فوارے کا پانی تالاب میں گر رہا تھا۔ وہاں چوکیدار کے علاوہ خانو بابا اس کی بیوی اور بیٹی ریشم بھی موجود تھیں۔ ریشم سے اس کی بہت بنتی تھی۔ ''قصرِ زہرہ'' کی دیکھ بھال ان کے ذمہ تھی۔ ریشم اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھی۔

''میرا کمرہ کھول دو۔''

''بالکل صاف ستھرا ہے' کل ہی صفائی کی تھی۔''

''اور باقی لوگ؟'' خانو کی بیوی متجسس ہو رہی تھی۔

''بابا ایک دو روز تک آئیں گے۔''

''لیکن ہفتہ بھر پہلے ان کا فون آیا تھا انہوں نے آپ کے آنے کا بتایا ہی نہیں؟''

''بس اچانک پروگرام بن گیا۔ کچھ کھانے کے لیے ہے تو لاؤ' اتنے میں میں شاور لے لوں۔'' پھر کچھ سوچ کر اس نے پرس رقم نکال کر اسے دی۔

''خانو بابا کو دے دو۔ گوشت' ڈبل روٹی اور جس جس چیز کی ضرورت ہے لے آئیں۔''

وہ آنے کو تو آ گئی تھی لیکن ابھی اس کے ذہن میں کچھ نہیں تھا کہ وہ یہاں اکیلے کیسے رہے گی۔ شاور لے کر آئی تو ایک نئی فکر سر پر سوار ہو گئی۔

''عباس مل سے آ گیا ہوگا اور اسے نہ پا کر کتنا پریشان ہوا ہوگا۔ شاید اس نے بابا کو بھی اطلاع دے دی ہو اور تائی فاطمہ...... انہوں نے جانے کیا کیا سوچ ڈالا ہوگا۔''

''اف یہ میں نے کیا کیا۔'' اس نے یکدم ہی لاہور کا نمبر ملایا۔ فون تائی فاطمہ نے ریسیو کیا تھا۔

''تائی! میں در ثمین ہوں۔''

''ارے بیٹا! کہاں ہو' کس جگہ ہو؟ بغیر بتائے چلی گئیں۔ عباس جب سے آیا ہے پاگلوں کی طرح اندر باہر پھر رہا ہے۔'' تائی فاطمہ ایک ہی سانس میں کہہ گئیں۔

''تائی......'' اس کی آواز بھرا گئی۔

''میری کسی کو ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی مجھ سے کسی کو محبت ہے اور نہ ہی پروا' اس لیے میں یہاں آ گئی ہوں' کراچی ''قصرِ زہرہ'' میں۔''

''عباس...... عباس......'' تائی فاطمہ نے جلدی سے عباس کو بلایا۔

''در ثمین بیٹی کا فون آ گیا ہے' ارے ادھر آؤ۔''

''تائی! مجھے کسی سے بات نہیں کرنا۔''

''نہ بیٹا'' اور پھر اسی لمحے عباس نے تائی سے فون جھپٹ لیا تھا۔

''در ثمین! یہ کیا حماقت ہے' کہاں ہیں آپ؟''

''یہ حماقت نہیں ہے اور مجھے گھر نہیں آنا' اس لیے کہ میری کسی کو ضرورت نہیں ہے اور فون بھی میں نے اس لیے کیا ہے کہ آپ مجھے ادھر ادھر نہ تلاشتے پھریں۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کیا کہہ رہی تھی وہ؟''

وہ نڈھال سا تائی کے سامنے بیٹھ گیا۔ ان تین چار گھنٹوں میں جب سے وہ مل سے آیا تھا' اس کا آدھا خون جل چکا تھا۔

''کہاں سے بول رہی تھی؟''

''کہہ رہی تھی' کراچی میں ہوں اپنے گھر میں' ارے میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔''

عباس نے سی ایل آئی پر چیک کیا تو ''قصرِ زہرہ'' کا ہی نمبر تھا۔ یقیناً بائے ایئر گئی ہوگی۔''

وہ تائی فاطمہ اور عباس کو اطلاع دے کر خاصی مطمئن ہو گئی تھی اور ایئر پورٹ پر قدم رکھتے ہی جو اضطراب سا تھا' وہ ختم ہو گیا تھا۔ وہ ہر طرف گھومتی پھری۔ بابا جان کے بیڈ روم میں کتنی ہی دیر تک دیواروں پر لگی ان کی شادی کی تصویریں دیکھتی رہی۔

''اگر آپ زندہ ہوتیں تو شاید سب کچھ مختلف ہوتا' اور کیا تھا اگر آپ کو کچھ نہ ہوتا تو اس دنیا میں کون سی قیامت آ جانا تھی۔'' وہ زہرہ جمال کی تصویر کے سامنے کھڑی کتنی ہی دیر تک اسے دیکھتی رہی۔

ماں کا وجود کتنی بڑی نعمت ہے' اس کے دم سے زندگی میں کیسا چھاؤں کا احساس ہوتا ہے اور وہ نہ ہو تو ایسا لگتا ہے جیسے تپتی سڑک پر ننگے پاؤں کھڑے ہوں۔ دبیز قالین پر کھڑے کھڑے اس کے پاؤں جلنے لگے تھے۔

''آئی لو یو مدر...... آئی لو یو......''

وہ وہیں قالین پر بیٹھ گئی اور آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔

عباس نے ملک صاحب کو فون کر کے اس کے متعلق بتا دیا تھا اور پھر ان کے حکم پر وہ اگلی صبح ہی تائی فاطمہ کے ساتھ ''قصرِ زہرہ'' پہنچ گیا۔ عباس کو دیکھ کر اس نے برا سا منہ بنایا۔

''آپ کو تو بنکاک جانا تھا' یہاں کیا کرنے آئے ہیں؟''

''ملک صاحب نے میرا ٹور کینسل کر دیا۔''

''پھر وہیں رہتے' یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔''

عباس نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا' البتہ اسے سمجھانے لگا کہ اس کا یہ اقدام کتنا غلط ہے اور ملک صاحب کو اس بات پر کس قدر غصہ ہے۔

''تو آپ نے ان کو بھی اطلاع دے دی؟''

''یہ میرا فرض تھا۔''

"تو پھر آپ فرض نبھائیں۔"

وہ غصے سے اٹھ کر چلی گئی۔ لیکن تائی فاطمہ کے وقتاً فوقتاً سمجھانے پر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ دل ہی دل میں شرمندہ تھی۔ بابا جان کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی اسے شدید ندامت ہونے لگتی تھی۔ عباس "قصرِ زہرہ" میں بدستور ٹھہرا ہوا تھا۔

"مجھے ملک صاحب کے آنے تک یہیں ٹھہرنا ہے۔" وہ اس کی چڑچڑاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔

"تو کیا بابا جان یہاں آ رہے ہیں؟"

"لیکن وہ تو ایک ماہ کے لیے گئے تھے؟"

"آپ نے جس عقل مندی کا مظاہرہ کیا ہے' اس کے بعد وہ وہاں کیسے ٹھہر سکتے ہیں۔"

"میری چھٹیاں ختم ہو چکی ہیں اور مجھے کالج بھی جانا ہے۔ لاہور چلیں۔"

"لیکن آپ تو ہمیشہ کے لیے لاہور چھوڑ کر یہاں آ گئی تھیں۔"

"میری پڑھائی کا حرج ہو رہا ہے عباس!"

"یہ تو آپ کو پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ اب تو ملک صاحب نے کہا ہے ان کے آنے تک آپ یہیں رہیں "قصرِ زہرہ" میں۔"

عباس بہت سکون سے سارا دن فارغ بیٹھا خانو بابا' تائی فاطمہ' حاکم سے گپ شپ لڑاتا رہتا اور ثمین کا سکون غارت ہو گیا تھا' وہ اس لمحے کو کوستی جب اس کے دماغ میں یہ فتور سمایا تھا۔ ملک فیروز خان نے کبھی اسے ڈانٹا نہیں تھا' حتیٰ کہ کبھی اونچی آواز میں بات تک نہ کی تھی۔

"اور اب پتا نہیں اس حرکت پر بابا جان کا کیا ردِعمل ہو۔" وہ خوفزدہ تھی لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ بابا جان اتنا بڑا فیصلہ کر لیں گے۔

"اور اگر وہ ٹیکسی ڈرائیور تمہیں "قصرِ زہرہ" لانے کے بجائے کہیں اور لے جاتا تو جانتی ہو اس کا انجام۔"

چلتے چلتے رک کر انہوں نے ایک غصیلی نظر اس پر ڈالی۔

"تمہیں دنیا کا پتا ہے؟ جانتی ہو کچھ کہ اکیلی لڑکی جب گھر سے باہر نکلتی ہے تو یہ دنیا منہ پھاڑے اسے نگلنے کو تیار بیٹھی ہوتی ہے۔ جانے میں نے کیا نیکی کی تھی کہ تم صحیح سلامت اس وقت میرے سامنے بیٹھی ہو۔"

"سوری بابا جان!" اس کا سر اور جھک گیا۔ نیلی کانچ سی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

"اگر میں نے تمہیں ہاسٹل بھجوایا تھا تو اس کی بھی وجہ تھی کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اکیلے گھر میں نوکروں کی موجودگی میں تم سارا دن اکیلی رہو' گو سارے ملازم پرانے ہیں لیکن آج کل تو بندہ اپنے سائے پر بھی اعتبار نہیں کر سکتا۔ لیکن تم۔" بالآخر تھک کر وہ صوفے پر بیٹھ گئے۔

"میں نے سوچا ہے کہ لاہور واپس جاتے ہی تمہاری شادی کر دوں۔" اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"ایک دو رشتے ہیں بلکہ تائی فاطمہ کے سوتیلے بیٹے چوہدری حیدر کب سے اپنے بیٹے کے لیے کہہ رہے تھے لیکن میری خواہش تھی کہ کوئی تعلیم یافتہ لڑکا ہو اور تم بھی کچھ تعلیم حاصل کر لو' لیکن ثمین! تم نے میرے خوابوں کو ملیامیٹ کر دیا۔"

"نہیں' پلیز بابا جان نہیں۔ ایسا مت کیجیے۔ مجھے اپنے سے جدا نہ کریں' میں ابھی آپ کے پاس رہنا چاہتی ہوں' پڑھنا چاہتی ہوں۔ پلیز بابا جان۔"

آنسو تیزی سے اس کے رخساروں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ ملک فیروز خان نے ایک نظر اس پر ڈالی اور تیزی سے باہر نکل گئے۔

"عباس!"

انہوں نے لاؤنج میں بیٹھے عباس کو آواز دی۔

"لاہور کے لیے سیٹیں بک کروا لو۔"

"جی بہتر۔"

عباس فون اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ اندر وہ تڑپ تڑپ کر رو رہی تھی۔

"اتنی بڑی سزا۔ نہیں' پلیز اتنی بڑی سزا مت دیجیے بابا جان۔"

ملک فیروز خان اپنے بیڈروم میں چلے گئے تھے اور عباس بے چین سا لاؤنج میں بیٹھا اس کے رونے کی آواز سن رہا تھا۔

❖❖❖

کاظم چوہدری اپنے بیڈ پر اوندھا لیٹا موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ دوسری طرف غالباً کوئی لڑکی تھی اور گفتگو خاصی رومینٹک ہو رہی تھی کہ دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ پر اس نے یکدم موبائل بند کیا اور دروازے کی طرف دیکھا۔ چوہدری جہانداد مونچھوں کو بل دیتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔

"اوہ ڈیڈ! آپ؟" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کیا ہو رہا ہے؟"

"کچھ نہیں' یوں ہی لیٹا تھا۔"

"آپ سنائیں' خیریت ہے؟"

"خیریت ہی خیریت ہے پتر کاظم! میں اور تمہاری ماں جب گئے ملک فیروز خان کی کوٹھی پر تو ایک لمحے کو تو وہ حیران رہ گیا۔ پھر جب میں نے کہا' یار فیروز! میں دوستی کا ہاتھ بڑھانے آیا ہوں تیری طرف۔ پرانی باتیں بھول جا۔ آدمی ہوں نا' اور آدمی تو لالچی ہوتا ہے۔ بس میں بھی

لالچ میں آ گیا تھا۔“

”پھر ملک فیروز خان نے کیا کہا؟“ کاظم نے دلچسپی سے پوچھا۔

”ارے کہنا کیا تھا‘ جب تیری ماں نے بھی کہا کہ بھائی فیروز میں نے تو تمہیں بھائی کہا تھا‘ آج بھی بھائی ہی سمجھتی ہوں‘ تم دونوں بھائیوں کے درمیان اگر کوئی رنجش تھی تو تم جانو۔ فیروز خان نرم دل آدمی ہے‘ پگھل گیا اور پھر تیری ماں کو بہن کہا تھا اس نے اور بہن ہی سمجھتا تھا۔ بس پھر تیری ماں نے جھولی پھیلا دی۔ وہ تو ہاں کروا کے ہی اٹھتی لیکن میں نے سمجھایا کہ ملک کی بیٹی ہے‘ اسے اچھی طرح سے سوچنے دے۔ تیری کوالیفکیشن سے خاصا متاثر تھا ملک...... پڑھا لکھا آدمی ہے‘ پڑھے لکھوں کی قدر کرتا ہے۔“

”یعنی سو فیصد امید ہے۔“ کاظم چوہدری مسکرایا۔

”میں نے بھی وہ وہ باتیں کہیں کہ ملک حیران ہوتا رہ گیا۔ بس پھر جو ماضی کی باتیں شروع ہوئیں تو ایک بار تو میں نے بھی سوچا کہ خوامخواہ کی دشمنی مول لے لی تھی‘ اچھی خاصی دوستی تھی۔“

تب ہی اعظم نے کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

”آپ یہاں ہیں‘ میں اسلام آباد جا رہا تھا۔“

”اچھا اچھا‘ چھٹیاں ختم ہو گئیں تیری؟“

”جی!“ وہ اندر چلا آیا۔

”اماں نے بتایا ہے کہ آپ ملک فیروز خان کی طرف گئے تھے کاظم کے رشتے کے لیے؟“

”کیوں‘ تجھے کوئی اعتراض ہے؟“ چوہدری جہانداد نے اعظم کی طرف دیکھا۔

”نہیں ابا جان! بھلا مجھے کیوں اعتراض ہوگا بلکہ مجھے تو بہت خوشی ہوئی ہے کہ دشمنی ختم کرنے کے لیے پہلا قدم آپ نے اٹھایا ہے۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“

”بلکہ بہت ہی اچھی بات ہے۔“

چوہدری جہانداد نے قہقہہ لگایا تو اعظم نے حیرانی سے انہیں دیکھا‘ وہ ان کی بات سمجھ نہ سکا تھا۔

”تیری ماں کدھر ہے؟“ چوہدری جہانداد نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

”کچن میں ہوں گی‘ کھانا بنوا رہی ہیں۔“

”میں ذرا کہوں اس سے‘ دو چار بار فون کھڑکائے ملک فیروز کو۔“ چوہدری جہانداد باہر چلے گئے تو اعظم نے بھائی کی طرف دیکھا۔

”کاظم! مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔“

”کیا؟“ کاظم نے بھنویں اچکائیں۔

”پلیز ذرا تحمل سے میری بات سننا۔ میرے ایک دوست نے شکایت کی ہے تمہاری کہ تم

اس کی کزن کو تنگ کر رہے ہو۔“

”کون دوست اور کون سی کزن؟“

”فریدوں نام ہے میرے دوست کا۔ ہم نے ایک ہی کالج میں پڑھا ہے‘ وہ مجھ سے سینئر تھا لیکن ہم میں بہت دوستی تھی‘ وہ میرے پاس اسلام آباد آیا تھا کہ میں تمہیں سمجھاؤں۔ اس کی کزن کا نام امثل ہے۔“

اچھا تو تم مجھے سمجھانے آئے ہو۔“ کاظم نے قہقہہ لگایا۔

”آنا تو تھا ہی مجھے چھٹیوں میں۔“ اعظم سنجیدہ تھا۔

”وہ بے حد شریف لوگ ہیں۔ تم اس کی کزن کا پیچھا چھوڑ دو۔“

”تم نے دیکھا ہے اس کی کزن کو؟“

”نہیں۔“

”تو پھر مت سمجھاؤ مجھے‘ وہ چھوڑنے والی چیز نہیں ہے۔“ کاظم نے آنکھ ماری تو اعظم کا رنگ سرخ پڑ گیا۔

”کاظم وہ بہت شریف لوگ ہیں۔ تمہیں اپنے مطلب کی لڑکیاں مل جاتی ہیں پھر۔“

”اور اس شریف لڑکی نے کیا کیا تھا‘ تمہارے ان فریدوں صاحب نے نہیں بتایا؟“

”بتایا ہے۔“

”فریدوں اس پر بہت شرمندہ تھا لیکن اس کی کزن امثل اپنی ماما کی وجہ سے بہت پریشان تھی اور ان کے علاج کے لیے اسے پیسوں کی ضرورت تھی‘ تب ہی اس سے یہ حماقت ہو گئی۔“

”تو...... میں تیار ہوں نا اس کی ماما کے علاج کے لیے پیسے دینے کو‘ فریدوں سے کہو ایک رات کے لیے اسے میرے حوالے کر دے۔“ اعظم یک دم غصے سے کھڑا ہو گیا۔

”کاظم تم اس حد تک گر چکے ہو؟“

”شٹ اپ۔“ کاظم غصے سے چلایا۔

”دیکھو‘ تم اس کا پیچھا چھوڑ دو۔“

”اور اگر پیچھا نہ چھوڑا تو۔“ کاظم نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ”تو تم قتل کر دو گے مجھے؟“

”یہ وقت آنے پر تمہیں پتا چلے گا۔“ اعظم باہر چلا گیا تو غصے سے کاظم نے ہوا میں مکا گھمایا پھر موبائل اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔

”ہیلو مس امثل!“ امثل کی آواز سنتے ہی وہ چہکا۔

”تو کب مل رہی ہیں آپ مجھ سے؟“

امثل نے جانے کیا کہا کہ اس نے زوردار قہقہہ لگایا۔

”کاظم چوہدری اپنا شکار یونہی نہیں چھوڑتا‘ اور اپنے لم ڈھینگ کو سمجھا دو کہ سفارشیں نہ بھیجے

میری طرف۔ اسے کہنا اپنی زندگی عزیز نہیں کیا اسے؟"

دوسری طرف ریسیور غالباً رکھ دیا گیا تھا' اس نے بھی موبائل آف کر دیا۔

"بہت ڈھیل دے دی امثل بیگم! مگر اب مزید نہیں۔" زیر لب کہہ کر وہ اٹھا اور وارڈ روب سے کپڑے نکالنے لگا۔

❁❁❁

"بے بی! مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہارا گھر اجاڑا' تمہیں گھر سے بے گھر کیا۔ میں تمہارا مجرم ہوں' تمہارا گناہگار۔ مجھے معاف کر دو' ایک بار معاف کر دو تو تب ہی میری سانس نکلے گی' اٹکی ہوئی ہے۔" بے بسی اور بدقسمتی کی تصویر بنا وہ ان کے سامنے تھا۔ آنکھوں سے صرف آنسوؤں کی لڑیاں رواں تھیں۔

"میرا اپنا نصیب رحمو چاچا! میری بے گھری میں تمہارا کیا قصور ہے۔" مسز فاروق اداس ہو گئیں۔ ماضی کے کئی منظر آنکھوں کے سامنے زندہ ہو گئے۔

"میرا قصور ہے بے بی! میرا قصور ہے سارا۔" وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ نینی نے اس کی پیٹھ تھپکی۔

"میں اسی اعتراف کے لیے تو تجھ سے ملنے آیا ہوں۔ میں بتانا چاہتا ہوں تجھے کہ یہ میں تھا جس نے پیسے کے لالچ میں تیرا گھر برباد کر دیا۔ ارے میری زبان جل جائے' میرے ہاتھ ٹوٹ جائیں' میرے پیٹ میں آگ لگے۔" وہ خود کو کوسنے لگا۔

"جو ہوا سو ہوا رحمو چاچا! مقدر میں یہی لکھا تھا۔" مسز فاروق نے اداسی سے کہا۔ "اب تمہارے اعتراف سے کون سا گزرا وقت واپس آ جائے گا۔"

"پر اس دل میں جو آگ لگی ہے بے بی! وہ تو بجھ جائے گی۔ پھانس جو اٹکی ہے سینے میں' وہ نکل جائے گی۔"

"تم اس کی بات سن لو' شاید اسے چین آ جائے۔" نینی نے کہا تو مسز فاروق خاموشی سے اسے دیکھنے لگیں۔

اور رحمو ہولے ہولے بولنے لگا۔ "یہ میں تھا جس نے چوہدری کے کہنے پر تیرا گھر اجاڑا۔ میں نے تیرے شوہر کا دل پھیرا تیری طرف سے' میں نے جھوٹ بولے جا جا کر تیرے شوہر کے پاس اور کہا کہ تو اس سے بے وفائی کر رہی ہے' اور......اور......" وہ ایک ایک راز کھولتا جا رہا تھا۔

اور مسز فاروق سفید چہرے کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

نینی نے ان کے قریب بیٹھتے ہوئے غیر ارادی طور پر ان کا ہاتھ تھام لیا۔ "ریلیکس۔" مسز فاروق نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ کتنا بڑا ظلم کیا گیا میرے ساتھ نینی! اور کیا تم بھی جانتی تھیں کہ اماں......"

"نہیں' مجھے نہیں پتا' مجھے بالکل علم نہیں تھا۔"

"مجھے معاف کر دو بے بی! مجھے معاف کر دو۔" رحمو چاچا کا جسم کپکپانے لگا۔

"معاف کر دوں' کیسے معاف کر دوں۔" مسز فاروق کے لہجے میں ٹوٹے کانچ کی چبھن تھی۔

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا رحمو چاچا! مجھے تو اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے تو ہمیشہ تمہارا احترام کیا' خیال رکھا۔"

"لالچ نے مار دیا' لالچ نے۔ مجھے معاف کر دو' خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

آنسو اس کی گدلی آنکھوں سے بہہ بہہ کر اس کی جھریوں میں جذب ہونے لگے۔

"معاف کر دو اسے۔" نینی نے کہا تو مسز فاروق نے رحمو کی طرف دیکھا۔

"میں کون ہوتی ہوں معاف کرنے والی' اللہ معاف کرے۔"

"تم معاف کر دو گی تو اللہ بھی معاف کر دے گا' ایک بار اپنی زبان سے کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا۔"

یہ وہ شخص تھا جس نے انہیں تپتی سڑک پر ننگے پاؤں لا کھڑا کیا تھا۔ مسز فاروق لمحہ بھر اسے دیکھتی رہیں پھر آہستگی سے بولیں۔

"میں نے تمہیں اپنے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے معاف کیا۔" اور رحمو کے جسم کی کپکپاہٹ کم ہو گئی۔ چہرے پر سکون چھا گیا۔

"اللہ مجھے معاف کرے' میں نے بڑے گناہ کیے' بہت گناہ۔ تیرے شوہر کو بھی بلیک میل کرتا رہا اور جب اس نے بلیک میل ہونے سے انکار کر دیا تو......" وہ ہولے ہولے بڑبڑا رہا تھا' مسز فاروق اٹھیں اور نینی سے پوچھا۔

"چائے لاؤں تمہارے لیے؟"

"ہاں' لے آؤ۔"

مسز فاروق ہولے ہولے چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں اور نینی' رحمو کی طرف متوجہ ہو گئی۔

❁❁❁

"عباس......عباس! پلیز آپ مجھ سے شادی کر لیں' پلیز عباس۔" وہ آنکھوں میں آنسو بھرے اس کے سامنے کھڑی تھی۔

"ثمین! پاگل ہو گئی ہیں آپ۔" ضبط کی انتہائی منزلوں سے گزرتے ہوئے عباس بولے تو ان کی آواز بھینچی بھینچی سی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہیں آپ! احساس ہے کچھ آپ کو؟''

''بابا جان میری شادی کرنا چاہتے ہیں' مجھے پابند کرنا چاہتے ہیں' کسی کی نگرانی میں دینا چاہتے ہیں تو پھر وہ نگراں آپ کیوں نہیں بن سکتے' آپ کیوں نہیں عباس! آپ اس اجنبی سے تو ہزار درجے بہتر ہوں گے جس کے سپرد کرنے کا فیصلہ بابا جان نے کیا ہے۔ وہ جو کل تک دشمن تھے' آج دوست کیسے بن گئے۔''

''میں نے ملک صاحب سے کہا تھا ثمین! کہ کاظم کے علاوہ اگر کوئی اور......''

''وہ کوئی اور آپ بھی تو ہو سکتے ہیں عباس!'' وہ التجا بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے ایک دم ہی رخ موڑ لیا۔

''ثمین! پلیز اپنے کمرے میں جائیں۔'' وہ بے بسی سے گویا ہوا۔

عباس کو بھی کاظم کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ گو بظاہر اس میں کوئی کمی نہ تھی۔ پڑھا لکھا تھا' خاندانی لحاظ سے ہم مرتبہ تھا پھر بھی اس نے دبے لفظوں میں مشورہ دیا تھا۔

''چوہدری جہانداد پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا ملک صاحب! کیا خبر......''

''نہیں یار...... وہ میرا بچپن کا سنگی ساتھی ہے۔ بس خوامخواہ خار کھا گیا تھا بھائی پھیرو والی مل کے معاملے میں۔ اگر مجھے پتا ہوتا کہ وہ بھی انٹرسٹڈ ہے تو میں پیچھے ہٹ جاتا لیکن مجھے تو بعد میں پتا چلا جب اس نے باقی معاملات میں پارٹنرشپ ختم کر لی اور اب وہ شرمندہ ہے۔''

''کاظم کی عمر کچھ زیادہ ہے۔'' اس نے خدشہ ظاہر کیا۔ ''جبکہ تائی فاطمہ کا سوتیلا پوتا عمر میں در ثمین سے دو تین سال ہی بڑا ہو گا پھر سب دیکھے بھالے لوگ ہیں۔''

''لیکن وہ صرف دس جماعت پاس ہے اور میں نے ثمین کے لیے ایسے ہی پڑھے لکھے لڑکے کے متعلق سوچا تھا۔ اپنوں میں دور و نزدیک کوئی ایسا نہیں ہے اور عمر کی خیر ہے۔ مرد کی عمر کون دیکھتا ہے۔''

اور عباس خاموش ہو گیا تھا۔ عمر کے علاوہ بھی اسے کاظم اچھا نہیں لگا تھا۔ عجب کینہ سا جھلکتا تھا اس کی آنکھوں سے اور پھر ادھر ادھر سے اسے پتا چلا تھا کہ اسے لڑکیوں سے بہت دلچسپی ہے اور یہ بات بھی اس نے ملک صاحب کے گوش گزار کر دی تھی لیکن وہ تو فیصلہ کر چکے تھے۔

''اور یہ زمینداروں' جاگیرداروں کے لڑکے جوانی میں تھوڑا بہت شوق میلہ کر لیتے ہیں۔''

''چلی جاؤں گی لیکن آپ ادھر دیکھیں میری طرف۔'' اس نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو عباس چونک گیا۔ نم ہاتھوں میں جیسے ثمین کا دل دھڑک رہا تھا۔ عباس نے مڑ کر آہستگی سے اس کا ہاتھ اپنے بازو سے ہٹا دیا۔

''آپ سمجھ نہیں رہیں ثمین! اور محض بے وقوفوں جیسی بات کر رہی ہیں۔''

''آپ کو عمر پر اعتراض تھا نا تو اس کی عمر بھی آپ جتنی ہی ہو گی۔ سولہ سترہ سال تو بڑا ہو گا نا

مجھ سے۔''

''صرف اتنی سی بات نہیں ہے ثمین!'' عباس نے ایک نظر اس پر ڈالی تھی اور اسے لگا تھا جیسے اس کا دل پانی ہو کر بہہ جائے گا۔

''تو اور کیا بات ہے عباس! کیا میں بدصورت ہوں' بدکردار ہوں' بداخلاق ہوں؟''

''خدا نہ کرے ثمین!''

''تو پھر کیا اعتراض ہے آپ کو؟ آپ بابا جان سے بات کیوں نہیں کرتے۔''

''ثمین! خدا کے لیے عقل سے کام لیں۔'' اس نے التجا کی۔ ''ملک صاحب' چوہدری صاحب کو ہاں کر چکے ہیں' شادی کی تاریخ طے ہو چکی ہے اور آپ......''

''نکاح تو نہیں ہوا نا۔ پلیز عباس! آپ...... آپ مجھ سے شادی کر لیں' مجھے آپ سے محبت ہے عباس!''

''ثمین!'' عباس کی آواز قدرے اونچی اور لہجہ سخت تھا۔ ''آپ کو کچھ علم نہیں ہے آپ کیا کہہ رہی ہیں۔''

''مجھے سب علم ہے عباس! میں اس گھر سے' آپ سے دور ہو کر مر جاؤں گی۔''

''پلیز ثمین! اپنے کمرے میں جائیں۔'' اس نے اپنی بات دہرائی اور پھر رخ موڑ کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔ ''اس وقت یہاں میری انیکسی میں آپ کا آنا قطعی مناسب نہیں ہے۔''

''کیا مناسب ہے کیا نہیں' آپ یہ بتائیں آپ مجھ سے شادی کریں گے؟ ٹھیک ہے میں بابا جان سے بات خود کر لوں گی۔'' اس نے آنسو پونچھے۔

''نہیں۔'' عباس نے رخ موڑے موڑے کہا۔

''تو ٹھیک ہے' میری موت کے ذمہ دار آپ ہوں گے۔''

''تم...... تم ایسا کچھ نہیں کرو گی' تمہیں میری اور سعدون کی زندگی کی قسم۔''

وہ تیزی سے مڑا تھا اور زندگی میں پہلی بار اس نے ثمین کو تم کہہ کر بلایا تھا۔

''مجھ سے محبت بھی کرتے ہیں اور اس سے مکر بھی رہے ہیں آپ!'' وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی اور عباس کی نظریں جھک گئی تھیں۔

''اتنی بڑی قسم دے دی آپ نے لیکن میری زندگی کی بربادی اور تباہی کے ذمہ دار آپ ہوں گے عباس! صرف آپ۔'' وہ تیزی سے مڑی اور تقریباً بھاگتے ہوئے لان عبور کر گئی۔

وہ انیکسی کے دروازے پر کھڑا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

اور یہ ثمین کیوں آ گئی تھی اس کی آزمائش کرنے۔

وہ اس کو دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

اس کے آنسو اسے تڑپا دیتے تھے۔

وہ اس کی ہر خواہش ہر آرزو پوری کرنا چاہتا تھا۔ بچپن سے لے کر اب تک اس نے یہی کیا تھا۔ وہ سعدون کی کوئی ضد ٹال دیتا تھا لیکن ثمین کی نہیں۔ لیکن یہ ایسی ضد نہ تھی کہ وہ اسے پورا کرتا۔ یہ اس کی پوری زندگی کی ریاضتوں کو مٹی میں ملا دینے والی بات تھی۔ وہ ایسی بات منہ سے نکال کر خود اپنی نظروں میں گر جاتا۔

اس گھر نے اسے پناہ دی تھی' عزت اور محبت دی تھی۔ وہ بڑے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھا تھا۔ وہ یتیم خانے سے نکل بھاگنے والا تیمور عباس جس نے لمز سے ایم بی اے کیا تھا تو یہ سب جس ہستی کی وجہ سے تھا' کیا وہ اس کے اعتبار کو کرچی کرچی کر سکتا تھا؟

''کاش...... اے کاش ثمین...... آپ نے کوئی اور خواہش کی ہوتی' کوئی اور آرزو۔ میں اپنا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں رکھ دیتا لیکن یہ...... یہ بات تو میں منہ سے نکال بھی نہیں سکتا۔ ایسا تو سوچنا بھی شاید میرے لیے کسی عذاب سے کم نہیں۔''

ملک فیروز خان نے ایک بار کہا تھا۔ ''میں سعدون پر شک کر سکتا ہوں لیکن عباس پر نہیں۔ عباس میرے ہی وجود کا حصہ ہے۔'' اور تب سے لے کر اب تک اس نے زندگی یوں بسر کی تھی جیسے ٹوٹے کانچ پر ننگے پاؤں چل رہا ہو۔

لوگ ملک فیروز خان کو اکساتے تھے' اس کے خلاف باتیں بھی کرتے تھے' اتنا زیادہ اعتبار کرنے پر' گھر کے اندر اس کے اتنے عمل دخل پر اعتراض بھی کرتے تھے لیکن ملک فیروز خان مسکرا دیتے۔

''تیمور عباس کوئی غیر نہیں' بیٹا ہے میرا۔ میں گھر پر نہیں ہوتا تو وہی چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال رکھتا ہے۔''

اتنا اعتبار' اتنا یقین' وہ تو ملک فیروز خان کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ چہ جائیکہ اتنی جرأت......

دونوں ہاتھوں میں سر تھامے وہ کتنی ہی دیر تک وہیں بیٹھا رہا اور پھر ملک صاحب کے بلانے پر جب باہر نکلا تو اس کا سر درد سے پھٹ رہا تھا۔ تائی فاطمہ لاؤنج میں کپڑے بکھرائے بیٹھی تھیں۔

در ثمین کے کمرے کا دروازہ بند تھا اور ملک فیروز خان کسی سے موبائل پر باتیں کرتے ہوئے کمرے سے باہر آ رہے تھے۔ موبائل آف کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

''عباس! تم ایسا کرو ثمین کو ساتھ لے کر جیولر کے پاس چلے جاؤ تاکہ زیور اور ویڈنگ ڈریس پسند کر لے وہ۔''

''ایک اور آزمائش۔'' لیکن ثمین نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

''مجھے کچھ نہیں معلوم اس سب کے متعلق' بابا جان جو چاہیں خرید لیں یا تائی کو ساتھ لے

جائیں۔''

''تائی کو کیا پتا نئے رواجوں' اور ڈیزائن کا۔'' ملک صاحب نے کہا۔

''مجھے بھی نہیں معلوم۔''

اس کا چہرہ سپاٹ تھا' ہر طرح کے احساس سے عاری۔ سخت اور پھر بعد کے سارے دن اس کا چہرہ یوں ہی رہا جیسے وہ انسان نہیں' پتھر ہو۔ بے حس اور سرد مہر۔ اس روز کے بعد اس نے عباس سے کوئی بات نہیں کی تھی اور عباس...... وہ تو خود اس سے چھپتا پھر رہا تھا۔ ضبط کے نہ جانے کتنے پہرے خود پر بٹھائے وہ اس کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ رات کو جب وہ تھکا ماندا بیڈ پر لیٹتا تو وہ اس کی بند آنکھوں میں چلی آتی۔

روتی ہوئی۔

اس کا بازو پکڑے التجا کرتی ہوئی۔

''اگر میری زندگی برباد ہوئی تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے' صرف آپ۔''

اور وہ دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لیتا۔

''نہیں ثمین! خدا نہ کرے' تمہاری زندگی برباد ہو' خدا نہ کرے۔''

اس کی اچھی اور بہترین زندگی کی دعائیں مانگتے مانگتے اس کا حلق خشک ہو جاتا لیکن پھر بھی اسے تسلی نہ ہوتی جیسے اندر کہیں ادراک ہو رہا تھا۔

ثمین' کاظم کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی۔

ثمین کی زندگی برباد ہو جائے گی۔

صبح اٹھتا تو رت جگے اور پریشانی سے آنکھیں لال انگارہ ہو رہی ہوتیں۔

ملک فیروز خان نے اپنے ایک دوست کی بیوی اور بیٹی کی مدد سے ساری خریداری کر لی تھی۔

انہوں نے اس کی بات پر اعتبار کر لیا تھا اور اس کے سپاٹ چہرے کی طرف نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آنکھوں کو جس میں زندگی مر گئی تھی۔

شادی سے دو دن پہلے ملک صاحب نے سعدون کو بھی بلا لیا۔ اس نے سعدون سے بھی زیادہ بات نہیں کی تھی۔ بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ سعدون جوان چند ماہ میں کچھ اور لمبا اور دبلا ہو گیا تھا اور پہلے سے زیادہ خاموش۔ پندرہ سولہ سالہ سعدون نے چھوٹے بھائیوں کی طرح نہ اس سے کوئی مذاق کیا تھا' نہ پوچھا تھا کہ وہ کون ہے جس سے ثمین کی شادی ہو رہی ہے۔ عباس نے محسوس کیا تھا کہ اس کی کیفیت کچھ کھوئی کھوئی سی ہے۔ حتیٰ کہ رخصتی کا دن بھی آ گیا۔

اس نے ایک آنسو بھی نہ بہایا۔

نہ سعدون سے ملتے ہوئے۔
نہ تائی فاطمہ سے۔
حتیٰ کہ جب ملک فیروز خان نے اسے گلے لگا کر اس کی پیشانی چومی تھی تب بھی نہیں۔ ان کے لبوں سے نکلتی حرارت نے بھی اس کے پتھر دل کو نہیں پگھلایا تھا۔
ہاں اس نے سر اٹھا کر ایک نظر عباس کی طرف ضرور دیکھا تھا جو ملک فیروز خان کے ساتھ ہی کھڑا تھا۔ ایسی نظر جس میں ہزاروں شکوے تھے جو پتھر کا کلیجہ بھی شق کر دے۔
اور عباس کا دل
پتھر تو نہ تھا۔
نرم و گداز محبتوں سے بھرا
وہ اس نظروں کی تاب نہ لا کر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔

کاظم اسے دیکھ کر ایک لمحہ کو تو مبہوت رہ گیا تھا۔ ایک تو حسن‘ اس پر کم عمری اور پھر اس حسن کو پارلر والوں نے دو آتشہ بنا دیا تھا۔
کئی دنوں تک وہ سب کچھ بھولا رہا‘ ہر سرگرمی۔ حتیٰ کہ امثل کو بھی۔
اعظم نے اسے سراہا تھا۔ بڑی عزت و احترام سے بات کی تھی۔ اماں جی اس پر واری جا رہی تھیں۔
لیکن کاظم...... اس کے تصور سے ہی اسے ابکائی آنے لگتی تھی۔ عجب وحشی مرد تھا۔
اعظم شادی کے لیے چھٹیاں لے کر آیا تھا اور اس روز اسے واپس جانا تھا۔ وہ اسے خدا حافظ کہنے کے لیے ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ اسے لاؤنج میں بیٹھی مل گئی۔ چپ چاپ اور اداس سی۔ سادہ سے کپڑوں میں وہ بالکل بھی نئی بیاہی دلہن نہیں لگ رہی تھی۔
''السلام علیکم بھابھی!'' اعظم نے قریب جا کر کہا تو وہ چونکی۔
''شاید اس لڑکی پر ظلم ہوا ہے۔ کاظم جیسا عیاش مرد اس کے قابل نہ تھا۔ اعظم نے دل ہی دل میں سوچتے ہوئے پوچھا۔
''کاظم کہاں ہے؟''
''کمرے میں ہیں۔'' اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور نیلی جھیل سی آنکھیں ہر رنگ سے خالی تھیں۔
''شاید اپنے گھر کے لیے اداس ہیں۔ اتنی کم عمری تو ہیں۔ میں کاظم سے کہوں گا‘ کچھ عرصے جلدی جلدی انہیں گھر کے چکر لگوا دیا کرو۔'' اس نے ہمدردی محسوس کی۔
''گھر یاد آ رہا ہے؟'' وہ مسکرایا۔

''نہیں۔'' اس نے سر اٹھا کر اعظم کی طرف دیکھا۔
''گھر میں ہے ہی کون‘ بابا جان اسلام آباد میں اور سعدون بھی ہاسپٹل میں۔''
''اسلام آباد ہوں۔'' لاؤنج میں داخل ہوتے چوہدری جہانداد نے دل ہی دل میں کہا۔
''اور اب تم تڑپو گے فیروز خان! جب بیٹی کی شکل نہ دیکھ پاؤ گے پھر بھول جاؤ گے سب اسلام آباد کے چکر۔'' وہ مونچھوں پر بل دیتے ہوئے صوفے پر پھیل کر بیٹھ گئے۔
''ہاں تو پتر اعظم! کب روانگی ہے؟''
''بس ابا جان! کاظم سے مل کر نکلتا ہوں۔''
''یہ تمہاری پڑھائی ابھی اور کتنی چلے گی؟''
''بس دو ہی سمسٹر رہ گئے ہیں۔''
''اچھا خیر‘ میں تمہارے لیے نئی مل خریدنے والا ہوں۔ یہ تمہاری پڑھائی ختم ہو جائے تو......'' اعظم صرف مسکرا دیا۔
''میں ذرا کاظم سے مل لوں۔'' وہ کاظم کے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔
کاظم موبائل کان سے لگائے سن رہا تھا۔ وہ ہولے سے کھنکھارا تو اس نے سر کے اشارے سے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔
''نہیں میڈم! آپ کو کہاں بھول سکتے ہیں۔ بھئی! ذرا مصروفیت تھی۔'' وہ پھر فون کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
''بے فکر رہیں میڈم! بہت جلد آؤں گا آپ کی اس کچی کلی سے ملنے۔'' اعظم سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد موبائل آف کر کے وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔
''خیریت۔ کیا پھر کسی دوست نے بھیج دیا تمہیں؟'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔
''نہیں‘ میں اسلام آباد جا رہا تھا‘ ملنے آیا ہوں۔''
''اوہ اچھا۔'' اس نے بیٹھے بیٹھے دو انگلیاں آگے بڑھا دیں۔
''کاظم! ایک بات کہوں۔'' اعظم اسے دیکھ رہا تھا۔ ''بھابھی بہت اچھی ہیں‘ بہت معصوم سی۔ اب یہ میڈم وغیرہ کا پیچھا چھوڑ دو۔''
''آپ کو چند دن میں اندازہ ہو گیا اس کی اچھائی کا۔'' کاظم کا انداز مزید طنزیہ ہو گیا تھا۔
اعظم کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔
''وہ تمہاری بیوی ہے‘ تمہیں اس کے ساتھ خیانت نہیں کرنا چاہیے۔'' اس نے پھر سمجھانے کی کوشش کی۔
''اچھا تو اب محترمہ درثمین صاحبہ کے لیے درد اٹھا ہے آپ کو۔ پہلے وہ محترمہ امثل صاحبہ تھیں۔''

''پلیز کاظم! میں تمہارا بھائی ہوں' تمہارا ہمدرد۔''
''اچھا' میرے ہمدرد ہو؟''
''ہاں۔ تمہارا ہمدرد ہوں' دوست ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم اچھے راستوں پر چلو۔ اتنے پڑھے لکھے ہو......''
کاظم نے برا سا منہ بناتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ٹھیک ہے' میرے ہمدرد ہو' دوست ہو تو میرا ایک کام کر دو۔''
''کاظم! تم کہو تو میں تمہارے لیے جان بھی دے سکتا ہوں۔''
''خیر' جان لے کر میں کیا کروں گا۔ بس تم اپنے دوست فریدوں کی اس کزن کو میرے بیڈروم میں لے آؤ' ایک رات کے لیے تو میں مان لوں گا کہ تم میرے دوست اور ہمدرد ہو۔''
''شٹ اپ۔'' اعظم کا چہرہ سرخ ہوا اور اس نے ایک تیز نظر اس پر ڈالی۔ کاظم کی آنکھوں میں کمینگی اور خباثت تھی۔
''یو شٹ اپ اعظم! اینڈ گیٹ آؤٹ۔'' کاظم دھاڑا۔
اعظم تیزی سے باہر نکل گیا۔ کچھ دیر تو یونہی مٹھیاں بھینچتا رہا پھر اٹھ کر اس نے کوئی نمبر ڈائل کیا۔
''سکندر!'' اس کی آواز میں تپش تھی۔ ''تم نے کہا تھا میں جب چاہوں اس لڑکی کو تمہارے قدموں میں پھینک دوں تو۔'' اس کی آواز قدرے مدھم ہو گئی۔ ''صبح کے وقت وہ اکیلی آفس جاتی ہے' اسٹاپ پر پہنچنے سے پہلے ہی چھاپ لو اور گلبرگ والی کوٹھی۔'' موبائل آف کر کے وہ مسکراتے ہوئے لاؤنج میں آیا۔ اعظم بیگ اٹھائے نکل رہا تھا اور اماں اور ثمین اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔
''ڈیڈ!'' وہ ان سب کو نظرانداز کرتا چوہدری جہانداد کے سامنے رکا۔
''میں کچھ دنوں کے لیے ایک دوست کے ساتھ جا رہا ہوں۔''
''کہاں؟''
''بس یونہی گھومنے پھرنے۔''
درثمین نے ایک اطمینان بھری سانس لی اور وہ ایک نگاہ غلط انداز اس پر ڈالتا ٹیبل سے گاڑی کی چابی اٹھا کر لاؤنج سے باہر نکل گیا۔

◈◈◈

امثل کمرے میں داخل ہوئی تو مسز فاروق اس کی رائٹنگ ٹیبل کے پاس بیٹھی تھیں اور ان کے سامنے وہ فائل کھلی تھی' وہی فائل جو ایک بوڑھے نے ایک روز اخبار کے دفتر میں پہنچائی تھی۔ وہ ٹھٹک کر دروازے پر ہی رک گئی۔ فریدوں اسے گیٹ پر اتار کر چلا گیا تھا۔ آج بہت

دنوں بعد اس کا موڈ ٹھیک ہوا تھا اور اس نے آفس میں آج اس سے بالکل پہلے کے سے انداز میں باتیں کی تھیں۔ اس کے دیکھنے کا انداز بھی وہی تھا' والہانہ محبت لٹاتی نظریں۔
''آپا کی بات ٹھہر گئی ہے۔ لالہ اور آپا دونوں کی شادی ایک ساتھ کرنے کا پروگرام ہے۔'' لنچ بریک میں اس نے بتایا۔
''اچھا۔'' اسے خوشی ہوئی تھی۔
''ماما کی طبیعت اگر ٹھیک ہوئی تو ہم آئیں گے مبارک باد دینے۔''
''تمہیں آنا ہوا تو فون کر دینا' میں آ جاؤں گا لینے۔ اکیلے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''فریدوں!'' امثل کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ''تم اب مجھ سے ناراض تو نہیں ہونا؟''
''مجبوری ہے امثل! میں تم سے ناراض نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم پر بہت غصہ تھا لیکن اب ختم ہو گیا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں اپنائیت تھی اور محبت۔
''تھینکس۔''
''میرے خیال میں ہمارے درمیان یہ لفظ کبھی استعمال نہیں ہوا تھا اور آئندہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔'' وہ آنسوؤں میں مسکرا دی تو فریدوں نے محبت پاش نظروں سے اسے دیکھا۔
''بارش کے بعد دھنک کے رنگ ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے اس وقت تمہاری آنکھوں میں ہیں۔'' اس نے مبہوت ہو کر سوچا۔
''پھر تو فون نہیں آیا کاظم کا؟'' اس نے اچانک پوچھا۔
''نہیں' پندرہ سولہ دن سے نہیں آیا۔''
''اعظم نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے سمجھائے گا۔''
''لیکن مجھے بہت ڈر لگتا ہے فریدوں!''
''بے فکر رہو' میں تمہارے ڈر کا مستقل انتظام کرنے والا ہوں۔ لالہ اور آپا کے بعد تمہاری رخصتی۔''
''لیکن فریدوں! تم نے وعدہ کیا تھا مجھ سے ماما اور ہومی......''
''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے ثومی! ماما اور ہومی میری ہی ذمہ داری ہیں۔ میں نے اپنا اوپر والا پورشن خالی کرنے کے لیے کہہ دیا ہے۔ تم لوگ اپنا مکان کرائے پر دے دینا اور وہاں اٹھ آنا۔ ماما اور ہومی ہمارے ساتھ ہی رہیں گے۔ اگر کاظم والا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید میں ایسا نہ کرتا لیکن اب ضروری ہو گیا ہے کہ اب میں جلد از جلد تمہیں قانوناً اور شرعاً تحفظ دوں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ اسے پسند نہیں کریں گی۔ اگر یوں رہنا گوارا نہ ہو تو بے شک آنٹی کرایہ دے دیں لیکن اس طرح میں اور تم ان کی دیکھ بھال بھی کر لیں گے اور تم بھی محفوظ ہو جاؤ گی۔''
کتنی خوش قسمت تھی وہ جسے فریدوں جیسا مخلص اور محبت کرنے والا شخص ملا تھا۔

''ثومی! یہ کیا ہے؟'' مسز فاروق نے یکدم مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''یہ ماما......'' وہ کچھ گھبرائی۔

یہ ایک بوڑھا شخص دے گیا تھا اخبار کے دفتر میں چھاپنے کے لیے لیکن سلیمی صاحب اسے چھاپنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے تو میرے کاغذات کے ساتھ گھر آ گئی۔

''یہ سب جو اس میں لکھا ہے جھوٹ ہے ثوما!''

''کیا؟'' امثل بیڈ پر بیٹھ گئی۔ فائل گود میں دھرے مسز فاروق اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

''ملک فیروز خان نے اپنی بیوی کو قتل نہیں کیا تھا۔'' انہوں نے آہستگی سے کہا۔

''آپ کیسے جانتی ہیں۔''

''میں جانتی ہوں امثل! مجھے پتا ہے۔ تم سنو گی' اصل کہانی جاننا چاہتی ہو؟''

گو اسے اب ملک فیروز خان یا اس کی کہانی سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی لیکن غیر ارادی طور پر اس کا سر ہل گیا۔

❁❁❁

زرمینہ کا تعلق اس بازار سے تھا۔ آواز اچھی تھی' اس لیے ریڈیو اور فلم میں چانس مل گیا۔ کئی فلموں کے گانے گائے لیکن نجی محفلوں میں گانا نہ چھوڑا' اسی دوران ایک کیمرہ مین سے شادی کی لیکن کیمرہ مین نے سال بھر بعد طلاق دے دی۔ اس شادی کا ثمر زہرہ جمال تھی۔ اتنی خوبصورت اور حسین کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہو۔ زرمینہ نے اسی وقت فیصلہ کرلیا تھا کہ یہ بچی اس کا سہارا بنے گی اور اس کے حسن کے بل بوتے پر وہ بہت کچھ حاصل کرلے گی۔

ان ہی دنوں اس نے گلبرگ میں کوٹھی لی۔ ٹی وی اور ریڈیو پر گانے سے اسے شعور ملا کہ تعلیم سے شخصیت کے حسن میں چار چاند لگ جاتے ہیں' اس لیے اس نے بیٹی کو اچھے اداروں میں تعلیم دلوائی اور ماڈلنگ سے ابتدا کی۔ پہلے ہی اشتہار کے آن ایر آنے پر اس کے حسن کی دھوم مچ گئی۔ کئی کمپنیوں نے اسے ماڈلنگ کے لیے کہا۔ ان دنوں وہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی اور ماڈلنگ بھی کر رہی تھی۔

ان ہی دنوں زہرہ کی ملاقات ملک فیروز خان سے ہوئی اور دونوں کے درمیان محبت کا رشتہ قائم ہوگیا۔ زہرہ جمال پڑھی لکھی تھی' باشعور تھی۔ محبت سے قطع نظر ایک گھر بنا کر رہنے کی خواہش اس کے اندر بھی موجود تھی۔ اسے اپنی ماں کا طرز زندگی پسند نہ تھا۔ وہ جانتی تھی کہ سوسائٹی میں ان جیسی عورتوں کا کوئی مقام نہیں ہوتا۔ ملک فیروز خان کی محبت نے اس کے اندر طاقت بھر دی پھر بڑی بہن نے بھی ہمت بڑھائی۔ (کیمرہ مین سے شادی سے پہلے بھی زرمینہ کی ایک بیٹی تھی) اور اس نے ماں سے کہہ دیا کہ وہ شادی کرنا چاہتی ہے۔ زرمینہ ششدر رہ گئی۔

''تم جانتی ہو' تم کیا حماقت کرنے والی ہو۔ ابھی ہم گلبرگ سے اقبال ٹاؤن آئے ہیں' اس کے بعد ہمیں ڈیفنس جانا ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ بطور ماڈل گرل تم سب پر چھا جاؤ پھر پیسہ یوں ہن کی طرح برسے گا۔''

''میں شریفانہ زندگی بسر کرنا چاہتی ہوں۔''

زہرہ جمال بضد تھی۔ زرمینہ نے بالا ہی بالا دبئی میں ایک عرب شیخ کی نجی محفل میں گانے کا معاہدہ کرلیا تھا جس میں زہرہ جمال کو اس کے ساتھ جانا تھا مگر زہرہ کو بڑی بہن نے اس منصوبے کی خبر دے دی تھی' تب اس نے فیروز خان سے کہا۔

''فیروز! اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو آج ہی مجھ سے نکاح کرلو۔''

''میں بہت دھوم دھام اور پورے عزت و احترام کے ساتھ تمہیں بیاہ کر لے جانا چاہتا ہوں زہرہ! اپنے بابا کو تو میں نے راضی کر ہی لیا ہے لیکن کچھ دوسرے مسائل بھی ہیں۔ میں چھٹیاں گزارنے آیا ہوں۔ ابھی میرے دو سیمسٹر رہتے ہیں۔ میں اپنی تعلیم ہر صورت مکمل کرنا چاہتا ہوں۔ اصل میں میرے دادا اس بات کو پسند نہیں کریں گے کہ انہیں رضامند کرنا اصل مسئلہ ہے۔''

''اور تمہارے سیمسٹر مکمل ہونے تک اور دادا کی رضامندی تک زہرہ جمال خود کو نہ بچا سکی تو گلہ مت کرنا۔ اماں مجھے دبئی لے جا رہی ہیں اور میں نہیں جانتی کہ وہاں سے واپس آؤں گی تو......''

اور تب اسی شام فیروز خان نے چند دوستوں کی موجودگی میں زہرہ سے نکاح کرلیا۔

''رخصتی میرے واپس آنے پر ہوگی۔ اپنی حفاظت کرنا اور مجھ سے بددل مت ہونا۔ میں تم سے ہمیشہ رابطے میں رہوں گا۔''

نکاح کے ہفتہ بھر بعد وہ نیویارک روانہ ہوگیا۔ زرمینہ تلملا کر رہ گئیں۔ انہیں یقین تھا کہ فیروز خان واپس نہیں آئے گا۔

''دیکھ لینا' وہ کبھی بھی تمہیں رخصت نہیں کروائے گا۔'' وہ اس کی بڑی بہن کو ساتھ لے کر دبئی چلی گئیں۔ زرمینہ تین ماہ بعد واپس آئی تو زہرہ کی حالت دیکھ کر پہلے تو ششدر رہ گئیں پھر خوب قہقہے لگائے۔

''تو یہ مقصد تھا نکاح کا۔''

وہ ہنسے چلی گئیں۔ زہرہ شرمندہ سی بیٹھی رہ گئی' گو وہ دونوں ایسا نہ چاہتے تھے لیکن ایک شرعی حق کے ساتھ جب وہ دونوں اکٹھے موجود تھے تو خود کو نہ روک سکے تھے۔ فیروز خان نے اسے تسلی دی تھی۔

''ایسا نہ ہوتا تو اچھا تھا لیکن ہوگیا تب بھی کوئی بات نہیں۔ میں آتے ہی نکاح ڈیکلیئر

کر دوں گا۔''

زہرہ کے ہاں ایک خوبصورت لڑکی پیدا ہوئی اور زرینہ بیگم نے فیروز خان کو بتایا کہ مردہ بچی پیدا ہوئی ہے۔ وہ ہاسپٹل سے آئی تو زرینہ بیگم کی بات سن کر حیران رہ گئی۔

''آپ نے ایسا کیوں کیا اماں!'' زہرہ جمال حیران تھی۔

''اس کی آزمائش ہو جائے گی۔ بچی کی خاطر تو شاید وہ آ ہی جاتا' اب دیکھتی ہوں کہ وہ آتا ہے یا نہیں۔'' زہرہ ماں کی باتوں میں آ گئی۔ حالانکہ بہن نے اس سے کہا بھی کہ وہ فوراً ہی اماں کے جھوٹ کے متعلق فیروز کو بتا دے لیکن جب فیروز خان نے فون پر اسے تسلی دی اور کہا کہ اسی میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت تھی تو وہ چپ ہو گئی۔ فیروز خان اماں کے اندازوں کے برعکس نہ صرف آ گیا بلکہ حسب وعدہ دھوم دھام سے رخصت کرانے کا وعدہ بھی پورا کرنے کو تیار ہو گیا۔ بچی ڈیڑھ سال کی ہو چکی تھی۔ زرینہ بیگم نے کہا۔

''زہرہ جمال! اب فیروز خان کو بچی کے متعلق نہ بتانا' اپنا اعتبار کھوئے گی۔ مرد اعتبار کھو دے عورت پر سے تو وہ اسے کسی سے بھی ہولا جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے اسی وقت طلاق دے دے۔''

اور زہرہ جمال حیرت سے ماں کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

''یوں بھی تم تو اڑ جاؤ گی۔ میرے بڑھاپے کا کوئی تو سہارا ہو۔ یہ بچی اب دوسری زہرہ جمال بنے گی۔ یہ اس سب کی قیمت ہے جو میں نے تم پر خرچ کیا تھا لیکن تم......'' زرینہ کمینگی سے ہنس رہی تھیں۔

زہرہ بے بس تھی۔ ایک طرف مامتا تھی' دوسری طرف محبت اور ایک باعزت زندگی تھی۔ بہن نے تسلی دی۔

''زہرہ! اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ نہیں جو اماں نے کہا لیکن مجھ پر اعتبار کرو' میں اسے اپنی بیٹی کی طرح پالوں گی' پڑھاؤں گی اور کسی باعزت شخص سے اس کی شادی کر دوں گی۔ میں اسے اپنے اور اماں کی طرح نہیں بننے دوں گی۔ تم سمجھنا' تم نے اپنی بہن کو اپنی بیٹی دے دی لیکن آج اگر تم نے اعتبار کھو دیا تو......''

اور بہن کے یقین دلانے پر وہ خاموش ہو گئی۔ گو کلیجہ کٹ رہا تھا' بچی سے جدائی مشکل تھی لیکن ماں نے ایسا جال بچھایا تھا کہ وہ پھڑ پھڑا بھی نہیں سکتی تھی۔ فیروز خان عزت و احترام سے اسے رخصت کروا کے لے گیا۔

''میں تمہیں عزت' محبت سب کچھ دوں گا زہرہ! لیکن بدلے میں مجھے تمہاری محبت اور وفا کے سوا کچھ نہیں چاہیے اور ایک چھوٹی سی آرزو ہے میرے بابا کی کہ تم اپنی ماں اور بہن سے کوئی تعلق نہیں رکھو گی' اس گھر میں نہیں جاؤ گی' البتہ فون کر سکتی ہو۔''

خود غرض ماں سے اسے کوئی محبت نہیں رہی تھی لیکن اس کے گھر میں جگر کا ٹکڑا تھا لیکن فیروز خان کی محبت کے سامنے وہ ہار گئی۔ جلد ہی فیروز خان نے لاہور سے اپنا ہیڈ آفس کراچی منتقل کر لیا اور ''قصر زہرہ'' کے کاغذات رونمائی میں اسے گفٹ کیے۔ زہرہ جمال' فیروز کی محبتوں پر نازاں تھی' اپنی زندگی پر رشک آتا اسے۔ بس دل میں بیٹی کی کسک تھی جو کبھی کبھی اسے اداس کر دیتی۔ بہن سے کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی تو خیریت کی خبر مل جاتی۔ اماں ہر بار ضرور پیغام دیتی۔

''فیروز چھوڑ دے تو چلی آنا' میرے دروازے کھلے ہیں۔''

سو اس نے ماں سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھی لیکن آٹھ سال تک اللہ تعالیٰ نے اسے اولاد کی نعمت سے محروم رکھا۔ بدخواہوں نے فیروز خان کو دوسری شادی کے لیے اکسایا۔ اسے بانجھ کہا لیکن فیروز خان پر کچھ اثر نہ ہوا۔

''اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو اولاد بھی ہو جائے گی۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے صبر کا پھل دیا۔ اس کی گود میں بچی آ گئی۔ فیروز تو بیٹی کے دیوانے تھے' اتنی خوشیاں منائیں انہوں نے کہ بیٹے کی پیدائش پر بھی کسی نے کیا منائی ہوں گی۔ مثالی زندگی تھی دونوں کی۔ بس ایک کمی جو زہرہ جمال کو محسوس ہوتی وہ اپنی بیٹی کی تھی۔ جب فیروز خان ثمین کو پیار کرتے' اس کو گود میں اٹھاتے تو زہرہ کو اپنی اس بیٹی کا خیال آ جاتا جو باپ کی محبت سے محروم تھی۔ ایک ذرا سی غلطی نے اسے باپ کی محبت سے محروم کر دیا تھا۔ کاش وہ ماں کی باتوں میں نہ آتی اور فیروز کو حقیقت بتا دیتی۔

چوہدری جہانداد گو فیروز خان کا دوست تھا لیکن اندر ہی اندر وہ اس کی جڑوں کو کاٹنے میں لگا رہتا تھا۔ جن دنوں فیروز خان نیویارک میں تھے' اس نے زہرہ کو اس سے برگشتہ کرنے کی پوری کوشش کی تھی لیکن زہرہ کو فیروز خان پر پورا یقین تھا۔ اب جبکہ ہرہ فیروز خان کی بیٹی کی ماں بھی بن چکی تھی' وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آیا تھا اور فیروز خان کو ورغلانے کی کوشش کرتا رہتا۔

ثمین ڈیڑھ سال کی تھی جب ملک فیروز خان نے ایک مل لاہور کے قریب خریدی' اس کی خریداری کے سلسلے میں اسے لاہور آنا پڑا تو زہرہ جمال کا دل بھی مچل اٹھا۔ اس شہر میں وہ پیدا ہوئی تھی' اس کا بچپن گزرا تھا۔

''آٹھ سال جدا ہوئے ہو گئے' مجھے بھی ساتھ لے چلیں۔''

''تم اپنی اماں کے گھر نہیں جاؤ گی۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے وعدہ کر لیا۔

فیروز خان فطرتاً نرم دل تھے' کچھ دیر بعد انہوں نے کہا۔
''بہر حال وہ تمہاری ماں ہے' بہن ہے' انہیں ہوٹل میں بلا کر مل لینا۔''
اماں سے ملنے کا اسے کوئی خاص شوق نہ تھا۔ ہاں بہن سے ملنا چاہتی تھی۔ کہنے کو وہ اس کی سوتیلی بہن تھی لیکن اسے اس سے محبت تھی اور پھر زہرہ کی بیٹی کو بھی اسی نے سنبھال رکھا تھا۔
ہوٹل میں صرف اس کی بہن ہی ملنے آئی۔ اس کی اماں ان دنوں کسی وڈیرے کے بیٹے کی شادی میں گانے کی محفل اٹینڈ کرنے سندھ گئی ہوئی تھی۔
''اسے کیوں نہیں لائیں؟'' تنہائی ملتے ہی زہرہ نے پوچھا۔
''کیسے لاتی' وہ تو ساری ہی تیری شکل و شباہت لائی ہے۔ صرف آنکھوں اور بالوں کے رنگ کا فرق ہے۔''
فیروز خان سے کچھ پرانی سہیلیوں سے ملنے کا بہانہ کر کے وہ اپنے گھر پہنچ گئی اور جی بھر کر بیٹی سے ملی۔ لاہور کے قیام کے دوران تین چار بار وہ بیٹی سی جا کر ملتی۔ آخر بار گئی تو اماں بھی تھی۔
''کیوں آئی ہے' بھول جا اسے۔'' اماں کو اس کا آنا پسند نہیں آیا تھا۔
''میں تو بارہ کی ہوتے ہی اس کے لیے استاد رکھ دوں گی۔ زیادہ پڑھانے کی حماقت نہیں کروں گی۔ بس دس جماعتیں۔'' اور زہرہ نے بے بسی سے بہن کی طرف دیکھا جس نے ہولے سے اس کا ہاتھ دبایا۔
وہ لاہور سے واپس آئی تو بہت اداس تھی۔ بار بار ننھی گڑیا کا چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا تھا۔ کتنی من موہنی باتیں کرتی تھی اور کیسی بدنصیب تھی۔ اتنے بڑے باپ کی بیٹی اور ایک گانے والی کے گھر میں پل رہی تھی۔ کبھی کبھی تو اس کا دل چاہتا کہ ساری احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر فیروز خان کو سب کچھ بتا دے کہ پھر سوچتی لیکن ایک بیٹی کے لیے دوسری بیٹی اور آنے والے وجود سے ہی محروم نہ ہو جائے۔
اب کی بار فیروز خان لاہور جانے لگے تو اسے بھی ساتھ چلنے کو کہا۔ حالانکہ بیٹا صرف ایک ماہ کا تھا۔
''مجھے دو ماہ وہاں رہنا ہے اور اتنے دن میں تم سے اور اپنے بچوں سے دور نہیں رہ سکتا۔'' فیروز خان نے اصرار کیا۔
اور یہیں سے اس کی بدنصیبی شروع ہوئی۔ وہ ہفتہ دس دن بعد فیروز خان کی عدم موجودگی میں بیٹی سے ملنے جانے لگی۔ فیروز خان مل کے معاملات سیٹ کرنے کی وجہ سے اکثر صبح کو ناشتہ کر کے نکلتے اور رات آٹھ بجے تک واپس آتے۔
چوہدری جہانداد کو کسی طرح پتا چل گیا کہ وہ فیروز خان سے چھپ کر زرینہ کے گھر جاتی

ہے۔ رحمت چاچا' زرینہ کا خاص بندہ تھا اور اسی کی طرح لالچی اور حریص۔ جہانداد نے پیسے کا لالچ دے کر اسے ساتھ ملا لیا۔
چوہدری جہانداد نے فیروز خان سے کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ اس طرح کی لڑکیاں اعتبار کے قابل نہیں ہوتیں۔ زہرہ جمال بھی تمہارے ساتھ بے وفائی کر رہی ہے اور تمہاری عدم موجودگی میں اپنی ماں کے گھر جا کر کسی سے ملتی ہے۔ یقین نہ آئے تو رحمت چاچا سے پوچھ لو۔'' اور جب فیروز نے اس سے کچھ نہ پوچھا تو رحمت نے خود ہی اس کو بتا دیا۔
''بٹیا سے تو ملاقات ہوتی رہتی ہے' آپ سے عرصہ سے ملاقات نہ ہوئی تو ملنے چلا آیا۔''
فیروز خان کو یقین نہ آیا۔ درحقیقت اسے چوہدری جہانداد نے ہی اس کے پاس بھیجا تھا۔
''کیا کہہ رہے ہو تم؟'' رحمت چاچا نے کہا۔
''ملک صاحب! بٹیا تو ادھر کوٹھی پر آتی رہتی ہیں ہفتہ دس دن بعد' آپ کبھی نہ آئے۔''
اور پھر رحمت چاچا نے مزید جھوٹ بولا۔ وہ سب جو جہانداد نے اسے کہا تھا کہ ''زہرہ جمال وہاں کس سے ملتی ہے۔'' تب فیروز خان نے کہا۔
''میں نہیں مانتا' کوئی ثبوت دو۔'' تب رحمت چاچا نے کہا۔
''اب جس روز وہ آئیں' میں فون کر دوں گا۔''
فیروز خان کا کام ختم ہو چکا تھا اور ایک دو روز میں ان کی کراچی واپسی تھی۔ قسمت کی ماری زہرہ جمال نے سوچا جانے پھر کب آنا ہو' جاتے جاتے بیٹی سے مل لوں۔ فیروز خان شام تک واپس آنے کا کہہ کر بھائی پھیرو گئے تو زہرہ جمال بھی ہوٹل سے نکلی۔ دونوں بچے آیا کے پاس ہوٹل میں ہی چھوڑ دیے اور ابھی اسے وہاں پہنچے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ فیروز خان آ گئے۔ وہ انہیں دیکھ کر گھبرا گئی۔
''زہرہ جمال!'' فیروز خان جب بولا تو اس کی آواز پتھر کی طرح سرد تھی۔
''میں نے اپنی محبتوں اور چاہتوں کے عوض تم سے صرف تمہاری وفا چاہی تھی لیکن تم نے خیانت کی' مجھے دھوکا دیا۔ جہانداد صحیح کہتا تھا کہ تم سے وفا کی توقع عبث ہے۔''
''نہیں فیروز! میں نے کوئی بے وفائی نہیں کی۔ میں.....'' وہ چاہتی تھی کہ اب سب سچ بتا دے لیکن فیروز خان نے اسے ٹوک دیا۔
''میں نے تمہیں منع کیا تھا یہاں آنے سے' تم یہاں موجود ہو۔ کیا کسی اور ثبوت کی ضرورت ہے اور تم یہاں ایک بار نہیں' کئی بار آ چکی ہو۔ میں نے تمہیں طلاق.....'' زہرہ جمال نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن فیروز خان نے کھڑے کھڑے اسے تین بار طلاق دے دی۔
''یہ جھوٹ ہے' یہ جھوٹ ہے۔ میں نے تمہاری امانت میں کوئی خیانت نہیں کی۔'' وہ چیخ

رہی تھی۔

اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے اسے ایک ہی راستہ سجھائی دیا تھا۔ اس وقت وہ زرینہ کے کمرے میں کھڑی تھی اور زرینہ بھی وہیں بیٹھی تھی۔ زرینہ کے دراز میں ہمیشہ بھرا ہوا ریوالور رہتا تھا۔ اس نے جھٹ سے دراز کھول کر ریوالور نکال لیا اور سیفٹی کیچ ہٹایا۔

''فیروز! میں بے وفا نہیں ہوں' نہ تھی۔'' اور ساتھ ہی ریوالور کا رخ اپنی طرف کر لیا۔

''میری موت ہی میری وفا کا ثبوت ہے۔''

فیروز خان نے آگے بڑھ کر ریوالور چھیننے کی کوشش کی اور اسی دوران زہرہ کے اپنے ہاتھ کے دباؤ سے ٹریگر دب گیا اور گولی اس کی دائیں پسلی میں گھس گئی۔

''زہرہ...... زہرہ......'' فیروز خان نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

''پیچھے ہٹو۔'' زرینہ نے اسے دھکا دیا۔

''تمہارا اس سے اب کوئی رشتہ نہیں رہا' تم اسے طلاق دے چکے ہو۔'' زہرہ کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

''لیکن اسے ہاسپٹل......'' مگر زرینہ نے انہیں بات پوری نہ کرنے دی اور رحمت چاچا کو بلا لیا کہ انہیں باہر نکال دے۔

اور سچ تو یہ ہے کہ اب فیروز خان کا کوئی حق نہیں رہا تھا' وہ سر جھکائے باہر نکلے۔ ہوٹل آ کر پھر فون کیا تو پتا چلا کہ زہرہ کسی پرائیویٹ ہسپتال میں ایڈمٹ ہے۔

بچوں کو آیا کے ساتھ لے کر فیروز خان اسی روز کراچی چلے گئے اور وہاں مفتیوں اور علماء سے رابطے کرنے لگے کہ کیا تین طلاقیں ایک ساتھ کہہ دینے سے طلاق ہو گئی ہے یا کوئی گنجائش ہے۔ ابھی وہ الجھے ہوئے ہی تھے کہ لاہور سے زرینہ نے فون کر کے انہیں زہرہ جمال کی موت کی اطلاع دے دی جبکہ زہرہ جمال زندہ تھی اور اسپتال میں تھی لیکن چالاک زرینہ نے رانی کی موت سے فائدہ اٹھایا۔

رانی...... یہ لڑکی جانے کہاں سے اور کیسے زرینہ کے پاس پہنچی تھی۔ خوش شکل تھی اور زرینہ ان دنوں اسے گانے کی تربیت دے رہی تھی۔ اچانک اسے ہیضہ ہوا اور زہرہ جمال کے ہاسپٹل میں داخل ہونے کے پانچویں دن وہ مر گئی اور زرینہ نے فیروز خان کو زہرہ کی موت کی اطلاع دے کر گویا زہرہ جمال کا چیپٹر کلوز کر دیا۔

رانی کو فیروز خان کے کراچی پہنچنے سے پہلے ہی دفن کر دیا گیا' وہ آخری بار بیوی کا منہ بھی نہ دیکھ سکے۔ جب انہوں نے شکوہ کیا تو زرینہ نے کہہ دیا کہ نامحرم ہو چکی تھی۔ میں چاہتی تو تم پر کیس کر سکتی تھی کہ تمہاری وجہ سے میری بچی کی جان گئی لیکن اس کے بچوں کے طفیل جن کے تم باپ ہو' میں کچھ نہیں کر رہی۔''

یہ ساری باتیں زہرہ جمال کو اس کی بہن نے صحت یابی کے بعد بتائیں اور وہ اخبار دکھایا جس میں ملک فیروز خان کی بیوی زہرہ جمال کی موت کی خبر چھپی تھی۔

''یہ کیا کیا اماں آپ نے' میرے بچے۔'' وہ تڑپ اٹھی۔

''انہیں بھول جاؤ' یہاں یہ بچی ہے اس سے دل لگاؤ۔ یہاں لا کر تم انہیں کچھ نہیں دے سکو گی۔ ممکن ہے عدالت طویل مقدمے کے بعد تمہارے حوالے کر بھی دے لیکن وہاں اپنے باپ کے پاس رہ کر وہ بہترین زندگی گزاریں گے۔'' اماں نے ایک بار پھر اس کی گود خالی کر دی تھی۔ اسے اپنی ماں سے نفرت سی ہو گئی تھی۔ ماں نے اسے زہرہ جمال سے رانی بنا دیا تھا۔ آنکھوں میں براؤن لینس لگ گئے۔ بالوں کو بلیک ڈائی کروا دیا۔

''زہرہ جمال میانی والے قبرستان میں مٹی کے نیچے سوئی پڑی ہے۔ اب تم رانی ہو۔ ایک دو سال تک خود کو سنوارو' سنبھالو اور پھر اپنے کام سے لگ جاؤ۔''

زہرہ جمال کا ذہن کام نہیں کرتا تھا۔ بسا بسایا ہنستا کھیلتا گھر اجڑ گیا تھا۔ بچے چھن گئے تھے۔ حتیٰ کہ اس کی شخصیت اور نام تک باقی نہیں رہا تھا۔

فیروز خان نے طلاق دے دی تھی۔ واپسی کا کوئی راستہ نہ رہا۔ زرینہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اب تو اسے یہ بھی شک ہونے لگا تھا کہ وہ واقعی زرینہ کی بیٹی ہے۔ کیا خبر وہ بھی رانی کی طرح ہی کہیں سے بھٹکتی ہوئی پہنچی ہو۔ وہ کئی کئی دن کپڑے نہ بدلتی' بال نہ بناتی۔ بہن ہی تھی جو اس کا خیال رکھتی تھی۔

ہولے ہولے وہ سنبھلی تو اسے احساس ہوا کہ ماں نے اس کے خلاف سازش کی ہے اور یقیناً اسی نے فیروز خان کو اس کے متعلق اطلاع دی ہو گی کہ وہ یہاں ہے۔ اس نے ماں کی مرضی کے خلاف فیروز خان سے نکاح کیا تھا اور اس نے اسے ختم کروا دیا۔ وہ ماں سے اور بھی متنفر ہو گئی۔ تب وہ برقع پہن کر نوکری کی تلاش میں نکلی۔ اس نے دل ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر یہاں سے چلی جائے گی اور کسی الگ گھر میں رہے گی۔ اس نے ماس کمیونیکیشن میں ماسٹرز کر رکھا تھا۔ اسے جاب تو مل گئی لیکن زیادہ اچھی نہیں۔

امثل دم بخود بیٹھی سن رہی تھی۔ فاروق کے نام پر چونکی لیکن خاموش رہی۔ فاروق ایک بینک میں آفیسر تھا۔ متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ بیوہ ماں کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس نے زہرہ سے شادی کی خواہش ظاہر کی تو زہرہ نے اس سے کچھ نہ چھپایا۔ لفظ لفظ کہہ دیا۔ فاروق بڑے دل اور بڑے ظرف کا مالک تھا۔ اس نے زہرہ سے کہا کہ' وہ اسے اور اس کی بیٹی کو تحفظ دے گا۔ ہاں اس کے پاس زیادہ دولت نہیں یوں اپنی بیٹی کی خاطر زہرہ جمال نے فاروق سے شادی کر لی۔

اس کی بہن نے اس کا پورا ساتھ دیا۔ گو اس کے لیے اس کی بیٹی سے بچھڑنا مشکل تھا کیونکہ

اس نے ہی اسے پالا تھا۔ بچی بھی اپنی خالہ سے بہت مانوس تھی لیکن اس کے بہتر مستقبل کے لیے یہ ضروری تھا کہ اسے زرینہ کے سائے سے دور رکھا جائے۔ فاروق نے کوشش کر کے اپنا ٹرانسفر ملتان کروا لیا۔ سات سال ملتان میں رہنے کے بعد وہ واپس لاہور آ گئے۔ لوگ زہرہ کو بھول چکے تھے۔ اب زہرہ کو نہ تو لینس لگانے کی ضرورت تھی نہ بال ڈائی کرنے کی۔ یوں بھی وہ حجاب اوڑھنے لگی تھی۔

ساس کے علاوہ فاروق کے ایک دوست کی فیملی سے ہی اس کے تعلقات تھے۔ لاہور آئی تو کبھی کبھی بہن ماں سے چوری بچی سے ملنے آنے لگی۔

''ماما...... آپ......'' امثل کے ہونٹ لرزنے لگے۔

''ہاں، میں ہی زہرہ جمال ہوں۔'' انہوں نے گود میں رکھی فائل کو دیکھا۔

اور رحمو چاچا نے اسی پر بس نہ کیا بلکہ فیروز خان کو بلیک میل کرنے لگا کہ ریوالور پر اس کی انگلیوں کے نشانات ہیں، اس لیے وہ کسی وقت بھی پولیس کو جا کر بتا دے گا کہ فیروز نے اپنی بیوی کو قتل کیا ہے۔ فیروز خان جانتا تھا کہ یہ سچ نہیں ہے پھر بھی وہ کافی عرصہ تک اسے رقم دیتا رہا اور جب اس نے رقم دینے سے انکار کر دیا تو اس نے یہ کہانی لکھ کر کسی کے ہاتھ اخبار کے دفتر بھجوا دی۔

''ماما'' امثل حیران سی بیٹھی تھی، اس کے اندر ہلچل مچی ہوئی تھی۔

''ماما...... میں...... میں......'' اور لفظ اس کے اندر ہی گھٹ گئے۔

''ہاں تم...... تم فیروز خان کی بیٹی ہو۔ فاروق نے تمہیں اپنا نام دیا اور ہمیشہ بیٹی کی طرح چاہا لیکن وہ تمہارے باپ نہیں تھے، وہ صرف ہمایوں کے باپ تھے۔''

''تو وہ شخص جس کے آفس میں ایک بار وہ اس کی کہانی چھپوانے کی دھمکی دے کر بلیک میل کرنے گئی تھی، وہ اس کا باپ تھا، سگا باپ۔'' آنسو اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔

''ماما......'' اس نے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

''ماما! آپ نے کتنے دکھ سہے ہیں۔ ساری زندگی آپ کو کانٹوں پر ننگے پاؤں چلنا پڑا۔''

''ہاں، فاروق کی زندگی نے وفا نہ کی اور زندگی ایک بار پھر میرے لیے تپتا صحرا بن گئی لیکن تم تھیں، ہمایوں تھا، فاروق کے دوست تھے اور......''

''ماما!'' امثل کے آنسو ان کے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔

''میں نے اسے دیکھا تھا، سعدون کو۔'' امثل کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہ تھی۔

''ماما! وہ بہت خوبصورت تھا، ہومی جیسا۔ بس اس کی آنکھیں آپ جیسی نہ تھیں، بابا جیسی تھیں۔''

''تم نے اس سے بات کی تھی ثومی۔'' مسز فاروق کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

''نہیں ماما! لیکن ماما وہ ہومی کا دوست ہے، کبھی کبھی اسے میل بھیجتا ہے۔ میں اس سے کہوں گی کہ اس کی تصویر منگوائے۔ ماما! وہ بہت پیارا ہے۔''

''ماما!'' امثل نے سسکی سی لی۔

''پاپا نے مجھے بہت چاہا، میں بھی ان سے بہت محبت کرتی ہوں۔ وہ...... صرف وہی میرے پاس ہیں...... لیکن بابا...... بابا......''

''فاروق کہتے تھے، فیروز کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی، اس کا گھر برباد ہوا لیکن تقدیر کے سامنے آدمی بے بس ہے۔''

''ماما! مجھے لگتا ہے میرا دل پھٹ جائے گا۔ یہ دنیا اتنی ظالم کیوں ہے۔ چوہدری جہانداد کو، نائی کو، رحمت چاچا کو آپ کا گھر برباد کر کے کیا ملا ماما! کیا؟

ماما! میں ایک بار بابا کو آپ کی بے گناہی کا یقین دلاؤں گی۔ میں انہیں اصل کہانی ضرور بتاؤں گی ماما! کہ آپ نے ان سے بے وفائی نہیں کی۔''

مسز فاروق یکدم سنبھل گئیں۔

''نہیں امثل! نہیں۔ زہرہ جمال مر چکی، وہ دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتی۔ میں مسز فاروق ہوں اور تم فاروق کی بیٹی ہو۔ جو کچھ میں نے تم سے کہا اسے بھول جانا، اسے کبھی مت دہرانا۔ جس ہاسپٹل میں تم پیدا ہوئی تھیں، وہاں سے میں نے تمہارا برتھ سرٹیفکیٹ لے لیا تھا۔ اس میں تمہاری تاریخ پیدائش اور ولدیت موجود ہے۔ کبھی کسی مشکل میں پڑ جاؤ تو صرف اسی صورت میں فیروز خان کے پاس جانا۔ وہ تمہیں بیٹی تسلیم نہ بھی کر سکے لیکن تمہاری مدد ضرور کریں گے اور یہ فائل...... اسے ضائع کر دو۔'' مسز فاروق تھک گئی تھیں۔

صبح سے نہ جانے کتنی بار انہوں نے ماضی سے حال تک کا سفر طے کیا تھا بلکہ جب سے رحمو چاچا نے اعتراف کیا تھا، تب سے کتنی ہی بار وہ گزری زندگی کا ایک ایک لفظ دہرا چکی تھیں۔

فیروز خان نے پھر شادی نہ کی تھی۔ وہ ایک سچے اور کھرے انسان تھے۔

اس سارے قصے میں سب سے زیادہ نقصان کس کا ہوا تھا۔

فیروز خان کا، زہرہ جمال کا، امثل کا یا شین اور سعدون کا۔

شاید اپنی اپنی جگہ سب نے ہی زندگی ننگے پاؤں تپتی زمین پر چلتے گزاری تھی۔

گو ان انکشافات نے امثل کے اندر طوفان بپا کر دیا تھا لیکن ماں کی خاطر اس نے خود کو سنبھالا۔

''ماما پلیز...... آپ لیٹ جائیں، میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔''

ہمایوں جو اسکول سے آ کر دوسرے کمرے میں سویا ہوا تھا، آنکھیں ملتا ہوا اندر آیا۔

''السلام علیکم باجی! میں ظاہر کی طرف چلا جاؤں؟''

"ہاں' جاؤ لیکن مغرب تک آ جانا۔" امثل نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"لیکن مغرب تو ہونے والی ہے' میں زیادہ دیر سویا رہا۔"

"اچھا تو ایک گھنٹے تک آ جانا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ باہر چلا گیا۔ مسز فاروق آنکھیں موندے لیٹی تھیں۔ اس کے جانے کے بعد یکدم آنکھیں کھول دیں۔

"ثومی! ہومی کا بہت خیال رکھنا میرے بعد۔ میں جانتی ہوں' میں بہت دن نہیں جیوں گی۔"

"ماما! پلیز اس طرح کی باتیں نہ کریں۔ کیا مجھے ہومی سے محبت نہیں' کیا وہ میرا بھائی نہیں ہے؟"

"ہوسکتا ہے' کبھی تمہیں خیال آ جائے کہ اس کا باپ......"

"ماما! آپ...... آپ ایسی بات کرسکتی ہیں؟ ہومی مجھے اپنی جان سے بڑھ کر عزیز ہے۔"

"فریدوں بہت اچھا لڑکا ہے۔ اس کے گھر والے سب اچھے ہیں لیکن وہ فاروق جیسا اعلا ظرف نہیں ہے۔ وہ شاید تمہاری غلطی معاف نہ کرے۔ کبھی اسے دھوکا مت دینا اور نینی سے ملنے اس کے گھر مت جانا۔ ہاں نینی کا ہمیشہ احترام کرنا' اس نے تمہیں نو دس سال کی عمر تک پالا ہے اور اسی کے تعاون سے میں تمہیں معاشرے میں باعزت مقام دے سکی ہوں۔ اماں بوڑھی ہو چکی ہیں لیکن مجھے اماں سے اب بھی ڈر لگتا ہے' وہ کسی بھی وقت کچھ بھی کرسکتی ہیں' اس لیے ہمیشہ ان سے دور رہنا۔ نینی کو ملنا ہوا تو خود تم سے مل لیا کریں گی۔ نینی کا بھی تمہارے سوا اور کوئی نہیں۔"

"ماما! آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ ہمیشہ میرے ساتھ رہیں گی' میری رہنمائی کے لیے۔" وہ ہولے سے مسکرائیں۔

"ثومی' میری جان! کبھی کوئی کسی کے ساتھ ہمیشہ نہیں رہتا۔ میری زندگی سے سبق حاصل کرنا۔ اپنے شوہر سے کبھی کوئی بات نہ چھپانا۔ اس کی مرضی کے بغیر کبھی کچھ نہ کرنا۔"

"ماما! پلیز...... میں اب چیخیں مار مار کر رونے لگوں گی۔"

"اچھا جاؤ' چائے بناؤ۔" وہ چپ ہو کر رہ گئیں۔ لیکن صرف امثل کے سامنے۔ ایک پوری فلم تھی جو ان کے ذہن کے پردے پر تسلسل چل رہی تھی۔

کچن میں جا کر چائے بناتے ہوئے ایک ایک منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آ رہا تھا اور پھر وہ ایک منظر۔ بڑی سی ٹیبل کے پیچھے بیٹھا بردبار سا شخص جس کی پرسنالٹی میں بلا کی جاذبیت تھی' کنپٹیوں پر کچھ سفید اور گرے بال۔ چونک کر حیرت سے اسے دیکھتا ہوا۔ کاش وہ کچھ دیر اور انہیں دیکھ لیتی۔

"بابا...... بابا جان!" اس کے لبوں سے نکلا اور وہ یکدم کچن کے فرش پر بیٹھتے ہوئے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

❖❖❖

آج پورے دس سال بعد اس نے "قصر زہرہ" میں قدم رکھا تھا۔ دس سال زندگی کا ایک طویل حصہ۔ دس سال پہلے وہ سترہ اٹھارہ سال کی تھی۔ تب "قصر زہرہ" میں آتے ہوئے اس نے سوچا تھا۔ اس طرح اپنی ناراضی کا اظہار کر کے وہ بابا جان کی محبتیں جیت لے گی' انہیں احساس ہو جائے گا کہ ان کی بے نیازیاں' بے اعتنائیاں اسے تکلیف پہنچاتی ہیں' اسے ان کی توجہ اور محبت کی ضرورت ہے لیکن بابا جان نے اسے اپنے سے دور کر دینے کی سزا دے ڈالی تھی۔

اور وہ دو سال جو اس نے اس عقوبت خانے میں گزارے تھے' اس نے ایک جھرجھری سی لے کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ عباس گاڑی سے سامان اتروا رہا تھا۔

وہ روش عبور کرتے ہوئے اندرونی گیٹ تک آئی اور پھر وہیں پورچ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

فوارے کا پانی تالاب میں گر رہا تھا۔ لان کی گھاس تازہ تازہ کٹی ہوئی لگتی تھی جیسے بیچ میں دس سال گزرے ہی نہ تھے۔

وہ اب دس سال پہلے والی جذباتی لڑکی نہ تھی بلکہ اٹھائیس سالہ ایک نہایت سمجھ دار' باشعور بزنس ویمن تھی جس کی ایک ساکھ تھی' مقام تھا اور بابا جان کی ساری محبتیں اس کے لیے تھیں۔ وہیں بیٹھے بیٹھے اس نے دس سالوں کا ایک ایک لمحہ یاد کر ڈالا تھا۔

پہلے وہ اذیت ناک سال جو اس نے کاظم کی بیوی کی حیثیت سے گزارے تھے۔ ان کے تصور سے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔

وہ کسی غریب مزدور کی بیٹی نہ تھی اور نہ ہی کسی پسماندہ گاؤں میں رہنے والی ان پڑھ دیہاتن' پھر بھی اس کی حالت ان سے بہتر نہ تھی۔ ہر وہ ظلم جو ان کے دائرہ اختیار میں تھا' اس پر روا رکھا گیا اور کاظم جہانداد...... وہ تو نفسیاتی مریض تھا۔ اٹھارہ سالہ کم عمر درثمین تو حواس کھونے لگی تھی۔

پھر دو سال بعد اعظم اسے ملک ہاؤس چھوڑ گیا۔ اعظم اس کی سسرال کا وہ واحد فرد جو اس سے ہمدردی رکھتا تھا اور جس نے ایک شام جب وہ نڈھال سی پڑی تھی' آ کر کہا تھا۔

"بھابھی! اٹھیں' میرے ساتھ چلیں' اس گھر پر کوئی بھی نہیں ہے۔"

"لیکن کہاں؟" وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"آپ کے گھر۔"

''میرا گھر؟'' اس نے سوالیہ نظروں سے اعظم کو دیکھا۔ تب اعظم نے نم آنکھوں سے اسے دیکھا تھا۔

''ڈاکٹر کی طرف چلتے ہیں۔''

''ہاں اعظم بھائی! مجھے بہت درد ہو رہا ہے' بہت تکلیف ہے۔'' اس نے اپنے بازو سامنے کر دیے۔ ''جگہ جگہ سگریٹوں سے جلائے جانے کے نشان۔'' اعظم نے منہ پھیر لیا۔

''ہاں' آپ چلیں تو سب ٹھیک ہو جائے گا درد۔'' اور پھر اعظم اسے ملک ہاؤس چھوڑ گیا۔

ملک فیروز خان سے معذرت کرتا' گزرے دو سالوں کے ایک ایک پل کی داستان سناتا۔ ملک فیروز خان کی چیخیں ان کے اندر ہی گھٹ گئیں اور عباس نے اپنے ہونٹ چبا ڈالے۔ دونوں بار بار ثمین کی طرف دیکھتے جس کی آنکھوں میں پہچان کے رنگ بجھے بجھے سے تھے۔

یہ ان کی در ثمین تو نہ تھی' ہنستی کھلکھلاتی' شکوے کرتی' اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔ چہرے پر زردی کھنڈی تھی اور جسم نیلوں نیل تھا۔ اس کا تن ہی نہیں' من بھی نیلوں نیل تھا۔

ملک فیروز خان نے شہر کے بڑے بڑے ڈاکٹروں کو اکٹھا کر ڈالا۔ ان دنوں ان کی ساری مصروفیات ختم ہو گئی تھیں۔ عدالت میں خلع کا کیس کر دیا گیا تھا۔ وہ سارا وقت اس کے پاس رہتے' اس کے ہاتھ چومتے' اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے۔

''ثمو! بیٹا تم نے یہ سب بتایا کیوں نہیں' کہا کیوں نہیں آ کر مجھ سے۔ میں نے تو تمہاری خوشی کے لیے سب کچھ کیا جو ایک باپ کر سکتا ہے۔ کاظم کو پچاس لاکھ کی ضرورت تھی' وہ اپنا کاروبار الگ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے خاموشی سے دے دیے۔ اس نے تمہارے حصے کا مطالبہ کیا۔ میں نے قانوناً اور شرعاً تمہارا حصہ اس کے حوالے کر دیا۔ ثمو پھر بھی...... پھر بھی۔'' ان کے آنسو ان کے رخساروں پر بہہ آئے۔ وہ خالی خالی آنکھوں سے انہیں روتا دیکھتی' اسے اپنے بابا جان کی محبت کی چاہ تھی' وہ ان کی توجہ چاہتی تھی اور اب جیسے وہ پتھر ہو گئی تھی۔

ان دو سالوں میں وہ صرف تین چار بار ہی تو اس سے ملنے گئے تھے' وہ انہیں چپ تو لگی تھی لیکن انہوں نے زیادہ غور نہیں کیا تھا۔

وہ کبھی ملک ہاؤس نہیں آئی تو انہوں نے سوچا۔

کس کے پاس آئے گی۔

میں تو کبھی کہیں رہتا ہوں' کبھی کہیں اور یہاں صرف ملازم۔'' ایک بار تائی فاطمہ نے کہا تھا۔

''فیروز! ثمین کی خبر لی کبھی؟''

''تائی وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔''

''کبھی اسے گھر لا۔ ہفتہ دس دن کے لیے میرے پاس چھوڑ جا۔ کیا کہیں گے اس کے

سسرال والے کہ بہت بھاری تھی' وہ جب ہی تو رخصتی کے بعد خبر تک نہ لی۔''

تب وہ گئے تھے اسے لینے اور کاظم نے معذرت کر لی تھی۔

''انکل! ہم دونوں دو تین روز تک ورلڈ ٹور پر جا رہے ہیں۔ واپس آ کر ان شاء اللہ۔'' اور وہ ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہی تھی۔

''وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے' تائی گھومنے جا رہی ہے تفریح کرنے۔'' انہوں نے گھر آ کر تائی فاطمہ کو بتا دیا تھا۔

اور انہیں پتا کیوں نہ چلا کہ بیٹی اجڑی اجڑی سی ہے' اس کی آنکھوں میں وحشت ہے' ڈر ہے' خوف ہے۔ وہ تو بندے کے اندر کی بات تک جان لیتے تھے پھر بیٹی کا دکھ کیوں نہ جان پائے۔ شاید انہوں نے دھیان سے کبھی اسے دیکھا ہی نہ تھا۔

سو طرح کے بکھیڑے تھے۔

زمینیں' ملیں' اسمبلی کے اجلاس اور پھر سب سے بڑھ کر سعدون کی فکر۔

وہ او لیول نہیں کر سکا تھا' میٹرک سیکنڈ ڈویژن میں کر کے اب کالج میں داخلہ لے چکا تھا اور ایف ایس سی کر رہا تھا۔ وہ اسے اسلام آباد سے گھر لے آئے تھے۔ بظاہر وہ کالج جاتا اور گھر آ جاتا تھا لیکن پھر بھی کچھ تھا جو انہیں ڈسٹرب رکھتا تھا اور وہ ثمین کی طرف سے غافل ہی ہو گئے تھے۔ اب وہ اس کی حالت دیکھتے تو دل چاہتا اپنے بال نوچ لیں۔ تن کے زخم ہولے ہولے بھرنے لگے تھے لیکن روح پر لگے چرکے ہنوز اذیت دیتے تھے۔ آنکھوں میں پہچان کے مدھم رنگ کبھی کبھی نمایاں ہو جاتے۔

''بابا جان! مت روئیں' مجھے تکلیف ہوتی ہے۔'' وہ آنسو پونچھ لیتے اور کچھ دیر بعد ہی وہاں پھر اجنبیت کی برف ہوتی۔ انہوں نے ڈاکٹر اطہر کو بلا لیا۔ مشہور ماہر نفسیات۔ اب کئی کئی گھنٹے تک وہ اس سے بات چیت کرتے رہتے۔ عباس بے چین سا کوریڈور میں ٹہلتا رہتا اور اس کے کانوں میں اس کی سسکتی آواز گونجتی رہتی۔

''میری زندگی اگر برباد ہوئی تو اس کے ذمہ دار آپ ہوں گے' صرف آپ۔''

''آپ مجھے بچا سکتے تھے لیکن آپ نے بچایا نہیں۔'' وہ شکوہ کرتی محسوس ہوتی۔

ڈاکٹر اطہر پر امید تھے۔ وہ ہولے ہولے زندگی کی طرف پلٹنے لگی جس روز کھلے دروازے سے سعدون کو جاتے دیکھ کر بے اختیار اس نے پکارا تھا۔

''سعدی...... سعدون......''

تو ملک فیروز خان سجدے میں گر گئے تھے اور باہر سے گزرتا سعدون اندر کمرے میں آ گیا تھا۔ ان دو سالوں میں وہ کچھ اور لمبا ہو گیا تھا' دبلا پتلا۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی، بچپن میں وہ کتنا خوبصورت ہوتا تھا۔ راہ چلتے لوگ پیار کرتے۔ خوبصورت تو وہ اب بھی تھا لیکن جیسے

اس کی آنکھوں سے زندگی کی چمک ماند پڑتی جارہی تھی۔
''سعدون......'' وہ اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ ''یہ...... یہ تمہیں کیا ہوا ہے' کیا بیمار ہو؟''
''نہیں' ٹھیک ہوں۔'' سعدون کا چہرہ سپاٹ تھا۔
''نہیں' تم ٹھیک نہیں ہو۔ تم...... تم پھر سے نشہ کرنے لگے ہو سعدون!'' اس نے اس کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔
''نہیں' خود تمہیں اپنا ہوش نہیں' دوسروں کے متعلق اندازے مت لگاؤ۔'' وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑا ہو گیا تھا۔
''بابا جان! ہمارے کالج میں ٹورنامنٹس ہو رہے ہیں۔ میں آج دیر سے آؤں گا۔'' انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن ان کی نظریں سعدون کے چہرے پر تھیں۔
''کمال ہے' میں نے ایسا کیوں نہ سوچا۔ ثمین ٹھیک ہو رہی ہے۔ اس نے ہوش مندوں والی بات کی ہے بلکہ اس کی نظر اتنی گہری ہے کہ جس پہلو پر میں نے دو سالوں میں غور نہیں کیا' ثمین نے ایک ہی نظر میں۔'' وہ حیرت و طمانیت کے ملے جلے احساسات میں گھر گئے۔

اور پھر ثمین تیزی سے صحت یاب ہوتی گئی۔ عباس کے مشورے پر انہوں نے اسے دوبارہ کالج میں داخل کروا دیا۔ گو چوہدری جہانداد نے انہیں پیغام بھیجا تھا کہ وہ عمر بھر طلاق نہیں دیں گے اور ملک فیروز خان عدالتوں کے چکر لگاتا رہے گا لیکن جب اعظم بھائی اور گھر والوں کے خلاف گواہوں کے کٹہرے میں کھڑا ہوا تو کاظم نے خود ہی طلاق بھجوا دی۔
وہ نارمل ہو گئی تھی لیکن بہت بدل گئی تھی۔ سنجیدہ اور بردبار سی۔
عباس کا جی چاہتا وہ پہلے کی طرح ہنسے بولے' اس سے لڑے' ضدیں کرے لیکن وہ اس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتی بھی نہ تھی' نہ خود سے کوئی بات کرتی۔ عباس کوئی بات پوچھتا تو بنا اس کی طرف دیکھے جواب دے دیتی۔ اب فیروز خان اس سے باتیں کرتے رہتے تھے۔ اس کے بچپن کی' سعدون کی اور وہ خاموشی سے سنتی رہتی۔ نہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلتی تھی' نہ آنکھوں میں زندگی دمکتی تھی۔ عباس کو یوں لگتا جیسے زندگی اس کے اندر مر گئی ہے اور اس کا قاتل وہ ہے۔
وہ عباس تیمور جسے اس کی زندگی سے زیادہ اپنی عزت پیاری تھی جسے خوف تھا کہ اگر اس نے بابا جان کے سامنے اس کے لیے ہاتھ پھیلایا تو ان کا اعتبار کرچی کرچی ہو جائے گا۔ وہ ان کی نظروں میں گر جائے گا' بے گھر ہو جائے گا۔ وہ خود غرض ہو گیا تھا۔ وہ ثمین کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ دیتے بلا سے لیکن اس کا ضمیر تو مطمئن ہوتا کہ اس نے اپنی سی کوشش تو کی لیکن اب ضمیر کی چبھن اسے بے قرار رکھتی تھی۔ تب ہی تو ملک فیروز خان کے اصرار کے باوجود وہ شادی

کے لیے رضامند نہ ہوتا تھا۔
وہ خود سے کسی سے بات نہ کرتی تھی۔ ہاں سعدون تھا جس کا وہ انتظار کرتی جس کے کمرے میں خود جا کر اس سے کوئی نہ کوئی بات کرنے کی کوشش کرتی اور وہ ہوں ہاں کرتا رہتا۔
''سامان رکھوا دیا ہے ثمین! آپ اندر چلیں۔'' وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔
''آتی ہوں' آپ چلیں۔'' ثمین نے اس کی طرف دیکھا نہیں تھا۔
''ثمین! ایک بار...... صرف ایک بار میری طرف دیکھ لیں' میری التجا سن لیں۔'' اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہا اور پھر واپس چل دیا' تب ہی ثمین نے پوچھا۔
''سعدون کا کمرہ سیٹ ہو گیا ہے؟'' اس نے مڑ کر دیکھا۔
''جی' وہ تو میں نے اتوار کو ہی سیٹ کروا لیا تھا۔ ابھی دیکھ لیتا ہوں۔''
وہ کچھ دیر عباس کو جاتا ہوا دیکھتی رہی پھر سامنے فوارے کی طرف دیکھنے لگی۔ مما نے یہ فوارہ اپنی پسند سے بنوایا تھا۔ بابا جان نے اسے بتایا تھا کہ جب وہ پہلی بار ''قصر زہرہ'' میں آئے تھے تو ابھی لکڑی کا کام ہو رہا تھا اور زہرہ جمال نے کہا تھا کہ ''اس قصر زہرہ میں ایک چیز کی کمی ہے اور وہ ہے فوارے کی۔'' فوارے پر نظریں جمائے وہ پھر ماضی میں پہنچ گئی تھی۔
وقت کتنی جلدی گزر رہا تھا لیکن نہیں' جلدی کہاں۔ ایک ایک لمحہ ایک صدی تھا۔ اس نے ایم بی اے کر لیا تھا۔ کامیابی کی منزلیں طے کرتی وہ تو اس مقام تک آ گئی تھی جہاں پر دیکھنے کی خواہش بابا جان نے سعدون کے لیے کی تھی لیکن سعدون تو ایف ایس سی بھی کلیئر نہیں کر سکا تھا۔
''سعدون! یہ کیا ہے؟'' ملک فیروز خان اس کی مارکس شیٹ ہاتھوں میں لیے بیٹھے تھے۔
وہ اس طرح تو نہ تھا۔ اتنا ذہین اور قابل تھا وہ بچپن میں۔ اس کے ٹیچرز کہتے تھے کہ اس کا آئی کیو بہت اچھا ہے' نارمل ذہانت والے لوگوں سے کہیں زیادہ۔
''بابا! میرا جی نہیں چاہتا پڑھنے کو۔'' وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔
ملک فیروز خان چپ چاپ اسے دیکھتے رہے۔ ثمین کو چند دن پہلے ہی اعظم چھوڑ گیا تھا۔ اس کی حالت پر بہنے والے آنسو ابھی تھمے نہ تھے' ابھی ان کا دل اسی صدمے سے نڈھال تھا۔
''تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''
''پتا نہیں۔'' اس کے چہرے پر بے بسی تھی۔
''میرے ساتھ آفس چلا کرو' کام سمجھنے کی کوشش کرنا۔''
لیکن وہ تو وہاں بھی فوراً بے زار ہو گیا تھا۔ ثمین کی حالت کے پیش نظر وہ اکثر جلدی اٹھ آتے تھے۔ انہیں پتا چلا کہ وہ اکثر آفس میں سو جاتا ہے پھر اس نے کیشیئر سے لمبی لمبی رقمیں لینی شروع کر دیں تو انہوں نے باز پرس کی۔

''کیوں' کیا میرا حق نہیں ہے کچھ۔ سب صرف ثمین کا ہے؟ اس کا حصہ آپ نے اسے دے دیا پھر بھی لٹا رہے ہیں۔''

وہ حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ سعدون نہیں بول رہا تھا پھر کون تھا اس کے پیچھے؟ انہوں نے عباس سے کہا کہ وہ مسلسل اس پر نظر رکھے۔ وہ کس سے ملتا ہے' کہاں جاتا ہے تو حیرت انگیز انکشاف نے انہیں دہلا کر رکھ دیا۔

وہ اب بھی سر تنویر سے ملتا تھا جو کرشن نگر میں دو کمرے کے ایک تنگ سے گھر میں رہتا تھا۔ وہ باقاعدہ نشہ کرنے لگا تھا اور آج کل ایک دوبار کاظم کے ساتھ بھی دیکھا گیا تھا۔ وہ سر پکڑ کر رہ گئے۔

یہ کیا تھا اور کیوں تھا' انہوں نے اپنے بچوں کے لیے ایسے خواب تو نہ دیکھے تھے پھر یہ کس گناہ کی سزا مل رہی تھی انہیں۔ کیا زہرہ جمال پر انجانے میں وہ کوئی ظلم کر بیٹھے تھے۔ غصے میں وہ خود پر کنٹرول نہیں کر سکے تھے لیکن بعد میں کتنا پچھتائے تھے وہ۔ کم از کم بچوں کی خاطر سمجھوتا کیا جا سکتا تھا۔ انہیں اسے موقع تو دینا چاہیے تھا صفائی کا لیکن دل پر چوٹ بھی تو شدید لگی تھی اور اگر غلطی ان کی تھی تو سزا بھی انہیں ہی ملنا چاہیے تھی' ان کے بچوں کو نہیں۔

ایک بار پھر انہوں نے اسے ہاسپٹل میں داخل کروا دیا تھا لیکن اب وہ بچہ نہیں تھا اور پھر اگر وہ خود نشہ ترک نہیں کرنا چاہتا تھا تو ان کی کوشش بے کار تھی پھر بھی انہوں نے ایک پرائیویٹ ہاسپٹل میں ہر طرح کی سیکورٹی کے ساتھ اس کا علاج شروع کر دیا تھا۔ عباس چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ ان دنوں ثمین کافی سنبھل گئی تھی اور اس نے کالج جانا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ سعدون پر مکمل توجہ دے سکتے تھے۔

وہ اسے سمجھاتے تھے' محبت سے' پیار سے' لیکن نہ تو اس پر ان کی محبت نے اثر کیا تھا' نہ آنسوؤں نے۔

ایک بار پھر مسلسل ایک سال ہاسپٹل میں رکھنے کے بعد وہ اسے گھر لے آئے تھے۔ اس کے چہرے کی رنگت لوٹنے لگی تھی۔ آنکھوں کے نیچے پڑے حلقے بھی کم ہو گئے تھے۔ درثمین اکثر کالج سے آ کر اس کے پاس بیٹھی اس سے لایعنی باتیں کرتی رہتی تھی۔ وہ زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا لیکن وہ بولتی رہتی تھی' کبھی کبھی وہ گلہ کرتی۔

''سعدون! تم تو میرے بھائی تھے' تم نے بھی میری خبر نہ لی؟'' تو وہ حیران ہوتا۔

''کیا ہوا؟''

اور جب وہ اپنے بازو اسے دکھاتی' جہاں اب بھی جلنے کے نشان تھے تو اس کی رنگت سرخ پڑ جاتی۔ وہ کبھی کبھی مٹھیاں بھینچ لیتا۔

''میں اسے مار دوں گا۔'' ایک بار اس نے غصے سے کہا تھا۔

''وہ...... انہوں نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا سعدون! اور اب تمہارے ذریعے بابا کو مزید دکھ دینا چاہتے ہیں۔''

وہ ہولے ہولے اسے حالات سے باخبر کرتی رہتی تھی تاکہ وہ سب جان سکے اور اس کے اندر زندگی سے دلچسپی پیدا ہو۔ فیروز خان اسے سراہتے۔

اس روز اخبار میں خبر آئی تھی۔ تنویر نامی شخص جو کرشن نگر میں رہتا تھا' کسی نے چھریاں مار کر اسے ہلاک کر دیا تھا۔ تصویر دیکھ کر عباس نے اخبار اسے اور بابا جان کو دکھایا۔

''یہ وہی شخص ہے' سعدون کی تباہی کا ذمہ دار اور ایسے لوگوں کا ایسا ہی انجام ہوا کرتا ہے۔''

سعدون نے بھی تصویر دیکھ لی تھی۔ ثمین نے دیکھا' وہ اس روز روتا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ان دنوں کھانے کی میز پر' شام کی چائے پر وہ کوئی نہ کوئی بات کرنے لگا تھا پھر ایک روز اس نے پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔ ملک فیروز خان بہت خوش ہوئے۔

''میں تمہارے لیے ٹیوٹر کا انتظام کر دیتا ہوں۔'' کچھ دن وہ بہت توجہ سے پڑھتا رہا۔ گھر میں چلتا پھرتا ثمین کو وہ بہت اچھا لگتا تھا لیکن پھر پتا نہیں کیا ہوا' ایک دن اچانک وہ گھر سے چلا گیا۔ ملک فیروز خان کے بیڈ روم میں ان کے بریف کیس سے دس لاکھ روپے لے کر گھر سے بھاگ گیا۔

''صرف دس لاکھ۔'' ملک فیروز خان رو پڑے۔ ''یہ سب کچھ تو اسی کا تھا اور وہ صرف دس لاکھ لے کر بھاگ گیا۔''

پھر کتنا ہی تلاشا انہوں نے۔ اخبارات میں اشتہارات دیے' ٹی وی اور ریڈیو پر اعلان کرایا لیکن سعدون تو اس دنیا کی بھیڑ میں ایسے کھویا تھا کہ پھر کبھی ملا ہی نہیں۔ سعدون کے دکھ نے ملک فیروز خان کے دل کو بیمار کر ڈالا تھا۔ اس پر چوہدری جہانداد تھا جس نے بڑی ہوشیاری سے اماں پھیرو والی مل پر قبضہ کر لیا تھا۔ ثمین کے حصے کے شیئرز تو وہ پہلے ہی کاظم کے حوالے کر چکے تھے اور مارکیٹ میں جو شیئرز فروخت کیے جا چکے تھے' وہ سارے شیئرز خرید کر ایک روز چوہدری جہانداد اپنی مونچھوں کو بل دیتا ان کے آفس میں آ گیا۔

''تم یہاں کیوں آئے ہو جہانداد!'' انہوں نے بمشکل خود پر قابو رکھا تھا' ورنہ اس شخص کو سامنے دیکھ کر ان کے وجود میں آگ بھڑک اٹھی تھی۔

''تمہاری کوئی بیٹی نہیں ہے جہانداد! لیکن جو ظلم تم نے میری بیٹی کے ساتھ کیے' اس کا بدلہ کہیں نہ کہیں تمہیں ضرور ملے گا۔''

''بدلہ تو جب ملے گا تب ملے گا فیروز خان! اس وقت یہ سیٹ خالی کر دو۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب بہت صاف ہے' میرے پاس اس وقت اس مل کے ساٹھ فیصد شیئرز ہیں۔ سوان

کی رو سے یہ سیٹ میری ہے اور مناسب تو یہی ہے کہ بقیہ کے چالیس فیصد بھی مجھے ہی دے دو۔'' اور انہوں نے ایسا ہی کیا تھا۔

سعدون چلا گیا تھا۔

ثمین کی زندگی کے رنگ بجھ گئے تھے اور خود انہیں دولت و جائیداد سے دلچسپی نہ رہی تھی لیکن عباس اور ثمین نے دل ہی دل میں عہد کرلیا تھا کہ انہیں ایک بار یہ مل چوہدری جہانداد کے ہاتھ سے لینی ہے' واپس۔

❖❖❖

اور ابھی ایم بی اے کی ڈگری اسے ملی نہ تھی کہ یکا یک اسمبلیاں ٹوٹ گئیں۔ بہت سارے لوگ پکڑے گئے۔ کرپشن کا الزام لگا کر کئی بڑے لوگوں کو احتساب کمیٹی کے حوالے کردیا گیا۔

ملک فیروز خان مطمئن تھے۔ انہوں نے کوئی کرپشن نہیں کیا تھا۔ ان کے ہاتھ صاف تھے۔ وہ تو کچھ تعمیری کام کرنے کے لیے سیاست میں آئے تھے اور ان کے سیاست میں آنے کے بعد دوبار الیکشن ہو چکے تھے۔ دونوں بار وہ اس لیے کامیاب ہوئے تھے کہ واقعی انہوں نے کچھ کیا تھا' اپنے علاقے اور لوگوں کی بھلائی کے لیے اور اب ایک بار پھر اسمبلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ وہ چند لوگ جنہیں گرفتار کیا گیا تھا' وہ کیا کرتے رہے تھے ملک فیروز خان جانتے تھے۔ کسی کے ہاتھ بھی صاف نہ تھے۔

اور وہ تو اس وقت حیران رہ گئے جب انہیں گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے تمام اکاؤنٹ منجمد کردیے گئے اور وہ جو توقع کررہے تھے کہ اب کرنل سعید جیسے لوگوں کا احتساب ہوگا۔ گو وہ ان ہی کی پارٹی کے تھے لیکن کرنل سعید نے جس طرح قومی خزانہ لوٹا تھا' جائیدادیں بنائی تھیں اور غریب عوام پر ظلم کیا تھا' ان کا خیال تھا وہ تو سب سے پہلے احتساب کی زد میں آئیں گے لیکن انہیں نئے سربراہ کے پہلو بہ پہلو بیٹھے دیکھ کر وہ حیرت زدہ رہ گئے تھے۔

یہ کیسا احتساب تھا جو چند ایک کے لیے تھا۔ انہوں نے بہت سارے لوگوں کو وفاداریاں بدلتے دیکھا اور ابھی حیرت سے نکل بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوکر جیل پہنچ گئے۔ کیا یہ کوئی سازش تھی؟ کیا اس کے پیچھے بھی چوہدری جہانداد کا ہاتھ تھا؟ وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔

ثمین نے عباس سے کہہ کر بہترین وکیل مقرر کیے تھے لیکن یہ تین سال آزمائش کے سال تھے اور ان تین سالوں میں ثمین نے جس طرح بکھرا ہوا بزنس سنبھالا تھا' دادو والی دیوالیہ ہوتی مل کو نئے سرے سے زندہ کیا تھا۔ وہ سب حیران کن تھا۔ عباس کبھی کبھی بہت حیران ہوکر اسے فیصلے کرتے اور مختلف فائلوں پر سائن کرتے دیکھتا۔

''یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے والی لڑکی کبھی اتنی سنجیدہ اور بردبار بھی ہوسکتی ہے۔''

ایم بی اے میں کامیابی کی خبر اس نے جیل میں فیروز خان کو دی تھی اور ہفتہ بھر پہلے جب وہ انہیں بھائی پھیرو والی مل کی واپسی کی خبر دینے آئی تھی تو فیروز خان کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ثمین اس طرح ان کے برباد شدہ بزنس کو سنبھالے گی۔

اس نے چوہدری جہانداد کی چال ان ہی پر الٹی تھی۔ کاظم عیاش تھا اور پیسہ اپنی عیاشی پر پانی کی طرح لٹاتا تھا۔ سو بھائی پھیرو کی مل کے شیئرز اس نے پچاس فیصد سے زیادہ فروخت کردیے تھے اور بیچتا رہتا تھا۔ ثمین خاموشی سے یہ شیئرز خریدرہی تھی پھر ایک روز اس نے عباس سے کہا کہ وہ مارکیٹ سے سارے شیئرز اکٹھے کرلے۔ وہ لوگ جو شیئرز کی قیمت گر جانے سے نقصان کی فکر میں مبتلا تھے' جب شیئرز کی قیمت بڑھتی دیکھی تو دھڑا دھڑ فروخت کرنے لگے اور ثمین بالکل جہانداد کی طرح ایک روز عباس کے ساتھ چوہدری جہانداد کے سامنے کھڑی کہہ رہی تھی کہ سیٹ خالی کردیں۔

جیل میں ملک فیروز خان کو جب اس کی کامیابی کی اطلاع ملتی تو جہاں وہ اس پر فخر محسوس کرتے وہاں اس کی برباد زندگی کا دکھ بھی رلاتا اور سعدون کی یاد بھی بہت شدت سے آتی۔

پتا نہیں غلطی ان سے کہاں ہوئی تھی؟

کم عمری میں ہوسٹل بھیج کر؟ لیکن بہت سارے والدین بچوں کی بہتری کے لیے ان کو ہوسٹل بھیج دیا کرتے ہیں۔

اسے اپنی توجہ نہ دے کر جس عمر میں اسے باپ کی گائیڈنس کی ضرورت تھی' اس عمر میں خود سے دور کرکے۔ اس کی سرگرمیوں سے غافل رہ کر یا پھر ان کا نصیب۔

❖❖❖

''درثمین!'' عباس نے قریب آکر آہستہ سے آواز دی تو وہ چونکی اور پلکوں پر چمکتے موتیوں کو انگلی کی پوروں سے پونچھا۔

''آپ چلیں گی ساتھ؟''

''نہیں۔'' اس نے نظریں اٹھائیں۔ ''آپ لے آئیں جاکر' ڈاکٹرز سے بات ہوگئی تھی؟''

''جی!''

''تو ٹھیک ہے' آپ جائیں۔'' وہ ہولے ہولے قدم اٹھاتی اندر داخل ہوئی۔

ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھتے ہی پھولوں کی مہک نے اس کا استقبال کیا۔

سعدون کے استقبال کا یہ انداز اسے اچھا لگا تھا۔ خود اس کے ذہن میں ایک بار آیا تھا کہ وہ عباس سے کہے' آج قصر زہرہ کو پھولوں سے آراستہ کردو لیکن پھر اس نے دل کی بات دل ہی میں رہنے دی تھی لیکن عباس نے وہی کیا تھا جو اس کے ذہن میں تھا' بلکہ ان بیتے سالوں میں

عباس ہمیشہ وہی کرتا رہا تھا جو وہ سوچتی تھی۔ تقریباً آٹھ ماہ قبل یہاں سے قصر زہرہ کے نگران نے اطلاع دی تھی کہ اس نے سعدون کو یہاں دیکھا ہے اور ادھر ادھر سے معلوم کرنے پر پتا چلا ہے کہ وہ ایک جھگی میں رہتا ہے اور عباس اطلاع پاتے ہی اسی وقت روانہ ہو گیا تھا۔

آٹھ ماہ سے سعدون بہترین ڈاکٹروں کی نگرانی میں زیر علاج تھا۔ ایک ہفتہ قبل ڈاکٹرز نے اسے گھر لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ نشے نے اس کے پورے اعصابی نظام کو تباہ کر ڈالا تھا۔ اس کے گردے بھی متاثر تھے اور بھی کئی پرابلمز تھے۔ وہ چھبیس سال کی عمر میں پچاس سال کا لگ رہا تھا لیکن ثمین نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس کی زندگی کی جنگ لڑے گی' آخری سانسوں تک۔

اس نے قصر زہرہ میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہاں اس نے زندگی کی ابتدا کی تھی۔ اس گھر میں وہ اور سعدون جب رہتے تھے تو زندگی میں کوئی مسائل نہ تھے۔ بھائی پھیرو کی مل میں قابل اعتبار لوگ تھے۔ پندرہ بیس دن بعد عباس چکر لگا آیا کرے گا۔ اس نے سب کچھ طے کر لیا تھا اور ملک فیروز خان سے بھی بات کر لی تھی جو ایک دو روز میں ضمانت پر رہا ہونے والے تھے۔ ان کے وکیل نے ایک بار پھر ضمانت کے لیے درخواست دے دی تھی اور اس بار اسے پوری امید تھی کہ ضمانت ہو جائے گی۔ اس نے سعدون کی بیماری کا پوائنٹ بھی رکھا تھا۔ سعدون کو دیکھنے وہ صرف ایک بار آئی تھی اور وہ بھی ہاسپٹل سے ہی دیکھ کر واپس چلی گئی تھی۔ اس نے سعدون کے کمرے کا دروازہ کھولا تو وہاں بھی پھولوں نے اس کا استقبال کیا۔

''کیا ہی اچھا ہو کہ آج ہی بابا جان بھی آ جائیں۔'' اس نے بے اختیار خواہش کی۔ آج عدالت میں ان کی پیشی تھی۔ واپس آ کر لاؤنج میں بیٹھ گئی تھی۔ ریشم کچن سے نکل کر اس کے پاس آئی۔

''السلام علیکم بی بی!''

''وعلیکم السلام۔ کیسی ہو؟''

''اچھی ہوں۔'' وہ شرما گئی۔ ''میرا خوند (خاوند) بہت خیال رکھتا ہے میرا۔'' اس کی شادی ہو گئی تھی۔

''یہ تو اچھی بات ہے۔'' ثمین بھی مسکرائی۔ ''اب اچھی سی چائے پلواؤ۔''

''جی ابھی لائی۔'' ریشم واپس چلی گئی تو اس نے صوفے کی پشت سے سر ٹیکتے ہوئے آنکھیں موند لیں۔

وہ سونا چاہتی تھی لیکن اسے سعدون کا انتظار تھا۔ گو ڈاکٹرز اس کی زندگی سے زیادہ پُرامید نہ تھے' اس کی صحت کی رفتار بہت آہستہ تھی لیکن پھر بھی ان آٹھ ماہ میں وہ بہت بہتر ہو گیا تھا اور پھر سب سے بڑی بات اس کے اندر احساس پیدا ہو گیا تھا ثمین کا' بابا جان کا۔ وہ عباس سے ہمیشہ

ان کے متعلق باتیں کرتا تھا اور اس کے اندر زندگی کی امنگ بھی پیدا ہو گئی تھی اور جب ڈاکٹرز نے کہا کہ اب گھر میں بھی اس کا ٹریٹ منٹ ہو سکتا ہے تو اس نے یہاں قصر زہرہ میں ہی رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لاہور سعدون کو راس نہیں آیا تھا۔

وہ یہاں تھا تو زندگی کتنی خوبصورت اور مکمل تھی۔ گو دل ہی دل میں بابا جان سے اس کی ناراضیاں چلتی رہتی تھیں پھر بھی۔

''چائے بی بی!'' ریشم نے چائے لا کر رکھی تو ثمین نے آنکھیں کھول دیں اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ابھی کپ اس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ باہر گیٹ پر ہارن کی آواز آئی اور پھر گیٹ کھلنے کی۔ اس نے کپ رکھ دیا اور کھڑی ہو گئی۔ اس کے اندر جیسے طوفان آ گیا تھا۔

اندرونی گیٹ کھلا۔

سٹنگ روم سے ہوتے ہوئے عباس اور سعدون نے ٹی وی لاؤنج میں قدم رکھا۔ لمحہ بھر دونوں اپنی جگہ کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر ثمین تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

''سعدی...... سعدون......'' دونوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ دونوں رو رہے تھے۔ سعدون کا ہاتھ ثمین کے ہاتھوں میں تھا۔ کمزور سا ہاتھ جس کی رگیں ابھری ہوئی تھیں۔ جانے کب تک وہ روتے رہتے کہ عباس نے آگے بڑھ کر ہولے سے سعدون کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔ خود عباس کی آنکھیں نم تھیں۔

''ریلیکس سعدون!'' وہ مسکرایا اور پھر ثمین کی طرف دیکھا۔

''ثمین! پلیز' سعدون بہت کمزور ہے۔'' وہ اسے لے کر آگے بڑھ گیا۔

سعدون کے کمرے میں اس کے بیڈ کے سامنے بیٹھتے ہوئے ثمین مسکرائی۔

''سعدی! عباس نے تمہارے لیے تمہارے کمرے کو پھولوں سے سجایا ہے۔ اچھا لگ رہا ہے نا تمہارا کمرہ۔''

''ہاں۔'' وہ بھی مسکرا دیا۔ ''ثمین! میں نے تمہیں اور بابا جان کو بہت دکھ دیے ہیں' مجھے معاف کر دو گی نا۔''

''سعدی! ایسا مت کہو۔''

''میں بہت بے وقوف تھا۔ بہت ساری باتیں مجھے بہت دیر سے سمجھ میں آئیں۔ جب میں گھر سے پیسے لے کر بھاگا تھا تو اس کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ میں خود نشہ چھوڑنا چاہتا تھا اور واپس آنا چاہتا تھا لیکن مجھ میں بابا جان کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ میں تم سے' بابا سے' عباس سے سب سے شرمندہ تھا۔ جب بابا نے مجھے علاج کے لیے ہاسپٹل داخل کروایا' میں گھر آتے ہی پھر نشہ کرنے لگتا تھا۔ میری زندگی کی بربادی میں سر تنویر کا ہاتھ ہے۔ میں اس شخص کو کبھی معاف نہیں کروں گا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''میں اس سے بہت محبت کرتا تھا لیکن وہ ایک گندہ اور غلیظ آدمی تھا۔ جب بابا جان نے مجھے اسلام آباد بھیجا تھا تو میں نے اسے بتا دیا تھا۔ وہ وہاں بھی آ جاتا تھا مجھ سے ملنے۔''

''پلیز سعدون!'' ثمین نے اسے روک دیا۔ ''جو گزر گیا وہ ماضی تھا' اسے بھول جاؤ۔ آج سے تمہاری نئی زندگی شروع ہوئی ہے۔''

''میں نے اپنی موت کی بہت دعائیں مانگی تھیں لیکن اب میں زندہ رہنا چاہتا ہوں لیکن اب موت کی دستکیں میرے کانوں میں سنائی دیتی ہیں۔ ثمین! میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ' بابا کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔''

''تم زندہ رہو گے سعدون! میرے لیے' بابا کے لیے۔ تمہاری صحت کچھ بہتر ہو جائے تو ہم تمہیں باہر لے جائیں گے۔ گردہ بدل بھی جاتا ہے سعدی! تمہارا صرف ایک گردہ خراب ہے' دوسرا تو کام کر رہا ہے۔ ضرورت پڑی تو میں تمہیں اپنا گردہ دے دوں گی اور پھر ہم سب دعا بھی تو کریں گے۔ میں' بابا اور...... اور...... عباس...... بس تم اپنے اندر زندگی کی امنگ مرنے نہ دینا۔ سعدون! مجھے اور بابا کو تمہاری بہت ضرورت ہے۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ مجھ سے اب یہ سارا بوجھ سنبھالا نہیں جاتا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ تو پھر تم نے ہی سنبھالنا ہے سب۔''

سعدون کی آنکھوں میں پھر آنسو جمع ہونے لگے تو سعدون کے بیڈ کے سرہانے کھڑے عباس نے پھر ملتجی نظروں سے ثمین کی طرف دیکھا۔ ثمین نے سعدون کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''تم کچھ دیر آرام کرو سعدون! باقی باتیں پھر کریں گے' ٹھیک ہے نا۔'' وہ مسکرائی۔

عباس نے سعدون کو ویلیم دی' کچھ دیر بعد ہی وہ سو گیا تو ثمین اور عباس اس کے بیڈ روم سے باہر نکل گئے۔ لاؤنج میں آتے ہی ثمین کا چہرہ پھر پہلے جیسا ہو گیا تھا۔ سپاٹ' سنجیدہ۔

''آپ اپنے لیے بابا جان کے ساتھ والا بیڈ روم سیٹ کر لیں۔ وہی جس میں آپ ہمیشہ رہتے تھے اور انیکسی بھی چیک کر لیں ایک دفعہ۔ وہاں مس امثل اور اس کا بھائی رہے گا۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں ہونا چاہیے۔''

''میرے خیال میں وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔''

''ایک چھوٹا فریج رکھوایا تھا وہاں کچن میں؟''

''آج پہنچ جائے گا۔'' عباس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کس قدر سخت کر لیا تھا اس نے اپنا دل۔

''اور آپ کل صبح کی فلائٹ سے لاہور چلے جائیں۔ امید ہے کہ کل بابا جان کی ضمانت ہو جائے گی۔ یہاں آنے سے پہلے ایک بار بابا جان کا مکمل چیک اپ کروا لیجیے گا ڈاکٹر رندھاوا سے۔'' عباس نے سر ہلایا۔

''اور میرا سامان کہاں رکھوایا تھا آپ نے؟''

''اوپر آپ کے روم میں۔''

''سعدون کے ساتھ والا گیسٹ روم میرے لیے ٹھیک رہے گا۔ میں یہاں سعدون کے قریب ہی رہنا چاہتی ہوں بلکہ جب تک وہ مزید بہتر نہیں ہو جاتا' میں اسی کے روم میں رہوں گی۔'' وہ جانے کے لیے مڑا تو اسے پھر کچھ یاد آیا۔

''مس امثل سے کہیے گا وہ پہلی فرصت میں وہاں کا کام نبٹا کر یہاں آ جائیں۔ اور یہاں کے آفس کا کیا بنا؟''

''میں نے جگہ لے لی تھی' بس تھوڑا سا ڈیکوریشن کا کام باقی ہے۔''

عباس کی نظریں اب بھی اس کے چہرے پر تھیں۔ اس کی نظریں ثمین کی طرف اٹھتیں تو پھر جھکنا بھول جاتی تھیں۔

''مس امثل کی جگہ نئی لڑکی آ گئی ہے کیا؟''

''نہیں' ایک لڑکا ہے اسے سلیکٹ کیا ہے میں نے۔'' ویسے مس امثل اگر وہاں ہی رہتیں تو......'' عباس نے رائے دی تو ثمین نے اسے رد کر دیا۔

''مجھے یہاں مس امثل کی ضرورت ہے۔'' امثل وہ لڑکی تھی جس پر ثمین آنکھیں بند کر کے اعتبار کر سکتی تھی۔ وہ پچھلے تین سال سے اس کے ساتھ تھی۔ ان دنوں اس کے ایم بی اے کے آخری سمسٹر کے پیپرز ہونے والے تھے جب وہ ملک فیروز خان سے ملنے آئی تھی۔

''بابا تو نہیں ہیں لیکن میں ان کی بیٹی ہوں' آپ کو کیا کام تھا ان سے؟''

''مجھے جاب چاہیے تھی۔'' امثل کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی' اس کی آنکھوں کے رنگ بجھے ہوئے تھے۔

''اور مجھے یقین تھا ملک صاحب مجھے ضرور جاب دیں گے۔'' وہ یکدم مایوس سی نظر آنے لگی تھی۔ گو وہ ان دنوں بابا کے گرفتار ہونے پر کچھ پریشان سی تھی۔ دو تین روز قبل ہی وہ بابا کو لے کر گئے تھے۔

''چند دنوں تک شاید بابا آ جائیں لیکن آپ کل سے آفس آ جایئے۔ آفس جاب کا کچھ تجربہ ہے آپ کو؟''

''جی' میں نے کئی سال آفس جاب کی ہے۔'' امثل اسے بہت اچھی لگی تھی۔ پتا نہیں اس کے نچلے ہونٹ کے دائیں کونے میں جو ننھا سا تل تھا جو اسے ماما سے مشابہ کرتا تھا یا وہ اپنائیت جو ثمین کو اپنے لیے اس کی آنکھوں سے جھلکتی دکھائی دی تھی۔ کچھ تھا جو اسے امثل بہت اپنی اپنی لگی تھی۔ اور پھر گزرتے سالوں نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کا انتخاب غلط نہ تھا۔

ان تین سالوں میں ہر لمحہ امثل اس کے ساتھ اس کی جدوجہد میں شریک رہی تھی۔ اس خودغرض دنیا میں امثل جیسے لوگ بھی تھے اور تیمور عباس جیسے بھی۔ تب ہی تو یہ دنیا قائم تھی۔

عباس اسے خاموش دیکھ کر لاؤنج سے چلا گیا تو وہ وہیں صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے آرام کرنے لگی۔

❖❖❖

امثل انیکسی کی طرف جاتے جاتے لان میں فوارے کے قریب بیٹھ گئی۔

یہ فوارہ زہرہ جمال کو بہت پسند تھا۔

ایک بار زہرہ جمال نے اسے بتایا تھا۔ یہ گھر یہاں ماما نے زندگی کے بہت سارے اچھے سال گزارے تھے' اسے بہت شوق تھا کہ کبھی وہ ''قصر زہرہ'' کو دیکھے۔ جب ماما نے اس سے اپنی زندگی کی کہانی کہہ دی تو پھر اکثر وہ اس سے ماضی کی باتیں کرنے لگی تھیں۔

کبھی درثمین کی۔

کبھی سعدون کی جو تب صرف دو ماہ کا تھا۔

کبھی ملک فیروز خان کی' کبھی عباس کی اور کبھی قصر زہرہ کی۔

وہ بہت اشتیاق سے سنتی۔ بار بار کرید کر پوچھتی ثمین کیسی ہے؟

اس کی آنکھیں' اس کے نقوش' اس کی عادات اور وہ ہنس دیتیں۔

''جب میں آئی تھی تو وہ صرف دو سال کی تھی لیکن بڑی ضدی تھی' رونے پر آتی تو بہلتی ہی نہ تھی۔ تمہارے بابا سے بھی نہیں۔''

اور وہ دل ہی دل میں منصوبے بناتی رہتی کہ کیسے کس طرح وہ درثمین کو دیکھ سکے۔ کسی روز اچانک ملک ہاؤس چلی جائے یا پھر۔

اور اس کے سارے منصوبے یونہی رہ گئے۔ اس روز وہ صبح آفس جانے کے لیے گھر سے نکلی اور ابھی اس نے گلی کراس کر کے روڈ کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ سڑک پر کھڑی کرولا سے دو آدمی نکلے تھے اور آناً فاناً اسے بازوؤں سے گھسیٹتے ہوئے کرولا کی طرف لے جانے لگے۔ اس کے پیچھے پیچھے آتا ہمایوں زور سے چیخا تھا۔ اس نے مزاحمت کی تھی لیکن وہ اسے کرولا میں ڈال کر ہوا ہو گئے تھے۔ کلوروفارم میں بھیگا رومال اس کے منہ پر تھا اور اس کے کانوں میں ہمایوں کی چیخیں گونج رہی تھیں۔

دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تھی تو وہ ایک بیڈروم میں تھی۔ اور سامنے کرسی پر کاظم بیٹھا خباثت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''جو چیز کاظم کو پسند آجائے' وہ اسے حاصل کر کے ہی رہتا ہے مس امثل!'' تب اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے تھے' منتیں کی تھیں' روئی تھی۔

''خدا کے لیے' کیا تمہاری بہن نہیں ہے۔''

''نہیں۔'' وہ زور سے ہنسا تھا۔

''اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے۔ کیا تمہیں اس کا خوف نہیں ہے؟''

لیکن سب کچھ بے کار تھا' بے فائدہ۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا جب کسی نے بیل دی تھی اور گہری نیند سویا کاظم ہڑبڑا کر اٹھا تھا۔ وہ کارپٹ پر اجڑی ہوئی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی تھی۔ ایک نظر اس پر ڈالتا' گاؤن کی ڈوریاں کستا وہ باہر نکل گیا پھر باہر تیز تیز باتوں کی آواز آئی تھی۔

''اور میں نے تمہیں منع کیا تھا۔''

''تو کیا کرو گے اب تم۔ قتل کر دو گے مجھے؟'' یہ کاظم کی آواز تھی' نشے میں ڈوبی۔

''پیچھے ہٹو۔'' شاید آنے والے نے اسے دھکا دیا تھا اور پھر کسی نے پاؤں کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا تھا۔

''مس امثل اٹھیے۔'' آنے والے نے بازو سے پکڑ کر اسے اٹھایا' وہ میکانکی انداز میں اٹھتی چلی گئی۔

''میں شرمندہ ہوں' مجھے پہنچنے میں دیر ہو گئی۔'' آنے والا کچھ کہہ رہا تھا لیکن وہ تو جیسے اندھی' گونگی بہری ہو گئی تھی۔

وہ تو اس وقت بھی ٹکر ٹکر ماما کو دیکھ رہی تھی جب وہ اسے گلے سے لگائے رونے لگی تھیں اور ہمایوں اس سے لپٹا چیخ رہا تھا۔ اس نے فریدوں کی طرف نہیں دیکھا تھا جو اعظم کا شکریہ ادا کر رہا تھا' نہ ہی اعظم کی شرمندہ آواز پر دھیان دیا تھا جو فریدوں سے معافی مانگ رہا تھا۔

اور پھر کتنے ہی دن گزر گئے' وہ یونہی اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر اجڑی اجڑی بیٹھی خالی خالی آنکھوں سے سب کو تکا کرتی۔ ماما ہی تھیں جو اس کا منہ دھلاتیں' اسے کھانا کھلاتیں' اس کی کنگھی کرتیں۔ ہمایوں اسکول سے آکر ہر وقت اس کے پاس بیٹھا رہتا۔ فریدوں بھی کبھی کبھار شام میں چکر لگاتا' لالہ اور آپا بھی ایک دو بار آئیں لیکن وہ کسی سے کچھ نہ کہتی۔ لالہ شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی اور فریدوں بھی۔ لیکن مصروفیت کے باوجود وہ ایک دو روز بعد چکر لگاتا۔

پھر ایک دن ماما کی طبیعت خراب ہو گئی' وہ اٹھیں اور چکر کھا کر گر پڑیں۔ بیڈ کا کونا ان کی پیشانی پر لگا تھا جس سے خون بہنے لگا تھا' وہ کچھ دیر یونہی انہیں دیکھتی رہی پھر یکدم چیخ مار کر اٹھی۔

''ماما...... ماما...... پلیز آپ مجھے چھوڑ کر مت جائیے گا۔'' وہ ان سے لپٹی رو رہی تھی' چیخ رہی تھی' اس کی خشک آنکھوں میں سیلاب امڈ آیا تھا۔ ہمایوں دوسرے کمرے سے اس کی آواز سن کر آ گیا تھا۔ ماما نے اپنے زخم پر ہاتھ رکھا اور اسے لپٹا لیا۔

''میری بچی...... میری تومی......''

وہ بھی رو رہی تھیں' ہمایوں بھی رو رہا تھا۔ بہت دیر بعد طوفان تھما تو اس نے ماما کے زخم کی

طرف دیکھا۔ معمولی زخم تھا۔ ہمایوں نے برف رکھی تھی۔ خون بہنا بند ہوگیا تھا پھر بھی اس نے ڈیٹول سے صاف کرکے بینڈیج کر دی تھی۔

پھر اس رات اس نے بڑے بڑے فیصلے کیے اور رد کر دیے۔ اس نے مرنے کا سوچا لیکن ہومی اور ماما اکیلے رہ جائیں گے اور حرام موت کی اذیت الگ۔

کاظم کو قتل کرنے کے منصوبے بنائے لیکن وہ جانتی تھی کچھ بھی ممکن نہیں، تب اس نے صبر کیا اور سب کچھ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا۔ مگر وہ پوری رات تڑپ تڑپ کر روتی رہی۔

''ماما! میرا قصور کیا تھا؟ کیا ناحق۔ بے گناہ بھی سزائیں مل جاتی ہیں۔ یہ کیا ہے؟''

وہ کہانیاں اور افسانے پڑھتی تو سوچتی تھی، یہ رائٹرز بلاوجہ بلاقصور کسی ایک ہستی پر مصیبتوں اور ظلم کے پہاڑ توڑنے چلی جاتی ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اتنا بے نیاز ہوجائے لیکن اب اس پر پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ وہ ساری رات روتی رہی، بلکتی رہی اور ساری رات ماما اس کے سرہانے بیٹھیں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہیں اور اپنے نرم لہجے میں سمجھاتی رہیں۔

''تمہارا صبر ضرور اس پر پڑے گا امثل!''

صبح وہ اٹھی تو بہت حد تک نارمل تھی۔ اس نے نہا کر کپڑے بدلے تھے اور ناشتہ بنایا تھا۔ ہومی کو لنچ بنا کر دیا تھا۔ اس کی پیشانی چومتے ہوئے اسے لگا تھا جیسے چند ہی دنوں میں وہ بہت سنجیدہ ہوگیا تھا اور پھر ماما کے پاس آکر بیٹھ گئی تھی۔ رات بھر کی بے آرامی کے بعد وہ اس وقت سو رہی تھیں، ان کا چہرہ سوجا ہوا تھا۔

''پتا نہیں ماما کو کتنی تکلیف ہے اور کتنے دنوں سے وہ اپنے ہی غم میں مبتلا اپنے آپ سے بے گانہ ہو رہی تھی۔

''میری ماما کو کچھ نہ ہو...... یا اللہ انہیں بہت لمبی زندگی دینا۔''

اس کے آنسو اپنے اٹھے ہاتھوں پر گر رہے تھے جب فریدوں آیا۔

''کیسی ہو امثل!'' وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''آنٹی کے ماتھے پر کیا ہوا؟''

''گر گئی تھیں۔'' وہ نظریں جھکائے ہوئے تھی، فریدوں بھی خاموش بیٹھا رہا۔

''تھینک یو فریدوں! تم نے ان سارے دنوں میں ماما کا، میرا اور ہمایوں کا بہت خیال رکھا۔''

''میں نے تمہاری ایک ماہ کی چھٹی کی درخواست دے دی تھی۔ کیا ارادہ ہے، جوائن کرو گی؟ دو دن بعد تمہاری چھٹی ختم ہو رہی ہے۔''

''پتا نہیں۔'' وہ اپنے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔

''اپنے آپ کو سنبھالو امثل! اور اس واقعہ کو بھول جانے کی کوشش کرو۔ اعظم سے رابطہ ہونے سے کچھ دیر ہوگئی تھی ورنہ۔'' وہ خاموش ہی رہی، کہنے کو اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

''پرسوں لالہ اور آپا کی رخصتی ہے، آؤ گی؟''

''شاید نہیں۔'' فریدوں نے ضد نہیں کی اور کچھ دیر بعد اٹھ کر چلا گیا۔

ہولے ہولے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ آفس جاب چھوڑ کر اس نے ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی تھی۔ جو گھر سے نزدیک ہی تھا۔ فریدوں اب بھی آجاتا تھا لیکن پتا نہیں کیوں اسے لگتا جیسے اس کے اور فریدوں کے درمیان ایک دیوار سی بن گئی ہو۔ ایک اجنبیت در آئی ہو۔ ان کے درمیان سے بے تکلفی ختم ہوگئی تھی۔ وہ اب بھی پہلے کی طرح سب کا خیال رکھتا تھا۔ ماما کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتا، ہمایوں سے گپ شپ لگاتا، اس سے پوچھتا کہ کوئی مسئلہ ہے لیکن پھر بھی کوئی کمی تھی جسے صرف وہ ہی محسوس کرسکتی تھی۔ اس روز وہ اسکول سے آئی تو ماما نے اسے اپنے پاس بٹھایا۔

''میں چاہ رہی ہوں کہ تمہاری شادی کردوں لیکن فریدوں یا آپا نے کوئی ذکر نہیں کیا، حالانکہ اس واقعہ سے کچھ دن پہلے فریدوں کہہ رہا تھا کہ لالہ اور آپا کے بعد......''

''ماما! مجھے شادی نہیں کرنا اب اور نہ ہی میں خود کو فریدوں کے قابل سمجھتی ہوں۔''

''لیکن اتنی پہاڑ سی زندگی کیسے گزارے گی؟''

''آپ ہیں، ہمایوں ہے۔''

نینی ہمیشہ کی طرح کبھی کبھار آتیں، تین چار ماہ بعد۔ وہ امثل پر گزرنے والے حادثے سے بے خبر تھیں، اس لیے جب بھی آتیں اس کی شادی کی بات کرتیں۔ صرف بارہ گھنٹے ہی تو گزرے تھے، اس وقت روڈ پر ایک دو لوگ تھے، ہمایوں تھا پھر ماما نے فریدوں کو خبر کی تھی۔ ان کے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا اس پر کیا بیتی۔ نینی کے سامنے وہ کم ہی آتی تھی۔ نینی کے لیے اس کے دل میں محبت تھی۔ انہوں نے اسے پالا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے نینی کے سامنے وہ خود پر قابو نہ پاسکے گی، اس لیے ادھر ادھر ہوجاتی تو وہ ماما سے گلہ کرتیں۔

''ثومی کو مجھ سے محبت نہیں رہی۔''

''ایسا نہیں ہے نینی! وہ دراصل کچھ اپ سیٹ رہتی ہے۔''

''کیوں؟''

''شاید فریدوں کی وجہ سے۔''

''کیا فریدوں کے علاوہ اور کوئی نہیں۔ زہرہ تم کوشش کرو، ادھر ادھر کہو۔''

جن دنوں ماما کے ڈائی لیسز ہو رہے تھے، نینی مسلسل ان کے پاس ہاسپٹل میں رہی تھیں۔ ماما نے ان سے کہا تھا کہ ان کے بعد اگر وہ ثومی اور ہمایوں کے پاس آجائیں تو۔ لیکن نینی نے کہا تھا، وہ سوچ کر بتائیں گی مگر اس سے پہلے ہی اچانک ان کی ڈیتھ ہوگئی، انہیں شوگر تھی اور ان کا شوگر لیول یک دم ڈاؤن ہوا تھا اور ساتھ ہی دل پر اٹیک ہوگیا تھا اور نینی کی وفات کے

تین دن بعد انہیں نینی کی موت کی اطلاع ملی تھی جب امثل نے نینی کو فون کیا تھا کہ وہ ماما کو ڈائی لیسز کے لیے لے کر جا رہی ہے' وہ ہاسپٹل پہنچ جائیں لیکن فون اٹینڈ کرنے والی ملازمہ نے بتایا کہ ان کے انتقال کو تین دن گزر گئے' تب کتنے ہی دن وہ چپکے چپکے روتی رہی تھی۔

ماما نے کتنی ہی بار پوچھا تھا' نینی نہیں آئیں لیکن ان کی حالت ایسی نہ تھی کہ انہیں نینی کی موت کا بتا دیتی۔ سو کہہ دیتی کہ نینی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ان کی حالت ذرا بہتر ہوئی تو اس نے انہیں نینی کا بتایا۔ تب ایک بار پھر وہ اس سے شادی کے لیے کہنے لگیں۔

امثل' فریدوں سے بات تو کرو' اسے تمہارا' میرا' ہمایوں کا سب کا خیال ہے لیکن وہ فریدوں کو کسی آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

تین سال قبل ماما اسے بھری دنیا میں اکیلا چھوڑ گئیں۔ ہمایوں انجینئرنگ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے چکا تھا۔ اسکول کی جاب سے وہ اس کے تعلیمی اخراجات پورے نہ کر سکتی تھی۔ ماما کا زیور کب کا ان کے علاج کے سلسلے میں بک چکا تھا' تب اس نے اسکول جاب چھوڑ دی اور جاب کی تلاش میں ملک فیروز خان کے دفتر جا پہنچی تھی' جہاں اس کی ملاقات ثمین سے ہوئی تھی اور ثمین نے اسے جاب دے دی تھی۔ اس نے فریدوں کو گھر آنے سے منع کر دیا تھا۔

''ماما اب نہیں رہیں فریدوں اور تمہارے یوں آنے پر آس پاس کے لوگ اعتراض کر سکتے ہیں۔'' تب فریدوں نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

''امثل! اس کا ایک ہی حل ہے کہ میں تم سے شادی کر لوں۔ ہو سکتا ہے تم میرے قریب رہو تو میں تمہارے لیے اپنے دل میں وہ جذبہ محسوس کرنے لگوں جو نہ جانے کہاں سو گیا ہے۔ میں نہیں جانتا ایسا ہوگا بھی یا نہیں۔ لیکن بہت سارے لوگ سمجھوتے کی زندگی بھی تو گزارتے ہیں۔''

''فریدوں! میں تمہاری قدر کرتی ہوں۔ میرا دل آج بھی تمہاری محبت میں دھڑکتا ہے لیکن میں تمہیں کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ بہتر ہے کہ تم کسی اچھی لڑکی سے شادی کر لو۔''

''ہو سکتا ہے' کبھی کسی موڑ پر میں شادی کر لوں لیکن ابھی نہیں۔''

یہ وفا کا کیسا انداز تھا' وہ حیران ہوتی رہی۔ فریدوں نے گھر آنا چھوڑ دیا تھا لیکن فون کرتا رہتا۔ ہمایوں سے یونیورسٹی جا کر مل لیتا' ہر طرح ہمایوں کی نگرانی کرتا۔

ثمین کے پاس جاب کرنے کے بعد جیسے اسے ایک اپنا مل گیا تھا' وہ ثمین کا سایہ بن گئی تھی۔ آفس ٹائم کے علاوہ بھی ثمین اسے ساتھ رکھنے لگی تھی۔ یہ اس کی اپنی چھوٹی بہن تھی' اس کا دکھ اسے رلاتا۔

عباس نے ایک بار مختصراً بتایا تھا اس کی ٹریجڈی کے متعلق۔ دونوں بہنوں کا دشمن ایک ہی شخص تھا' کاظم چوہدری۔ کاش وہ اس سے انتقام لے سکتی۔ اور وہ ہر قدم ثمین کے ساتھ تھی۔ ان تین سالوں میں ثمین اس پر بے تحاشا اعتبار کرنے لگی تھی' اس لیے تو جب وہ کراچی آنے لگی تو اس نے امثل سے کہا تھا۔

''مس امثل! آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا اور وہاں قصرِ زہرہ میں میرے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ میں اپنا ہیڈ آفس وہاں منتقل کر رہی ہوں۔''

ہمایوں سے بات کر کے اس نے ثمین کو رضامندی دے دی تھی۔ ہمایوں کا ابھی ایک سمسٹر رہتا تھا۔ لیکن فی الحال ایک ماہ کے لیے یونیورسٹی بند تھی' وہ ثمین کو تنہا چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی بابا جان جیل میں تھے۔ یہی طے ہوا تھا کہ چھٹیاں گزار کر ہمایوں واپس لاہور آ کر ہاسٹل میں رہ لے گا۔ سو وہ گھر بند کر کے یہاں آ گئی تھی اور پھر وہ سعدون سے ملی اور بابا جان سے۔

بابا جان تین سال بعد ضمانت پر رہا ہو گئے تھے۔ سعدون کو دیکھ کر اس کا جی چاہ رہا تھا وہ اس کے ہاتھ تھام لے' اس کی پیشانی پر بوسہ دے اور اسے بتائے۔

''سعدون! یہ میں ہوں امثل تمہاری اپنی ماں جائی۔'' لیکن وہ ہونٹ بھینچے کھڑی رہی تھی ثمین نے اس کا تعارف کروایا تھا۔

''سعدی! یہ مس امثل ہیں۔ اگر یہ میرے ساتھ میرے ہم قدم نہ ہوتیں تو شاید میں وہ سب کچھ نہ کر سکتی جو کیا۔''

اور سعدون نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی اور چونکا تھا۔

''ثمین! مس امثل کی ماما کی تصویر سے کتنی مشابہت ہے۔''

''ہاں۔'' ثمین نے مسکرا کر اسے دیکھا تھا۔ میں نے یہ مشابہت پہلے ہی روز محسوس کی تھی۔'' اور امثل نے اپنے اندر کتنے ہی آنسو اترتے محسوس کیے تھے اور پھر جب وہ فیروز خان سے ملی تھی تو کیسے آنسوؤں نے اندر اودھم مچایا تھا اور کتنا دل چاہا تھا کہ ثمین کی طرح وہ بھی ان کے فراخ سینے سے سر لگا کر اندر چھپے سارے آنسو بہا دے۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ ان کے سامنے کم سے کم آئے۔ پتا نہیں کیوں اسے لگتا تھا جیسے وہ اسے دیکھ کر چونکتے ہیں۔ کیا وہ اس میں اس لڑکی کی شبیہہ ڈھونڈتے ہیں جو دس سال پہلے انہیں بلیک میل کرنے آئی تھی۔ یا پھر محض ماما کی مشابہت انہیں چونکاتی ہے۔

''باجی...... آپ یہاں بیٹھی ہیں۔''

ہمایوں جو ٹیکسی سے باہر جانے کے لیے نکلا تھا' اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر ادھر آ گیا تو اس نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کہیں جا رہے تھے تم؟''

''ہاں ذرا طارق روڈ تک۔ کچھ شاپنگ کرنا تھی۔ دو روز تک مجھے واپس جانا ہے۔''

''اوہ۔''

”اگر آپ پریشان ہیں تو میرے ساتھ ہی چلیں اور ثمین سے معذرت کرلیں۔ ایک سیمسٹر کی تو بات ہے پھر میں جاب کرلوں گا اور آپ......“

”نہیں، میں پریشان نہیں ہوں ہمایوں! مس درثمین کہہ رہی تھیں جب تک ہمایوں لاہور میں ہے، میں اندر گیسٹ روم میں ان کے ساتھ ہی رہ لوں۔“

”کیا دنیا میں ایسے اچھے لوگ بھی ہوتے ہیں باجی!“

”دنیا اچھے برے لوگوں سے مل کر بنی ہے ہمایوں! کبھی اسی دنیا میں ہمیں اچھے لوگ مل جاتے ہیں اور کبھی برے۔“

”باجی! ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“ امثل نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”وہ......فریدوں بھائی......“ وہ کچھ کہتے کہتے جھجک گیا۔

”کچھ کہا تھا انہوں نے تم سے؟“ امثل نے پوچھا۔

”ہاں، جب میں ملنے گیا تھا تو کہا تھا امثل سے کہنا کہ سب کچھ بھول جاؤ اور......“

”نہیں ہمایوں! ہر چیز کا ایک وقت اور ایک عمر ہوتی ہے، پینتیس چھتیس سال کی عمر میں کیا میں اب گھر بسائی اچھے لگوں گی۔“

”باجی! آپ تو بالکل بھی پینتیس چھتیس کی نہیں لگتیں۔“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے ہمایوں! میرے اندر جو جذبے ہیں، وہ تو پینتیس چھتیس سال کی لڑکی کے ہیں نا۔ تم فریدوں کو سمجھانا۔ اب زندگی ضائع مت کرے اور شادی کرلے۔“

”اچھا اب تم جاؤ ہمایوں! لیکن دیر مت لگانا اور پتا ہے ملک صاحب کہہ رہے تھے کہ تمہاری تعلیم مکمل ہو جائے تو یہاں کراچی میں تمہارے لیے بہت اچھی جاب کا انتظام ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے لیکن آپ فریدوں بھائی کے متعلق سوچنا ضرور۔“

”عجیب آدمی ہے یہ فریدوں بھی اور اس کی محبت بھی۔“

اس نے دل ہی دل میں سوچا اور ہمایوں کو لان عبور کر کے گیٹ کی طرف جاتے دیکھنے لگی۔

❖❖❖❖

وہ کارپٹ پر بیٹھی تھی اور اس کا سر ملک فیروز خان کے گھٹنوں پر تھا اور ملک فیروز خان کی انگلیاں اس کے بالوں کو سہلا رہی تھیں۔

”بابا جان!“ یکایک اس نے سر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ ”وہ بہت اچھی تھی، بہت۔“

”ہاں، وہ بہت اچھی تھی۔“ انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”اور اتنی جلدی چلی گئی۔“

ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے، حالانکہ کہنے کو دو ماہ ہو گئے تھے۔ وہ، امثل اور بابا جان ایک بزنس میٹنگ میں جانے کے لیے آفس سے نکلے تھے۔ انہیں انٹر کان جانا تھا، راستہ بھر وہ اور

امثل میٹنگ میں ہونے والی گفتگو ڈسکس کرتے رہے تھے۔ یہ میٹنگ سیٹھ سلمان کے ساتھ تھی جو دبئی میں لگانے والی اپنی ایک مل میں انہیں بھی پارٹنر بنانا چاہ رہے تھے۔ میٹنگ میں ان کا عربی پارٹنر شیخ احمد بھی موجود تھا۔ وہ پارکنگ سے نکل کر پرل ہال کی طرف جانے والے گیٹ کی طرف بڑھے ہی تھے کہ اچانک امثل کی نظر پڑی تھی اور پھر یکدم چیخی تھی۔

”بابا جان!“ اور ایک دم انہیں اور ثمین کو دھکا دیا تھا۔ بے آواز گولی امثل کو خون میں نہلا گئی تھی۔

وہاں کھڑے گارڈ کی نظر بھی اس وقت انہی کی طرف تھی، وہ ان کی طرف دوڑا اور دوسرا گارڈ گولی چلانے والے کی طرف بھاگا جس نے بھاگتے بھاگتے ایک اور فائر کردیا تھا۔ گولی حیران پریشان کھڑے ملک فیروز خان کے سر کے بالوں کو چھوتی گزر گئی تھی۔

”امثل......امثل......“

ثمین اس کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی تھی لیکن امثل کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور اس کے لب ہولے ہولے ہل رہے تھے۔

”بابا جان......بابا جان......“

اور پھر ہاسپٹل میں چار دن موت وحیات کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد اس نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرلی تھیں لیکن جانے سے پہلے اس نے ملک فیروز خان کا ہاتھ تھام کر کہا تھا۔

”بابا جان! میری ماما بے گناہ تھیں۔ میری ماما زہرہ جمال نے آپ سے کبھی بے وفائی نہیں کی تھی۔“

”جانتا ہوں۔“ ملک فیروز خان نے اعتراف کیا۔ ”نینی نے مجھے سب لکھ کر بھیجا تھا۔ رحمو کا اعتراف اور تمہارے متعلق۔ اس نے لکھا تھا زہرہ بیمار ہے اور قریب المرگ۔ نینی نے جو کچھ لکھا تھا اس نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ عجیب بے یقینی کی کیفیت تھی اور جب میں نے خود کو نینی سے ملنے کے لیے آمادہ کیا تو گرفتار ہو گیا۔ جیل سے آتے ہی میں گیا تھا نینی کی طرف لیکن پتا چلا وہ اس دنیا میں نہیں رہی۔“

”میرا برتھ سرٹیفکیٹ میرے سامان میں ہے بابا جان! میں آپ کی بیٹی ہوں۔ میں سچ مچ آپ کی بیٹی ہوں۔“

”تم میری بیٹی ہو۔“ ملک فیروز خان نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی تھی۔ ”مجھے یقین ہے۔“

”ہمایوں آپ کا بیٹا نہیں ہے لیکن وہ ثمین اور سعدون کا بھائی ہے۔ میں نے پاپا سے اور پھر ماما سے وعدہ کیا تھا کہ اس کا خیال رکھوں گی۔ ثمین اور سعدون کے صدقے میں اس کا خیال

رکھیے گا۔" تب ملک فیروز خان نے ہمایوں کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

"یہ میرا بیٹا ہے میرے سعدون جیسا۔ اور تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تم خود بھی تو خیال رکھو گی ہمایوں کا۔" پھر اس کی نظروں نے فریدوں کو تلاشا تھا۔

"فریدوں! تم عجیب آدمی ہو۔"

"تم ٹھیک ہو جاؤ امثل! پھر ہم اپنی زندگی شروع کریں گے' ایسے ہی جیسے سوچا تھا۔"

"وعدہ کرو فریدوں! تم شادی کر لو گے؟"

اور فریدوں نے وعدہ کر لیا۔ اور پھر اگلے روز وہ چلی گئی۔

"بابا جان! یہ چوہدری جہاندادا اور کاظم جیسے لوگوں کو کچھ نہیں ہوتا۔" ثمین نے بے بسی سے کہا۔

"ظالم کی رسی دراز ہوتی ہے اور پھر ایک دن اللہ انہیں پکڑ لیتا ہے اور اس کی پکڑ بہت سخت ہوتی ہے۔"

"بابا جان! یہ غنڈے چوہدری جہاندادا اور کاظم کے ہی بھیجے ہوئے تھے نا؟"

"شاید۔ سیٹھ سلیمان نے بتایا تو ہے کہ وہ بھی انٹرسٹڈ تھا پارٹنر شپ میں بلکہ پہلے سلمان کی بات چیت اسی سے چل رہی تھی لیکن پھر سلمان نے ارادہ بدل لیا اور ہم سے گفت و شنید شروع کر دی۔"

"ہاں بابا! عباس کہہ رہے تھے کہ......"

"تم نے عباس کے متعلق کیا سوچا ہے بیٹا! امثل کی وفات سے پہلے میں نے بات کی تھی تم سے۔"

"کچھ بھی نہیں بابا جان! میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ مجھے شادی نہیں کرنا' کبھی بھی نہیں۔"

"بیٹا! زندگی یوں ہی نہیں گزر جاتی۔ سلمان نے بھی اپنے بیٹے کے لیے پروپوزل بھیجا تھا۔ اچھا لڑکا ہے وہ بھی۔ لیکن جب عباس نے پروپوزل دیا تو میں نے سوچا۔ عباس سے بہتر تمہارے لیے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ایک دفعہ میں تمہارے معاملہ میں دھوکا کھا چکا ہوں' اب رسک نہیں لے سکتا۔"

"لیکن بابا! عباس کون ہے...... کس کا بیٹا ہے۔"

"شاید کچھ عرصہ پہلے میں یہ سب سوچتا۔ ہو سکتا ہے عباس کا پروپوزل مجھے بھڑکا دیتا لیکن میں نے یہ سب نہیں سوچا۔ اب اس کا ایک ایک لمحہ میرے سامنے ہے۔ اس کے شب و روز' اس کی کوئی بات مجھ سے چھپی نہیں' وہ کس کا بیٹا تھا' میں نے اس پر غور نہیں کیا۔ میں نے اسے اس گھر میں اپنی اولاد کی طرح ہی سمجھا ہے۔ لیکن اگر تم اس کے لیے تیار نہیں ہو تو کوئی بات نہیں' تم پر کوئی جبر نہیں' تم سوچ لینا۔" ملک فیروز خان اٹھے۔

"ذرا سعدون کو دیکھ لوں' جاگ گیا ہے یا نہیں۔" اور تب ہی عباس نے لاؤنج میں قدم رکھا اور ثمین نے بے اختیار اسے آواز دے لی۔

"عباس......" اور سعدون کے کمرے کی طرف جاتا عباس اس کے پاس رک گیا۔

"کچھ نہیں' جائیں آپ۔" ثمین نے اس کی طرف دیکھا۔

وہ آج بھی کتنی زبردست پرسنالٹی کا مالک تھا۔ آج بھی اس کی شخصیت میں وہ بے پناہ سحر محسوس کرتی تھی اور اس کے ہونے سے اسے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ چند دن کے لیے اسے کہیں جانا پڑ جاتا تھا تو اسے اپنے غیر محفوظ ہونے کا احساس ہوتا تھا۔

"کیا بات ہے ثمین! کہہ دیجیے جو کہنا ہے۔" وہ اس کے سامنے کارپٹ پر دوزانو بیٹھ گیا۔

"نہیں' مجھے کچھ نہیں کہنا۔" ثمین نے نظریں چرا لیں۔ "شاید سعدون جاگ گیا ہے۔ بابا بھی اسی کے پاس ہیں۔"

"لیکن در ثمین! مجھے آپ سے بہت کچھ کہنا ہے۔ بہت دنوں سے سوچ رہا تھا کچھ کہنے کو کہ امثل کا حادثہ ہو گیا۔ کاش امثل کی جگہ میں ہوتا اور اپنی زندگی بابا جان پر وار دیتا۔"

در ثمین نے چونک کر اسے دیکھا۔

"پتا نہیں کب سے وہ ملک صاحب کہنے کے بجائے انہیں بابا جان کہنے لگا تھا۔

"اس گھر کو خوشیوں کی ضرورت ہے ثمین! مدت سے ترس گیا ہے یہ گھر ہنسی کو' خوشیوں کو۔ یہاں بہت گھٹن ہے ثمین! امثل کے بعد یہ گھٹن اور بڑھ گئی ہے۔ بابا جان راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں۔ سعدون کی تیزی سے گرتی صحت' امثل کی موت' آپ کی زندگی کی ویرانی۔ مجھے اگر آپ اس قابل نہیں سمجھتیں تو سلمان صاحب کے بیٹے کا پروپوزل قبول کر لیں۔ بابا جان کو تھوڑا سا سکون' تھوڑی سی خوشی دے دیں۔"

"آپ نے مجھے اپنے قابل نہیں سمجھا تھا عباس!"

"ایسا نہیں تھا' ایسا نہیں تھا ثمین! آپ جانتی ہیں۔ میں بہت بے مایہ تھا بہت چھوٹا تھا۔"

"اور اب کیا کم مائیگی ختم ہو گئی؟" در ثمین نے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں' میں آج بھی اتنا ہی بے مایہ ہوں' اتنا ہی بے شناخت لیکن اب ضبط کی طنابیں میرے ہاتھوں میں سے چھوٹ گئی ہیں۔ میں دو سالوں میں ایک رات بھی چین کی نیند نہیں سویا اور پھر دو سالوں بعد جب آپ آئیں تو میرے اندر وہ سارے آنسو اتر گئے جو آپ نے نہیں بہائے تھے۔ میرا من ساری رات آپ کے آنسوؤں سے بھیگا رہتا۔

آپ چلی گئی تھیں تو میں نے جانا تھا کہ میں بھی آپ سے ایسی ہی محبت کرتا ہوں جیسی آپ۔ اس محبت کا ادراک آپ نے مجھے دیا تھا' ورنہ میں چاند کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اور آج بھی اگر بابا جان مجھے حوصلہ نہ دیتے' مجھے نہ اپناتے تو شاید میں آج بھی۔ یہاں اس دل میں بہت گھٹن ہے' بہت آنسو ہیں۔ اپنی کم مائیگی کا احساس بھی ہے اور چاند کو چھو لینے کی آرزو بھی' پھر بھی آپ کی خوشی ہر جذبے سے افضل ہے۔" ثمین سر جھکائے بیٹھی تھی۔

کچھ دیر بعد جب اس نے جھکا سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔

''عباس! میں نے بہت اذیت سہی' کاظم بہت ظالم تھا اور چوہدری جہانداد اس سے بھی زیادہ۔ انہوں نے میرے جسم پر ہی زخم نہیں لگائے' میری روح کو بھی کرچی کرچی کر دیا۔'' وہ آٹھ سالوں میں پہلی بار اس سے ان بیتے دو سالوں کا ذکر کر رہی تھی۔

''ثمین! اس تکلیف دہ وقت کا ذکر نہ کرو۔ میرا دل پھٹنے لگتا ہے۔ ثمین! میں تمہیں کو اتنی خوشیاں دوں گا' اتنی محبت کہ سارے دکھ ماند پڑ جائیں گے۔'' عباس بولتا رہا' وہ مسکراتی رہی۔

''عباس......'' اس نے ہاتھوں کی پشت سے بھیگے رخساروں کو پونچھا۔

''یہ زندگی کیا ہے؟ کسے کہتے ہیں زندگی؟ پھولوں کی سیج یا کانٹوں کی راہگزر۔'' وہ بالکل دس سال پہلے کے سے انداز میں عباس کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں ایک ساتھ بہت سارے رنگ دمک رہے تھے۔

محبت کے۔

اپنائیت کے۔

امید کے۔

''زندگی ٹوٹے کانچ پر ننگے پاؤں چلنے کا نام ہے ثمین۔'' بے حد مطمئن سا ہو کر عباس نے کہا۔

''ہاتھوں میں امید کا دیا تھامے سہج سہج کر چلنے کا نام۔ یوں کہ پاؤں میں کانچ نہ چبھیں۔''

''لیکن کانچ تو پھر بھی چبھ جاتے ہیں لاکھ احتیاط کے باوجود۔'' ثمین نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔

''ہاں پھر بھی۔ لیکن ایک امید ہمیں چلتے رہنے پر اکساتی رہتی ہے۔ جیسے سعدون کی زندگی کی امید۔''

''ہاں جیسے سعدون کی زندگی کی امید۔''

''در ثمین! زندگی شاید یہی ہے' اسی کا نام ہے۔

رستے سارے کالے ناگ اور تیز ہوا۔
اک دیا ہے ہاتھوں پر اور ننگے پاؤں
ان آنکھوں سے ان آنکھوں تک لمبے رستے
صدیوں جتنا اک سفر اور ننگے پاؤں۔''

عباس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ آ کر ٹھہر گئی تھی اور اس کی نظریں ثمین کے چہرے پر تھیں جہاں لالہ کے پھول چٹک رہے تھے۔

پل صراط

اور یہ میں ہوں اسید عبدالرحمٰن' میں اپنی کہانی کہاں سے شروع کروں میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ وہاں سے جب میں نے اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی یا وہاں سے جب میرا دل پہلی بار آمنہ کے نام پر دھڑکا تھا یا وہاں سے جب وہ میری زندگی میں داخل ہوئے تھے' وہ جو میرے کوئی نہیں تھے لیکن جو میری زندگی کا اہم سنگ میل تھے۔

''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کاش! وہ مجھے نہ ملے ہوتے تو میری زندگی بہت آسان ہوتی۔ میں ایک عام آدمی کی طرح زندگی گزار کر چلا جاتا۔ یوں ہر لمحہ پل صراط سے نہ گزرنا پڑتا۔ سوچتا ہوں میرے ساتھ انہوں نے اچھا نہیں کیا یا پھر شاید اچھا کیا۔

لیکن جس راستے پر وہ مجھے ڈال گئے ہیں' وہ بڑا مشکل راستہ ہے' پل صراط۔

پل صراط کیا ہے بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز اور اس پل کو عبور کر کے ہی جنت میں جایا جا سکے گا۔

دادی کہتی تھیں۔'' اس کے نیچے آگ دہکتی ہوگی۔ جہنم کی آگ اور گناہ گار اس پل صراط کو

پار نہ کر سکیں گے اور آگ میں گر جائیں گے اور نیک لوگ آرام سے یہ پل پار کر جائیں گے۔''
اور میرا چھوٹا بھائی کہتا تھا کہ:

''دادی! جو لوگ قربانی دیتے ہیں' وہ تو اپنے اپنے قربانی کے جانوروں پر بیٹھ کر پل صراط پار کرلیں گے۔''

''جھلا نہ ہو تو......'' دادی ہنس پڑتی تھیں۔ ''پلے میں کوئی عمل نہ ہو تو خالی خولی قربانی کے جانور کس کام کے۔''

لیکن یہ پل صراط جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔ اگر دنیا میں ہی اس سے واسطہ پڑ جائے تو آدمی کیا کرے۔ ہر لمحہ یوں لگے جیسے آدمی تنے ہوئے رسے پر چل رہا ہو' میں بھی اس پل صراط سے گزر رہا ہوں' مسلسل چھ سال سے اور ہر لمحہ یہ خوف کہ ذرا سی بے احتیاطی ذرا سی لغزش نیچے آگ کے دہکتے گڑھے میں گرا دے گی اور اس خوف کی کیفیت میں زندگی گزارنا کیسا ہے؟ کوئی مجھ سے پوچھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب ان کی وجہ سے ہے۔ آفتاب حسین کی وجہ سے۔ جب تک وہ میری زندگی میں نہیں آئے تھے' میری زندگی بہت سکون اور آرام سے گزر رہی تھی اور آئندہ بھی گزرتی رہتی۔ ایسے ہی جیسے میرے جیسے ہر متوسط گھرانے کے لڑکے کی گزرتی ہے۔

میں' اسید عبدالرحمٰن نے ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا۔ میرے والد محکمۂ زراعت میں کلرک تھے جبکہ میرے دادا پرائمری اسکول ٹیچر تھے اور جب میں نے ہوش سنبھالا تو وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ شاید اس لیے میرا بچپن اور لڑکپن ابا کے بجائے دادا کی نگرانی میں زیادہ گزرا۔ میری والدہ بھی جب میرا چھوٹا بھائی چھ سال کا تھا' وفات پا گئی تھیں۔ یوں والدہ کی جگہ دادی نے ہماری پرورش کی تھی۔ اور ہم چاروں بھائی ہی دادا دادی کے زیادہ قریب تھے لیکن میں چونکہ بڑا تھا' اس لیے دادا کی مجھ پر خصوصی توجہ تھی اور میں خود بھی دادا کی ذہانت سے متاثر تھا۔ دادا نہ صرف یہ کہ حساب کے سوال منٹوں میں کر لیتے تھے بلکہ ان کے پاس بے تحاشا نالج تھا۔ وہ ہمہ وقت کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے تھے' بڑے کمرے میں تین الماریاں ان کی کتابوں سے بھری ہوئی تھیں' اس لیے جب میں چھوٹا تھا تو سوچتا تھا کہ میں دادا کی طرح استاد بنوں گا۔

دادا کے پرانے شاگرد جہاں کہیں بھی دادا سے ملتے' ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ محفل میں ہوتے تو دادا کو دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور مجھے یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ آدمی کی ترجیحات بدل جاتی ہیں۔ میں بھی جب ذرا بڑا ہوا تو مجھے کتابوں کا چسکہ پڑ گیا۔ شروع میں دادا نے مجھے چھوٹی چھوٹی کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کے لیے دیں تاکہ میری اردو اچھی ہو جائے لیکن جب میں ہائی کلاسز میں پہنچا تو دادا نے مجھے اجازت دے دی کہ میں ان کی کتابوں میں سے جو کتاب بھی چاہوں لے کر پڑھ لوں۔ یوں کتابیں میرے لہو میں داخل ہو گئیں۔

دادا کے پاس بے شمار اچھی اعلا پائے کی ادبی کتابیں بھی تھیں۔ جب دادا نے وہ کتابیں خریدی تھیں تو ان کی قیمت بہت کم تھی۔ بڑی بڑی ادبی کتابوں کی قیمت پڑھ کر مجھے ہنسی آتی تھی۔ چار آنے' دو آنے' چھ آنے' غبارِ خاطر'' ابوالکلام آزاد کی یہ کتاب غالباً میں نے چھٹی جماعت میں پڑھی تھی اور مجھے یاد ہے اس کی قیمت چھ سات آنے ہی تھی۔ میں ہنستا تو دادا سمجھاتے۔

''یار! اس وقت روپے کی قیمت تھی۔ جانتے ہو میری تنخواہ چالیس روپے ماہوار تھی۔ میں ہر ماہ دس روپے گاؤں اپنی ماں کو خرچ بھیجتا تھا اور تیس روپے میں تمہاری دادا دادی' ابا' میں اور پھوپھی اچھا خاصا گزارا کر لیتے تھے بلکہ ہر ماہ دو تین روپے کی کتابیں خریدنے کی عیاشی بھی کر لیتا تھا۔ دادی کی الماری میں اس زمانے کے مشہور رسالے بھی جلد کیے ہوئے پڑے تھے۔ مثلاً ہمایوں' نیرنگِ خیال' ساقی' قوسِ قزح اور رسالے ہی نہیں اپنے زمانے میں نکلنے والے ہفتہ وار اخبار مثلاً اودھ پنچ وغیرہ کی فائلیں بھی موجود تھیں تو یوں یہ کتابیں پڑھتے پڑھتے جب میں نے میٹرک پاس کیا تو میں استاد بننے کا ارادہ موقوف کر چکا تھا اور میں نے سوچا تھا میں یا تو ادیب بنوں گا یا صحافی۔

''ادیب پیدائشی ہوتا ہے میری جان!'' دادا نے میری بات سن کر کہا تھا۔ ''یہاں کسی کالج یا یونیورسٹی میں ادیب بننے کی تعلیم نہیں دی جاتی۔ ہاں تم ادب پڑھ سکتے ہو' انگریزی ادب' اردو ادب' فارسی ادب یہ تعلیم تمہاری صلاحیتوں کو پالش ضرور کر دے گی لیکن تمہیں ادیب نہیں بنا سکے گی۔ اگر تمہارے اندر پہلے سے ہی ٹیلنٹ موجود نہیں ہے۔ تم صحافت پڑھ لو۔'' انہوں نے مشورہ دیا۔

''تو ٹھیک ہے' میں جرنلزم لوں گا۔''

میں نے سوچ لیا تھا' حالانکہ ابا چاہتے تھے کہ میں ڈاکٹر یا انجینئر بنوں اور انہوں نے اس سلسلے میں تھوڑی سی جذباتی بلیک میلنگ سے بھی کام لیا' یعنی یہ کہ تمہاری مرحومہ ماں کی خواہش تھی۔ ممکن تھا کہ میں اس جذباتی بلیک میلنگ کا شکار ہو جاتا کہ دادا نے ابا سے کہا۔

''اس کا راستہ نہ روکو اور اس پر زبردستی نہ کرو۔ اس کا مزاج نہیں ہے سائنس پڑھنے کا۔ تمہارے کہنے پر لے تو لے گا لیکن چل نہ سکے گا۔''

اور ابا نے کبھی دادا کی بات نہیں ٹالی تھی اور یوں میں نے آرٹس لی اور بی اے کے بعد جرنلزم میں داخلہ لے لیا۔ زندگی یوں ہی گزر رہی تھی بڑے سکون سے کہ احمر کو بلڈ کینسر ہو گیا۔ احمر ہمارے ڈیپارٹمنٹ کا سب سے ذہین لڑکا تھا اور میرا گہرا دوست۔ احمر میری ہی طرح ایک متوسط گھرانے کا لڑکا تھا لیکن اس کے آدرش بہت بلند تھے۔

وہ اونچے اونچے خواب دیکھتا۔

اس ملک کو بدل دینے کی باتیں کرتا تھا۔

کبھی کبھی میں اس کی باتیں سن کر حیران رہ جاتا تھا۔ پتا نہیں وہ کون سی دنیاؤں کی بات کرتا

تھا۔اس نے اپنی ایک یوٹوپیا تخلیق کر رکھی تھی۔ایک ایسا پاکستان جس کا ہر فرد ریاست سے مخلص تھا۔

جہاں کرپشن نہیں تھی۔

جہاں انصاف تھا۔

میں ساکت سا ہو کر اس کی باتیں سنتا رہتا تھا۔لیکن پھر وہ اپنی تمام خوب صورت سوچوں اور اعلا اونچے نصب العین کے ساتھ منوں مٹی تلے سو گیا۔احمر نوید جب بیمار ہوا اور ہمیں پتا چلا کہ اسے بلڈ کینسر ہے تو ہم دوستوں نے اس کے لیے پیسے اکھٹے کرنے کا پروگرام بنایا۔وہ ذہین، خوب صورت لڑکا ہماری آنکھوں کے سامنے تیزی کے ساتھ موت کے منہ میں جا رہا تھا اور ہم کچھ نہیں کر سکتے تھے۔اسے موت کے منہ میں جانے سے روک نہیں سکتے تھے لیکن اس کی اذیت کم کر سکتے تھے، علاج اور دواؤں سے اسے سکون دے سکتے تھے، کئی لوگوں نے مدد کی، کئی لوگوں نے ٹرخا دیا۔بہت سے ایسے لوگ بھی ملے جن کے پاس پیسوں کی فراوانی تھی لیکن جن کے دل اتنے تنگ تھے کہ ان کی جیبوں سے ایک روپیہ بھی نہیں نکلا تھا۔

اس روز ''صبحِ نو'' کے دفتر کے پاس سے گزرتے ہوئے میں بلا ارادہ ہی اندر چلا گیا تھا۔میری معلومات کے مطابق اس اخبار کا مالک جرم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کر رہا تھا اور ایک مخیر شخص تھا اور پھر جیسا میں نے سنا تھا ویسا ہی پایا۔میں نہ صرف یہ کہ آفتاب حسین کی شخصیت سے متاثر ہوا بلکہ میں نے اپنے دل میں ان کے لیے بڑی اپنائیت بھی محسوس کی۔گو میں نے پہلی بار آفتاب حسین کو دیکھا تھا تو سوچا تھا کہ دنیا میں اگر آفتاب حسین جیسے چند لوگ بھی ہوں تو یہ دنیا رہنے کے قابل جگہ ہے۔میں نے سب ہی دوستوں سے ان کا ذکر کیا، حتیٰ کہ احمر کے پاس بیٹھ کر میں نے کتنی ہی بار آفتاب حسین کو سراہا۔یہ دو تین دن بعد کی بات تھی جب میں نے احمر کے دادا ابو کو بتایا کہ آفتاب حسین نے کہا ہے کہ اگر احمر کو باہر بھجوانا پڑا تو وہ پوری مدد کریں گے۔

''یہ آفتاب حسین کون ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

اور جب میں نے بتایا ''صبحِ نو'' کا مالک تو وہ چونک پڑے۔

''حسین احمد کا بیٹا۔''

''ہاں شاید یہی نام ہے ان کے والد کا۔'' مجھے یاد آیا تھا کہ ''صبحِ نو'' کے پہلے صفحے پر مالک کا نام یہی لکھا ہوتا ہے۔

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے، اضطراب سے پہلو بدلتے ہوئے پھر بے چینی سے پوچھا۔

''کیا اس نے بھی تمہاری مدد کی ہے؟''

''جی ایک لاکھ کا چیک دیا ہے۔ابھی ہمارے پاس ہی ہے۔کل احمر کو ہسپتال میں لے جائیں گے تھراپی کے لیے تو......''

''نہیں۔'' وہ یکدم کھڑے ہو گئے تھے۔ ''یہ رقم اسے واپس کر دو بیٹا!''

''لیکن کیوں دادا جان!'' (احمر کی طرح ہم سب دوست بھی انہیں دادا جان کہنے لگے تھے۔)

''آپ جانتے ہیں علاج کس قدر مہنگا ہے، ایک ایک انجکشن بہت قیمتی ہے۔''

''جانتا ہوں پھر بھی آفتاب حسین کی رقم تم واپس کر دو۔میں نے نوید کی وفات کے بعد بہت محنت کی ہے۔سب کو رزق حلال کھلایا ہے، اب اس کے آخری لمحوں میں اس کے خون میں رزقِ حرام شامل کروں۔نہیں۔''

ان کا انداز حتمی تھا۔

''لیکن دادا جان! اور جن جن لوگوں نے مدد کی ہے، ان کے متعلق بھی تو ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ رقم جائز ذریعے سے کمائی گئی ہے یا ناجائز۔'' میرے ایک دوست نے کہا تھا۔

''آپ صحیح کہتے ہو بیٹا! لیکن میں ان کے متعلق بے خبر ہوں۔جانتے بوجھتے میں حرام کی آمیزش نہیں کر سکتا۔'' انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''حسین احمد میرا ہم جماعت تھا اور ہم ایک ہی محلے میں رہتے تھے۔جو شخص اب اس دنیا میں نہیں رہا، میں اس کے متعلق کوئی بات نہیں کروں گا، سوائے اس کے کہ اس نے یہ سب ناجائز طریقوں سے کمایا ہے اور اس کا یہ بیٹا اسی کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔میں حسین احمد کو اتنا جانتا ہوں جتنا شاید آفتاب حسین بھی نہیں جانتا ہوگا۔''

انہوں نے مزید بات نہیں کی تھی اور اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔

''اس وقت اس طرح کی غیرت دکھانا بے وقوفی ہے۔''

ایک دوست نے تبصرہ کیا تھا، تب احمر نے اپنی بند آنکھیں کھولی تھیں۔

''مجھے اپنے دادا پر فخر ہے اسید! پلیز جو دادا نے کہا ہے، وہی کرو۔''

دوسروں کی نظر میں وہ بے وقوف ہی سہی لیکن میری نظروں میں ان کا قد بڑھ گیا تھا۔یہ بڑے حوصلے کی بات تھی اور ایسا ہر کوئی نہیں کر سکتا۔یہ احمر ہی کر سکتا تھا یا اس کے دادا جان۔

آفتاب حسین کا بت میرے اندر ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا۔یہ بت اگرچہ دو دن پہلے ہی تو میرے اندر بنا تھا لیکن اس کی کرچیوں نے مجھے زخم زخم کر دیا تھا۔پتا نہیں کیوں۔دو تین دن تک میں عجیب حزن کی سی کیفیت میں گھرا رہا پھر احمر کا علاج شروع ہو گیا اور مصروفیت بڑھ گئی۔

انجکشن، تھراپی

ایک تکلیف دہ عمل

اور زندگی کی امید صفر

پھر بھی آدمی آخری سانس تک کوشش تو کرتا ہے۔سو ہم بھی کر رہے تھے۔طلبا دل کھول کر ڈونیشن دے رہے تھے اور امید تھی کہ ہم احمر کو باہر بھجوا سکیں گے۔

میں ذرا سنبھلا تو آفتاب حسین کو چیک واپس دینے چلا گیا۔پتا نہیں کیوں مجھے لگا جیسے

آفتاب حسین کا چہرہ جگہ جگہ سے چیخ رہا ہو اور وہ کسی اذیت سے گزر رہے ہوں۔ مجھے خیال گزرا تھا کہ کہیں دادا جان کو غلط فہمی تو نہیں ہوئی۔ یہ شخص ایسا لگتا تو نہیں ہے۔ میں نے ان کے چہرے سے نظریں ہٹالی تھیں۔ اس سے ان کے چہرے پر بکھرا سوز اور گداز مجھے پگھلائے رہا تھا۔

میں یک دم ہی ان کے دفتر سے نکل آیا تھا۔ میں آ تو گیا تھا لیکن مجھے لگا تھا جیسے میں نے ان کے ساتھ زیادتی کر دی ہو۔ میں نے اچھا نہیں کیا۔ ضروری تو نہیں کہ بیٹا بھی باپ جیسا ہو۔ اور پھر اس طرح کے لوگ تو پیسے کی ہوس میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ لوگ تو ایک روپیہ بھی خرچ نہیں کرتے۔

پھر میں نے آفتاب حسین کے متعلق جاننے کی کوشش شروع کر دی۔

آفتاب حسین ایک بڑا ادیب

ایک سچا کالم نگار

کھرا صحافی

آفتاب حسین، ایم بی اے

ایک بلیک میلر

دوغلا

کسی انڈر گراؤنڈ تنظیم کا بگ باس

ان انکشافات نے مجھے گہری اذیت سے دوچار کر دیا۔ بہت دن لگے مجھے خود کو یقین دلانے میں کہ ایسا ہی ہے۔

یہ دنیا ہے۔ یہاں لوگوں نے ایک چہرے پر کئی چہرے اوڑھ رکھے ہیں۔

اور میں نے آفتاب حسین کا خیال ذہن سے جھٹک دیا۔ یوں بھی احمر کی طبیعت کافی خراب تھی۔ پہلی تھراپی کے بعد وہ بے حد ویک ہو گیا تھا اور میں یونیورسٹی کے بعد روز ہی اس کی طرف چلا جاتا تھا۔

''کاش میں کچھ دن اور جی سکتا۔'' مرنے سے چند دن پہلے اس نے کہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے میں زیادہ دن جی نہ سکوں گا۔'' زندگی کی حسرت اس کی آنکھوں میں ٹھہری گئی تھی۔

''میرے بعد میرے بابا جان اکیلے ہو جائیں گے اسید! تم کبھی کبھار ان کے پاس آتے رہنا اور کبھی کبھی...... اماں سے بھی مل لیا کرنا۔''

میں نے بنا کچھ کہے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ مجھے لگا تھا میں اگر بولا تو حلق میں جمع ہو جانے والے آنسو آنکھوں سے بہہ نکلیں گے۔

''میں نے سوچا تھا میں......''

پھر ایک گہری سانس لے کر وہ خاموش ہو گیا۔ میرا ہاتھ اب بھی اس کے ہاتھ پر تھا۔

''اسید!'' کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''میرا جی چاہتا ہے میں اپنے سارے خواب تمہیں منتقل

کر دوں۔ تم جانتے تو ہو نا میرے خواب۔''

میں نے اب بھی بنا بولے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''وعدہ کرو اسید عبدالرحمن! ہمیشہ جھوٹ کے، ظلم کے، ناانصافی کے خلاف جنگ جاری رکھو گے، جب قلم اٹھاؤ گے تو اس کی حرمت کبھی نہیں بیچو گے۔ ہمیشہ سچ لکھنا میرے دوست!''

اس کے سفید ہو جانے والے ہونٹوں پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔

''میں نے سوچا تھا کہ میں صحافت کی تاریخ میں ایک نیا باب رقم کروں گا۔ میں اپنے قلم کی طاقت سے ملک کی تاریخ بدل دوں گا۔ تھا نا دیوانے کا خواب۔''

وہ ہولے سے ہنسا تھا، ایسی ہنسی جس میں ہزاروں حسرتوں کی کرچیاں تھیں۔

''پتا ہے اسید! بابا جان اکثر کہتے ہیں۔

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا

لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

اسے اقبال سے عشق تھا اور اسے اقبال کے سینکڑوں اردو اور فارسی کے شعر یاد تھے اور اکثر وہ ہمیں یہ اشعار سناتا رہتا تھا۔ صرف اقبال کے نہیں اور بھی شعراء کے شعر۔ آج بڑے دنوں بعد اس نے کوئی شعر سنایا تھا۔

''سنو، یہ واقعی مشکل راہ ہے لیکن راہِ حق کے دیوانے راہ کی صعوبتوں سے ڈرتے نہیں ہیں۔'' میں سوچتا تھا۔

میرا ملک

میرا پاکستان

اقبال کا خواب

جناح کی کوششوں کا حاصل

میں اس کے لیے تن من دھن وار دوں گا۔ میں ان سانپوں بچھوؤں کا سر کچل ڈالوں گا جو اس کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں۔ میں ان سب ملک دشمن لوگوں کے خلاف اپنی آخری سانس تک قلم سے جہاد جاری رکھوں گا۔ لیکن آہ میں اپنا مشن شروع کرنے سے پہلے ہی چھوڑ کر جا رہا ہوں۔''

پھر وہ کتنی ہی دیر تک مجھے دیکھتا رہا۔ خاموش، چپ چاپ۔ اس کے لب ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے لیکن اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

''سنو اسید عبدالرحمن! عہد کرتے ہو کہ میرا مشن جاری رکھو گے؟''

اور میں نے اس کی آنکھوں کی گفتگو سے گھبرا کر اس کے ہاتھ پر رکھے ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا۔

''ہاں' میں اسید عبدالرحمٰن وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہارا احمر نوید کا خواب پورا کرنے کی کوشش کروں گا۔''

احمر کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ بکھر گئی تھی اور آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی۔

''مجھے لگتا ہے' میں اس بار تھراپی کی اذیت برداشت نہ کر پاؤں گا۔'' اس نے آنکھیں بند کیے کیے کہا تھا۔

''لیکن مجھے یقین ہے' تم یہ تکلیف برداشت کرلو گے اور مجھے تو یہ بھی یقین ہے' ایک روز ہم دونوں قدم سے قدم ملائے اور کندھے سے کندھا جوڑے اس مشن کو شروع کریں گے اور ایک دن ان سارے سانپوں اور بچھوؤں سے اپنے ملک کو صاف کردیں گے۔''

وہ بولا نہیں تھا لیکن مجھے لگا تھا جیسے وہ میری خوش فہمی پر دل ہی دل میں ہنسا ہو۔

''ہاں' تم یہ مشن ضرور جاری رکھنا اور سنو۔'' اس کی آنکھوں میں یکدم جیسے روشنیاں سی کوندی تھیں اور زرد چہرے پر رنگ سے بکھر گئے تھے۔

''وہ ہے ناصدف' میری کزن!''

''کیا صرف کسی کا نام لینے سے ہی چہرے پر یوں رنگ اتر آتے ہیں؟'' میں نے حیران ہوکر اسے دیکھا تھا۔

''وہ بھی کہتی تھی کہ وہ میرا ساتھ دے گی۔ وہ بھی ظلم اور ناانصافی کے خلاف جنگ کرنا چاہتی ہے۔ اسید! وہ......''

اس کی آنکھوں کی روشنیاں ماند پڑ گئیں اور چہرے کے رنگ مدھم ہوگئے۔ ''اگر کبھی اپنے مشن کے لیے تمہیں کسی مخلص ورکر کی ضرورت پڑے تو اسے اپنے ساتھ شامل کرلینا۔ میں نے ایسی بہادر اور سچی لڑکیاں کم ہی دیکھی ہیں۔''

''وہ...... کیا تم اور وہ......؟'' میں کچھ پوچھتے پوچھتے جھجک گیا۔

''ہاں...... لیکن اب کیا فائدہ۔ پتا نہیں کیسے برداشت کر پائے گی وہ میری موت کو۔ بہت بچپن میں ہی خالہ اور امی کے درمیان یہ طے پا گیا تھا۔''

''فار گاڈ سیک احمر! تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے ان شاء اللہ اور پھر دیکھنا ہم سب نے تم سے ٹریٹ لینی ہے زبردست سی۔ چھپے رستم ہو' بتایا تک نہیں۔ خیر اب ساری کسر نکال لیں گے۔''

***

لیکن میرا یقین مجھ پر ہنستا ہی رہ گیا اور وہ چلا گیا۔ بہت سارے دن میں اپ سیٹ رہا۔ بہت سارے دن میں سوچتا رہا ایسے سچے کھرے محب وطن لوگ دنیا سے چلے جاتے ہیں اور آفتاب حسین جیسے بلیک میلر زندہ رہتے ہیں۔ کیا تھا اگر احمر نوید کے بجائے آفتاب حسین مر

جاتے۔ میں نے کئی بار سوچا تھا پتا نہیں کیوں میں آفتاب حسین کو بھلا نہیں سکا تھا۔ شاید اس لیے کہ آگے چل کر انہیں میری زندگی میں ایک اہم کردار ادا کرنا تھا۔

احمر نوید......

اور آفتاب حسین' احمر نوید سے بالکل مختلف۔

ایک رزق حلال پر پلنے والا

دوسرا جس کی رگوں میں دوڑتے لہو میں حرام شامل تھا لیکن دونوں نے ہی جاتے جاتے مجھے ایک ہی عہد میں باندھا تھا۔

قلم کی حرمت برقرار رکھنے کا عہد۔

سچ کے پرچار کا عہد

اور میں ان دو بندوں کے عہد سے بندھا' چھ سال سے پل صراط پر چل رہا ہوں۔

اس روز جب میں چیک واپس کرکے ان کے دفتر سے نکل رہا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کبھی پھر اس شخص سے ملوں گا بلکہ میں زندگی میں پھر کبھی انہیں دیکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن ہوا یوں کہ وہ بار بار مجھ سے ٹکرانے لگے۔

حتیٰ کہ وہ میرے گھر تک پہنچ گئے۔

کبھی دادی سے ملنے کا بہانہ۔

کبھی ابا اور دادی کی خیریت معلوم کرنے کا جواز۔

کیوں آخر؟ کیوں وہ یہاں آتے ہیں۔ میں الجھ رہا تھا اور میرے خاندان کے لوگ ان کے اخلاق کے اسیر ہو رہے تھے۔ دادی نے تو جھٹ سے انہیں بیٹا بنالیا تھا۔

میرے گھر کے چھ کے چھ افراد ان کے اخلاص و محبت کے گن گاتے تھے۔

دادا! کیا آپ کو بھی لگتا ہے کہ آفتاب حسین اچھے آدمی ہیں' کیا ان کا باطن بھی ان کے ظاہر جیسا ہے؟''

''کسی کے باطن کے متعلق ہم کیا کہہ سکتے ہیں بیٹا! وہ جیسے بھی آدمی ہیں لیکن تنہا ہیں۔ گھر کے ماحول اور اپنوں کی محبتوں کو ترسے ہوئے۔ وہ ہم سے کچھ طلب نہیں کرتے پھر تم کیوں چاہتے ہو کہ وہ یہاں نہ آیا کریں۔ اگر ہماری ذات سے انہیں چند لمحوں کی خوشی مل جاتی ہے تو ہمارا کیا جاتا ہے بیٹا! وہ بھی تمہاری طرح بچپن میں ہی ماں کی محبت سے محروم ہوگئے تھے۔''

دادا مجھے وہ سب بتا رہے تھے جو آفتاب حسین نے انہیں اپنے متعلق بتایا تھا۔

میں دادا سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن انہیں تو روک سکتا تھا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ مجھے لگا جیسے وہ کسی اذیت سے دوچار ہوگئے ہوں۔ ان کا چہرہ' ان کی آنکھیں سب ظاہر کر رہی تھیں کہ کوئی گہرا درد ان کے دل کو چھیل رہا ہو۔ میں نے نظریں چرالیں۔ میں کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا'

حالانکہ میں اندر سے کمزور ہو رہا تھا۔ وہ مجھے بتا رہے تھے کہ میں ان کے بھائی نایاب سے مشابہ ہوں اور یہ مشابہت انہیں میری طرف کھینچتی ہے اور تب میں بے اختیار اس خواہش کا اظہار کر بیٹھا جو کبھی کبھی میرے دل کے اس چور حصے سے ابھرتی تھی جہاں آفتاب حسین قبضہ جمائے بیٹھے تھے۔

''آپ اس دلدل سے نکل کیوں نہیں آتے سر!'' اور انہوں نے بس ایک نظر اٹھا کر مجھے دیکھا تھا۔ کیسی بے بسی اور حسرت سی تھی ان نظروں میں کہ میرا دل پگھل کر پانی ہونے لگا تھا۔

اس رات میں نے نہ صرف خود ان کے لیے دعا کی بلکہ دادا اور دادی سے بھی دعا کے لیے کہا اور اب پتا نہیں یہ ہماری دعائیں تھیں یا پھر ان کی تقدیر میں پہلے سے ہی رقم تھا کہ اپنے آخری دنوں میں وہ اس دلدل سے نکل آئیں گے۔ جب انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کر رہے ہیں تو میں نے حیرت اور خوشی سے ان کی بات سنی تھی۔

ان دنوں میں فری لانسر کی حیثیت سے مختلف اخباروں میں لکھ رہا تھا۔ میرے کالم اور میرے آرٹیکل دونوں ہی پسند کیے جا رہے تھے۔ اور ایک اخبار کے سنڈے ایڈیشن میں معاشرتی مسائل پر یہ آرٹیکل چھپ رہے تھے' جب مختلف معاشرتی مسائل پر لکھتے لکھتے میں نے منشیات پر لکھنا شروع کیا تھا۔ میں گلیوں' قبرستانوں' پارکوں اور ویران زیر تعمیر عمارتوں میں گرے نشے میں دھت سترہ اٹھارہ سال کے بچوں کے بارے میں لکھ رہا تھا۔

''وہ منشیات کہاں سے حاصل کرتے ہیں' انہیں یہ لت کیسے پڑی؟'' ننھے معصوم بچے کیسے نشے کی عادت میں مبتلا ہوتے ہیں۔

ہر ٹاپک پر لکھنے سے پہلے اس کی اچھی طرح سے تحقیق کرتا تھا اور پھر ایک روز مجھ پر جو انکشاف ہوا' اس نے مجھے اندر تک ہلا کر رکھ دیا۔ مجھے یقین نہیں آیا۔

میں نے آفتاب حسین کی کہانیاں پڑھی تھیں۔ میں نے ان کے آرٹیکل اور کالم لائبریریوں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھے تھے کہ لوگ کہتے تھے کہ میری تحریر میں آفتاب حسین کی تحریر کی سی کاٹ ہے۔ میرے لفظوں سے آفتاب حسین جھلکتا ہے۔

لوگوں کی کمزوریوں کو کھوج کر انہیں بلیک میل کرنے والے شخص کو تو میں نے اپنی طرف سے بشری کمزوری کا مارجن دے کر معاف کر دیا تھا لیکن ایک ایسی تنظیم کے باس کو میں کیسے معاف کر سکتا تھا جو میرے ملک میں زہر پھیلا کر میری نسل کو تباہ کر رہا تھا۔ نہیں' میں ان سب چہروں کو بے نقاب کروں گا۔ میں نے خود سے عہد کیا تھا لیکن اس رات پتا نہیں کیوں ڈھیروں آنسو بلاوجہ ہی میری آنکھوں میں چلے آئے تھے۔

انہوں نے کہا تھا۔

''تم میرا لحاظ نہ کرو اور بھول جاؤ کہ کبھی تم مجھ سے ملے تھے۔ تم وہی کرو جو تمہارا ضمیر کہتا

ہے۔ ایک کھرا صحافی کبھی اپنا قلم نہیں بیچتا۔''

''تو......؟'' میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔

''تو......؟'' وہ مسکرائے تھے۔ ''تمہاری تحقیق کے سرے جہاں تک جاتے ہیں' وہاں تک ضرور جاؤ ینگ مین!''

میری ساری بات سن کر انہوں نے کہا تھا۔

اور اس رات میں نے جب اپنا آرٹیکل مکمل کیا تو میری آنکھوں کے گوشے گیلے ہو رہے تھے لیکن صبح میں اپنے آفس جاتے ہوئے وہ مضمون اخبار کے دفتر میں دینے کے لیے رکا تو ایڈیٹر نے معذرت کر لی۔

''سوری مسٹر اسید! ہم مضامین کا یہ سلسلہ جاری نہیں رکھ سکتے۔ آپ پلیز کسی معاشرتی مسئلے پر لکھیں۔''

''لیکن سر! کیا یہ معاشرتی مسئلہ نہیں ہے۔''

''تم اس موضوع پر بہت لکھ چکے ہو' لوگ بور ہو گئے ہیں پڑھ پڑھ کر' وہ اب کچھ نیا چاہتے ہیں۔''

''لیکن سر! اس قسط میں تو بڑے بڑے انکشافات کیے ہیں میں نے۔ آپ حیران ہوں گے کتنے بڑے بڑے لوگ ملوث ہیں اس کاروبار میں۔''

''ایسے کاموں میں بڑے لوگ ہی ملوث ہوتے ہیں میری جان!''

وہ مدبرانہ انداز میں مسکرائے تھے۔

''بہرحال' مجھے آپ کے نئے آرٹیکل کا انتظار رہے گا۔ کل تک لکھ لیں گے نا آپ۔''

''اوکے سر!'' میں سمجھ گیا تھا جو لوگ مجھ پر دباؤ ڈال رہے تھے' ان کی رسائی یہاں بھی تھی۔ میں آفس سے باہر آ گیا اور سوچا' کوئی تو ہو گا ایسا جی دار جو یہ مضمون چھاپ دے دوسرے اخبارات سے بات کروں گا یا پھر کسی میگزین سے۔

☆☆☆

مگر پھر ان کا فون آ گیا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔ میں نے ان کے حادثے کی خبر پڑھی تو تھی لیکن مجھے علم نہ تھا کہ وہ ساری کشتیاں جلائے کہیں لمبے سفر پر جانے کو تیار بیٹھے ہیں۔ میرا دل جیسے ڈوب سا گیا اور کچھ دیر بعد میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔

''میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ مجھے زیر بار نہ کریں۔'' میں ان کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیے بیٹھا تھا اور میری آواز میں نہ جانے کہاں سے آ کر بہت سارا نم شامل ہو گیا تھا۔

''لیکن یار! میں نے کہاں زیر بار کیا ہے تمہیں۔'' اب میں ان سے کیا کہتا کہ اور کیسے زیر بار کرتے ہیں۔ اسیر تو کر لیا آپ نے مجھے۔

''تم اپنے قلم کا کبھی سودا نہ کرنا اسید!''

وہ مجھ سے عہد لے رہے تھے اور میں اثبات میں سر ہلا رہا تھا۔ ایک عہد میں نے احمر سے کیا تھا اور اب ایک عہد میں آفتاب حسین سے کر رہا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ اسے نبھانا کتنا مشکل ہوگا کہ میں ہانپ ہانپ جاؤں گا۔ میں نے جو انہیں پہلی نظر میں پسند کیا تھا اور میں نے شاید ان سے نفرت بھی کی تھی لیکن میں جو ان کا کوئی بھی نہیں تھا' ان کے آخری لمحوں تک ان کے ساتھ تھا' جب انہوں نے آخری سانس لی تو ان کا سر میری گود میں تھا اور سامنے بینچ پر بیٹھے دادا مسلسل یا سلام کا ورد کر رہے تھے اور نہ جانے کیا کیا پڑھ کر ان پر پھونک رہے تھے۔ آخری لمحے میں انہوں نے آنکھ کھول کر پہلے مجھے اور پھر دادا کی طرف دیکھا تھا۔ ان کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوگئی تھی اور پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ دادی کہتی تھیں۔ بیماریاں انسان کے گناہوں کو جھاڑ دیتی ہیں اور پھر توبہ کرنے والے کی توبہ قبول ہو جاتی ہے' جب وہ سچے دل سے توبہ کر لے۔

ان کی بند آنکھوں پر دھرے میرے ہاتھوں میں لرزش تھی اور میرا دل چاہ رہا تھا میں دھاڑیں مار مار کر روؤں لیکن مجھے ابھی خود کو سنبھالنا تھا۔ میں نے آہستگی سے ان کا سر تکیے پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دادا ان کی نبض دیکھ رہے تھے' جب میں ڈاکٹر کو بلانے کے لیے کمرے سے باہر نکلا لیکن جانے والا جا چکا تھا۔ اپنے آخری چار دنوں میں جب میں ان کے پاس رہا' انہوں نے مجھ سے اپنے متعلق بہت باتیں کی تھیں۔ انہوں نے مجھے فاطمہ کا بتایا تھا اور ایک کہانی بند لفافے میں مجھے دی تھی کہ یہ میں فاطمہ کو دے دوں۔ انہوں نے فاطمہ کا نمبر مجھے لکھواتے ہوئے تاکید کی تھی کہ میں ان کی موت کی اطلاع فاطمہ کو ضرور دوں۔ انہوں نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ تم بس کبیر کو فون کر دینا' وہ سب سنبھال لے گا۔

میں نے کبیر کو اطلاع دے دی تھی۔ میں نے فاطمہ کو بھی فون کر دیا تھا۔ میں نے کبیر کو بتا دیا تھا کہ میں انہیں گھر لا رہا ہوں۔ ایمبولنس میں میں ان کے پاس بیٹھا تھا۔ ایک بار انہوں نے کہا تھا۔

''میرا جی چاہتا ہے' تمہیں کسی روز اپنے گھر لے جاؤں۔ تمہیں سنی بابا کا' نایاب کا کمرہ اور ان کی تصاویر دکھاؤں۔ تم دیکھنا اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی سب کچھ ویسا ہی ہے۔ تمہیں لگے گا جیسے نایاب ابھی ابھی کمرے سے باہر نکلا ہو۔ میں نے اس کے تکیے کے پاس اوندھی پڑی کتاب کو بھی کبھی سیدھا نہیں کرنے دیا۔ تاکہ جب میں اس کے کمرے میں جاؤں تو لگے جیسے ابھی پڑھتے پڑھتے وہ اٹھ کر باہر گیا ہے۔''

اور اب میں ان کے گھر جا رہا تھا لیکن اس طرح کہ میں انہیں ان کے گھر لے جا رہا تھا۔

ان کے گھر کے باہر بہت سارے لوگ جمع تھے۔ ان کے اخبار کے ورکرز صحافی اور نہ جانے کون کون۔ کبیر نے لان میں ٹینٹ لگوا دیے تھے۔ اندر لاؤنج میں بھی سب تیار تھا۔ ہم انہیں لاؤنج میں لے کر گئے تھے۔ وہاں دادی اور پھوپھی کے علاوہ اس وقت صرف پاس پڑوس کی چند خواتین تھیں۔ غالباً دادا' پھوپھی کو بھی ساتھ لائے تھے۔ باہر ابا اور تینوں بھائیوں کے ساتھ وہ خود موجود تھے۔ ہم انہیں اندر چھوڑ کر باہر آئے تو میں نے دیکھا۔ صرف دادی تھیں جو رو رہی تھیں۔ لوگ آہستہ آہستہ اکٹھے ہونے لگے تھے۔ خود بخود ہی لوگ دادا ابا اور میرے پاس آنے لگے تھے۔

جو بھی آتا' وہ دادا اور ابا کو پرسہ دیتا۔ میرے ساتھ افسوس کرتا۔ لوگوں نے خود ہی تصور کر لیا تھا کہ ہم ان کے اپنے ہیں۔ ان کے جنازے کو کندھا دینے والے بھی ہم چاروں بھائی تھے۔ وہاں آنے والے کئی صحافیوں نے مجھے پہچان لیا۔

''ارے اسید آپ!''

''اچھا تو آفتاب حسین آپ کے کوئی عزیز تھے۔ کوئی قریبی عزیز' تب ہی آپ کی تحریروں میں ان کی تحریر کا رنگ جھلکتا ہے۔''

''سچ بتایئے' کہیں آپ کے پردے میں وہ خود تو نہ تھے۔''

''اور ہاں یہ یکایک انہوں نے اخبار کیوں بند کر دیا؟''

مجھے ایسی باتوں سے کوفت ہو رہی تھی۔ اندر ایک شخص کی میت پڑی تھی اور یہ لوگ پتا نہیں کیسے غیر متعلق باتیں کر رہے تھے۔

ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔

آنے والوں میں ہر طرح کے لوگ تھے۔

جھنڈے والی گاڑی میں بیٹھ کر آنے والے بھی تھے۔ سیاست دان بھی تھے اور بیوروکریٹ بھی۔ بزنس مین بھی تھے اور صحافی بھی۔ لیکن سب کے سب کلف لگے مصنوعی لوگ۔ میں خاموشی سے ایک طرف بیٹھا اپنے دل میں اس دکھ کو پھیلتے محسوس کرتا رہا جو کسی اپنے کے بچھڑ جانے پر ہوتا ہے۔

اندر لاؤنج میں بھی عورتیں اکٹھی ہوگئی تھیں۔

ماڈرن اور قیمتی ملبوسات میں لپٹی' ہلکے میک اپ کے ساتھ اور ہلکی پھلکی جیولری پہنے وہ یہاں پرسہ دینے آئی تھیں۔

یہ سب آفتاب حسین کی ملنے والیاں تھیں۔ اندر بھی سب خواتین دادی سے ہی افسوس کر رہی تھیں۔

تیسرے دن لوگوں کی آمد کا سلسلہ موقوف ہوا تو میں نے کبیر سے کہا۔

اب کل سے ہم نہیں آئیں گے۔"
"ہاں ٹھیک ہے۔" کبیر چونکا۔ "اب کس نے آنا ہے اور یہ مکان تم جانتے ہونا کہ......"
"جی۔" میں کھڑا ہو گیا' اس وقت وہاں صرف ابا' میں اور کبیر تھے۔ اندر لاؤنج میں دادی تھیں اور شاید کوئی آس پاس کے گھر سے آئی ہوئی خواتین ہوں۔
"ابا! آپ ٹیکسی دیکھیے' میں دادی کو لاتا ہوں۔"
کبیر نے میری طرف دیکھا' ان کی آنکھوں میں ہلکی سرخی تھی۔ وہ نہ جانے کب سے' شاید حسین احمد کے زمانے سے ہی ان کے ساتھ تھا۔ اسے آفتاب حسین کے یوں اس طرح چلے جانے کا دکھ تھا۔ میں نے کئی بار ان تین دنوں میں اسے آنسو پونچھتے دیکھا تھا۔
"انہیں ڈرائیور چھوڑ آتا ہے اسید! آپ کچھ دیر رک جائیں۔ آفتاب صاحب کی خواہش تھی کہ ان کی ذاتی چیزیں آپ دیکھ لیں۔ دو تین روز تک سب نیلام ہو جائیں گی اور پھر کل تک میں سب ملازمین کو فارغ کر دوں گا۔"
"یہ لوگ کہاں جائیں گے؟ شاید برسوں سے ان ہی سرونٹ کوارٹرز میں رہ رہے ہیں۔" ابا نے بے ساختہ کہا تھا۔ "ایک غریب ہی دوسرے غریب کی مجبوریوں کو سمجھ سکتا ہے۔"
کبیر کے لبوں پر افسردہ سی مسکراہٹ ابھری۔
"عبدالرحمٰن صاحب! آفتاب صاحب نے سب کے لیے بندوبست کر دیا تھا۔ بڑے دل والے اور بڑے آدمی تھے' انہیں سب کا احساس تھا۔"
کبیر انہیں تفصیل بتا رہا تھا۔ میں ہولے ہولے قدم اٹھاتا ڈرائنگ روم سے باہر نکلا اور ٹی وی لاؤنج میں چلا گیا۔ نیچے کارپٹ پر دادی کے پاس ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھے کوئی خاتون بیٹھی تھیں اور خاتون کے برابر ایک کم عمر سی لڑکی ادھر ادھر لاؤنج میں نظریں دوڑا رہی تھی۔
"دادی!"
میں نے وہیں کھڑے کھڑے انہیں پکارا تو دادی اور وہ خاتون دونوں ہی مجھے دیکھنے لگیں۔ خاتون کی آنکھوں کے گوشے نم تھے اور ان آنکھوں کی سرخی شدتِ گریہ کا پتا دے رہی تھی۔
"آجاؤ بیٹا!" دادی نے دوپٹے کے پلو سے اپنی نم آنکھوں کو پونچھا تھا۔
"دادی! میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"
"اچھا!" وہ کھڑی ہو گئیں اور پھر قریب بیٹھی خاتون کی طرف دیکھا۔
"بیٹا! یہ فاطمہ ہے۔ بتا رہی تھی کہ تم نے فون کر کے اطلاع دی تھی تابی بیٹے کی۔"
میں چونکا۔ ان تینوں دنوں میں ایک بار بھی فاطمہ کا خیال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا تھا کہ وہ آج آئی تھیں یا اسی روز آ گئی تھیں اور پھر ان کی طرف دیکھتے دیکھتے ایک اور بات بھی یاد آ گئی کہ ان کی ایک امانت بھی تھی میرے پاس۔ میں یکدم دو قدم آگے

بڑھا۔
"آپ کی ایک امانت ہے میرے پاس۔"
انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان کی آنکھوں کی سطح نم تھی اور پلکیں بھیگی ہوئی تھیں۔
"آپ کہاں ٹھہری ہوئی ہیں؟ مجھے ایڈریس دے دیجیے گا' میں وہاں پہنچا دوں گا۔"
"آپ ابھی یہاں ٹھہریں گی۔"
"دو تین روز اور......" ان کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی اور وہ پہلی بار بولی تھیں۔
"تم......اسید عبدالرحمٰن ہو۔"
"جی......!" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نیچے کارپٹ پر بیٹھی لڑکی دلچسپی سے مجھے دیکھنے لگی۔
"تو یہ فاطمہ ہیں۔" ان کے چہرے کے جمال پر آج بھی نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی اور اگر آفتاب حسین نے اس چہرے کے بعد کسی اور چہرے کو دیکھنے کی خواہش نہیں کی تھی تو بجا تھا اور ان کی رفاقت کی خواہش کے بعد کسی اور کی رفاقت کو ان کا جی نہ چاہا تھا تو کچھ غلط تو نہ تھا۔
"اسید!" ابا نے مجھے آواز دی تو میں نے ان کی طرف دیکھا۔
"تم جا رہے ہو اسید؟" بے اختیار انہوں نے پوچھا۔
"میں ابھی آتا ہوں' ذرا دادی جان کو چھوڑ آؤں۔" دادی جان' فاطمہ سے ملیں' لڑکی کی پیشانی چوم کر دعا دی۔
"میں جانے سے پہلے آپ سے ملنے آؤں گی؟"
لڑکی ان کا ہاتھ تھام کر کہہ رہی تھیں۔ میں دادی کو پیچھے آنے کا کہہ کر مڑ گیا اور جب میں واپس آیا تو فاطمہ لاؤنج میں لگی اس بڑی سی تصویر کے پاس کھڑی تھیں جو غالباً نایاب کی تھی۔ میں بھی ہولے ہولے چلتا ہوا اس تصویر کے پاس کھڑا ہو گیا۔
"یہ نایاب کی تصویر ہے نا!" فاطمہ نے مڑ کر مجھے دیکھا۔
"میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن آفتاب اس کا اتنا ذکر کرتے تھے کہ مجھے اسے پہچاننے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگا اور تم......" انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کر مجھے دیکھا۔
"آفتاب نے بتایا تھا جب چند ماہ پہلے وہ آغا خان میں مجھے ملے تھے کہ تم نایاب سے بہت مشابہ ہو۔"
"آفتاب صحیح کہتے تھے' بہت مشابہت ہے۔" ان کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔
"آپ کب آئیں' کیا......" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
"میں جنازے سے پہلے پہنچ گئی تھی۔"

ان کے لبوں کے گوشے کپکپانے لگے تھے' تب ہی کبیر ہولے سے کھنکھارتا ہوا اندر آ گیا۔
وہ مجھے اندر جانے کا کہہ کر خود پورچ میں ہی رک کر مالی یا چوکیدار سے بات کرنے لگا تھا۔

''یہ فاطمہ ہیں۔''

میں نے تعارف کروایا تو کبیر نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس نے فاطمہ کے متعلق کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ شاید وہ جانتا تھا یا شاید اس نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔ فاطمہ مڑ کر پھر تصویر کو دیکھنے لگی تھیں اور کارپٹ پر بیٹھی لڑکی بھی اٹھ کر ان کے پاس کھڑی ہوگئی تھی۔

''اسید!'' کبیر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھے۔ ''آفتاب صاحب کی خواہش تھی کہ تم ان کی ذاتی اشیاء میں سے کچھ لینا چاہو تو لے لو۔''

''میں...... مجھے بھلا کیا لینا ہے۔'' میرے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

''ان کی مراد اپنے کاغذات یا کتابوں وغیرہ سے تھی۔ تم ان کا کمرہ دیکھ لو' انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ ان کے بعد میں تمہیں ان کا' نایاب کا اور سنی بابا کا کمرہ دکھا دوں۔''

اور مجھے یاد آیا کہ انہوں نے ایک بار خواہش کی تھی کہ میں ان کے ساتھ چلوں' وہ مجھے نایاب اور سنی بابا کا کمرہ دکھائیں گے۔

فاطمہ مڑ کر ہمیں دیکھنے لگی تھیں۔

''کیا میں بھی اسید کے ساتھ چل سکتی ہوں۔''

''Sure'' (یقیناً)

''یہ نایاب کا کمرہ ہے۔'' کبیر نے کمرہ کھولا۔ مجھے لگا جیسے میں بہت بار اس کمرے میں آیا ہوں۔ کتنی جزئیات کے ساتھ انہوں نے سب کچھ بتایا تھا۔

تکیے کے پاس اوندھی پڑی کتاب۔

''میں نے یہ کتاب کبھی سیدھی نہیں کی اتنے سالوں میں' پتا ہے کیوں اس لیے کہ میں جب کمرے میں آؤں تو مجھے لگے جیسے ابھی ابھی وہ اس کمرے سے گیا ہے اور بس ابھی آ جائے گا۔''

ایک بار انہوں نے بتایا تھا۔

''آدمی بھی خود کو کیسے کیسے دھوکے دیتا ہے۔ جھوٹے بہلاووں سے خود کو سنبھالے رکھتا ہے۔ حالانکہ آخری سفر پر جانے والے بھلا کب لوٹ کر آتے ہیں۔'' کمپیوٹر ٹیبل شیلف میں لگی میڈیکل کی کتابیں' دیوار پر نایاب حسین اور آفتاب حسین کی تصاویر...... یہ گروپ فوٹو تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ حسین احمد ہی ہوں گے' باوقار سے لبوں پر شفیق سی مسکراہٹ لیے وہ کچھ کچھ آفتاب حسین سے مشابہ تھے۔ شاید اتنی عمر میں وہ بھی ایسے ہی لگتے اور اب پتا نہیں ان کی کیا عمر ہوگی؟ میں نے سوچا۔ دیکھنے میں تو وہ چالیس پینتالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے لیکن پچاس سال سے زیادہ کے

نہیں ہوں گے وہ۔

میں کبیر کے ساتھ ان کے کمرے میں آیا' ویسا ہی سادا سا بیڈروم جیسا نایاب کا تھا۔ دیوار کے ساتھ بنی شیلف میں کتابیں' دائیں طرف دیوار پر ہی گروپ تصویر اور اس کے آس پاس نایاب اور حسین احمد کی ایک فل سائز تصویر...... ٹیبل پر کچھ فائلیں جن میں غالباً ان کی تحریریں تھیں۔

ان کے تکیے پر گڑھا سا پڑا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی سو کر اٹھا ہو۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر ایک دو ڈائریاں' بالکل غیر ارادی طور پر میں نے ایک ڈائری اٹھا کر اسے کھولا۔ اس میں سے کارڈ سائز کچھ تصاویر نیچے گر گئیں۔ میں نے تصاویر فاطمہ کی طرف بڑھائیں۔ جو بھری بھری آنکھوں کے ساتھ کھڑی تھیں۔

''یہ یونیورسٹی کی تصاویر ہیں۔ یہ آفتاب ہیں' یہ میں' یہ صدف' یہ......''

وہ بتا رہی تھیں کہ کبیر کے فون کی بیل ہوئی' وہ معذرت کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ فاطمہ تصاویر دیکھ رہی تھیں' جب میں نے ڈائری کھولی جو صفحہ میرے سامنے تھا اس کا پہلا جملہ تھا۔

''اور پتا نہیں میں فاطمہ کے بغیر زندگی کیسے گزاروں گا۔''

میں نے ایک دم ڈائری فاطمہ کی طرف بڑھا دی۔

''سوری' میں چند لفظ پڑھنے کا مجرم ٹھہرا۔ یہ آپ کی امانت ہے۔ چاہیں تو ضائع کر دیں۔ چاہیں تو رکھ لیں۔''

فاطمہ نے بنا کچھ کہے ڈائری لے لی اور پرس میں رکھ لی اور تصویریں میری طرف بڑھا دیں۔

''آپ رکھنا چاہیں تو رکھ لیں۔''

''نہیں' میرے پاس ہیں۔'' وہ جیسے تھک کر بیڈ کے کنارے پر ٹک گئیں۔

''آفتاب کی بڑی خواہش تھی کہ کبھی میں اس کے ساتھ اس گھر چلوں لیکن میں سوچتی تھی کہ مجھے نہیں جانا چاہیے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اس گھر کا خواب میری آنکھوں میں اتر جائے جہاں میں نے نہیں آنا۔''

وہ ہولے ہولے بول رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ کبھی کبھی جسے جہاں ہونا ہوتا ہے وہ وہاں نہیں ہوتا اور شاید قدرت اسی طرح اپنے بندوں کو آزماتی ہے۔

تب ہی کبیر اندر آ گیا۔ ''آپ کیا لینا چاہیں گے اسید؟''

''یہ تصاویر آفتاب صاحب اور ان کے بھائی اور بابا کی اور ان کا یہ تحریری مواد میں کوشش کروں گا کہ کبھی ان کی کہانیوں کا مجموعہ چھپوا دوں۔''

کبیر کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''یہ کتنی عجیب بات ہے اسید عبدالرحمٰن! کہ آفتاب صاحب تمہیں تم سے زیادہ جانتے تھے۔انہوں نے کہا تھا کہ اسید تصویریں لے گا۔اور میرا تو کوئی وارث نہیں ہے جس کے لیے یہ تصاویر ایسے ہی قیمتی ہوں جیسی میرے لیے ہیں۔ اگر اس نے تصاویر نہ لیں تو پھر انہیں جلا دینا۔''

میں عجیب سی کیفیت میں گھرا کبیر کی بات سن رہا تھا۔جب ذرا سے توقف کے بعد اس نے کہا۔''اور آفتاب صاحب نے کہا تھا کہ ان کی کتابیں آپ کے دادا جان کو گفٹ کر دی جائیں۔وہ بہت باذوق اور قدردان شخص ہیں اور اگر وہ لینے سے انکار کریں تو کسی لائبریری کو ڈونیٹ کر دینا۔''

میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ فاطمہ نے ملتجی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''پلیز مرے ہوئے شخص کی خواہش کو ٹھکراتے نہیں۔''

''اور میں بنا کچھ کہے کمرے سے باہر نکل آیا۔ فاطمہ کچھ دیر وہاں ہی کھڑی رہیں' میں لاؤنج میں آ کر کچھ دیر ٹھہر گیا۔وہ لڑکی جو ایک پینٹنگ کے پاس کھڑی اسے بہت دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر میرے قریب آ گئی۔

''آپ وہی اسید عبدالرحمٰن ہیں نا جن کے آرٹیکل ''طلوع'' میں چھپتے ہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا' میں اب جلد از جلد یہاں سے جانا چاہتا تھا۔مجھ پر یک دم گھبراہٹ طاری ہو گئی تھی۔کل تک یہ گھر آباد تھا۔ یہاں لوگ چلتے پھرتے تھے اور اب......

یہاں اس ٹیبل پر بیٹھ کر کبھی نایاب آفتاب حسین اور سنی بابا نے کھانا کھایا ہو گا پھر پہلے نایاب پھر پپا' ماما اور پھر سنی بابا ایک ایک کر کے چلے گئے۔آفتاب حسین اکیلے رہ گئے۔اس گھر میں یہاں اس صوفے پر کبھی وہ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتے ہوں گے۔کبھی یہاں کھڑے ہو کر انہوں نے نایاب کی تصویر کو گھنٹوں دیکھا ہو گا اور اکیلے میں اس سے چپکے چپکے باتیں کی ہوں گی اور اب کل یہاں کوئی اور چلتا پھرتا ہو گا۔کسی اور کی ہنسی یہاں گونجے گی اور بس یہ ہی ہے زندگی کا مال۔میں نے دل گرفتی سے قیمتی فرنیچر' فُ...سائز ٹی وی اور دوسری اشیاء پر نظر ڈالی۔

اس سب کے لیے جو یہاں ہی رہ جاتا ہے' انسان کتنی بددیانتی کرتا ہے اپنے ساتھ' دوسروں کے ساتھ۔

یکا یک مجھے لگا لڑکی کی نظریں مسلسل مجھ پر ہیں۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دی۔

''آپ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ بہت بے باکی سے حالات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ ماما کو بھی آپ کی تحریر پسند ہے۔ مجھے بہت شوق تھا جرنلسٹ بنوں۔ حالانکہ وہ خود...... آپ کو تو پتا ہو گا نا۔ انہوں نے جرنلزم میں ماسٹرز کیا تھا لیکن پاپا نے نہ تو کبھی انہیں لکھنے کی اجازت دی اور نہ کبھی

کسی اخبار کو جوائن کرنے کی۔حالانکہ ماما میں لکھنے کی بہت صلاحیت تھی بلکہ کالج یونیورسٹی میں وہ شاعری بھی کرتی تھیں۔''

وہ بہت باتونی سی تھی۔ گندمی رنگ' بڑی بڑی خوب صورت بے تحاشا چمکتی آنکھیں' متناسب قد......میری نظر غیر ارادی طور پر پھر اس کی طرف اٹھی۔ بلا کی معصومیت اور کشش تھی اس میں۔

''میں آمنہ ہوں۔مما نے بتایا ہے آپ کو؟ ان کی بیٹی۔''

مجھے اپنی طرف دیکھتا پا کر اس نے بات ادھوری چھوڑ کر تعارف کروایا۔ میں نے فوراً نظریں جھکا لیں۔

''اور پتا ہے مجھے بھی بہت شوق ہے لکھنے کا اور پتا ہے میری کہانیاں خواتین کے ایک ڈائجسٹ میں چھپتی ہیں آمنہ شاہ کے نام سے۔آپ نے کبھی پڑھیں۔''

''پڑھنی چاہئیں۔'' اس نے دانش مندی سے سر ہلایا۔''جو پڑھتے ہیں وہ فائدے میں رہتے ہیں۔'' خواتین کے ڈائجسٹوں میں جو کہانیاں چھپتی ہیں وہاں سے آئیڈیاز لے کر بلکہ چرا کر ٹی وی کے لیے لکھنے میں سہولت ہو جاتی ہے' ہے نا۔''

''بدقسمتی سے میں ٹی وی نہیں دیکھتا۔''میں نے اپنی بے ساختہ مسکراہٹ کو چھپایا۔

''ویری سیڈ۔''

''خیر' کبھی آپ کراچی آئے نا تو میں آپ کو اپنی کہانیاں پڑھاؤں گی۔''

''آپ کے پاپا نے آپ کو منع نہیں کیا لکھنے سے؟''میں نے یونہی پوچھ لیا۔

فاطمہ ابھی تک آفتاب حسین کے بیڈروم میں تھیں جبکہ کبیر لاؤنج سے باہر چلا گیا تھا۔شاید اس کا ڈرائیور ابا اور دادی کو چھوڑ کر واپس آ گیا تھا۔

''نہیں بلکہ پپا تو خوش ہوتے ہیں میرا افسانہ اور پھر اس کی تعریفیں پڑھ کر۔''

''اور آپ نے پوچھا نہیں کہ یہ کیا تضاد ہے''مما کو اجازت نہیں......بیٹی کو ہے۔''

''نہیں......لیکن وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔وقت کے ساتھ آدمی کی سوچ بدل جاتی ہے۔ اب جیسا کہ میں بالکل بھی انگلش لٹریچر میں ماسٹرز نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن یہ مما اور پپا کی خواہش تھی اور جب میں پڑھنے لگی تو مجھے لگا کہ مجھے اسی میں ماسٹر کرنا چاہیے تھا۔''

''آپ ماسٹرز کر رہی ہیں؟''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔میرا خیال تھا کہ وہ فرسٹ ائیر یا سیکنڈ ائیر کی طالبہ ہو گی۔

''ہاں' میرا فائنل ائیر ہے۔''

تب ہی فاطمہ آ گئیں۔میں نے دیکھا ان کی پلکیں پھر بھیگی بھیگی سی تھیں۔شاید وہاں اکیلے کمرے میں وہ پھر روئی تھیں۔ میں نے ان کے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کی اور دھیمے لہجے

میں پوچھا۔
''آپ یہاں کچھ دیر اور ٹھہرنا چاہیں گی یا چلیں گی؟''
''نہیں چلتی ہوں' اب ٹھہر کر کیا کرنا' یہ گھر کون خرید رہا ہے؟''
''معلوم نہیں لیکن میرا خیال ہے انہوں نے یہ کسی ادارے کو ڈونیٹ کر دیا تھا۔ کبیر صاحب کو سب تفصیل معلوم ہوگی۔ آپ پتا کرنا چاہیں تو......''
''نہیں' میں نے تو یونہی پوچھا تھا۔''
''اوکے' شاید ایک دو ملاقاتیں اور ہوں آپ سے۔''
کبیر نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور میں خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔ فاطمہ گیٹ کے ساتھ کھڑی سفید کرولا کی طرف بڑھیں پھر گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے انہوں نے میری طرف دیکھا۔
''آیئے اسید! ہم آپ کو ڈراپ کر دیتے ہیں۔''
''تھینک یو میم! میں چلا جاؤں گا۔''
''تکلف مت کریں' آیئے پھر مجھے آپ سے وہ امانت بھی تو لینا ہے۔ آپ کہاں تکلیف کرتے پھریں گے۔''
''وہ کیا ہے؟ آفتاب انکل نے کیا دیا ہے مام کو؟'' آمنہ نے پوچھا۔
میں ڈرائیور کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا تھا اور اسے پتا سمجھا دیا تھا۔
میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔
''کوئی کہانی ہے شاید' انہوں نے کسی کی فرمائش پر لکھی ہے۔ ان کی آخری کہانی۔ ایک طویل گیپ کے بعد انہوں نے لکھی ہے۔''
''اچھا ماما! کیا میں وہ کہانی پڑھ سکتی ہوں؟''
پتا نہیں فاطمہ نے کیا جواب دیا تھا۔ میں نے سنا نہیں تھا۔ میں ایک بار پھر آفتاب حسین کے متعلق سوچنے لگا تھا۔ میں نے ان سے نفرت کرنے کی ان سے دور رہنے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن نہ تو میں ان سے نفرت کر سکا اور نہ ہی ان سے دور رہ سکا۔ آج اور کل کے ہر اخبار میں ان کی موت کے متعلق خبر چھپی تھی۔ اکثر کالم نگاروں نے اپنے اپنے کالموں میں ان کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔
ہر ایک کی اپنی رائے اپنا خیال تھا اور اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں ان کے متعلق کیا رائے رکھتا ہوں تو شاید میں کچھ بھی نہ کہہ سکوں۔
''یہاں سے کدھر جانا ہے؟''
ڈرائیور نے پوچھا تو میں چونکا۔

''بس یہاں ہی ایک سائیڈ پر کر کے پارک کر لیں۔ اندر گلی میں گھر ہے اور وہاں گاڑی کا جانا ذرا مشکل ہے۔''
ڈرائیور نے روڈ سے ہٹ کر ایک سائیڈ پر گاڑی کھڑی کی۔
''تھینک یو میڈم!'' میں نے فاطمہ کا شکریہ ادا کیا۔ ''آپ پلیز پانچ منٹ ویٹ کریں۔ میں آپ کی امانت لاتا ہوں۔''
''کیوں' کیا آپ ہمیں اپنے گھر تک نہیں لے جانا چاہتے۔''
آمنہ شوخ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں یک دم شرمندہ ہو گیا۔
''نہیں' ایسی بات نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ غریب خانے پر آنا پسند نہ کریں۔''
''یہ آپ کی سوچ ہے' ویسے آپ کو مان لینا چاہیے کہ آپ کو ہمیں گھر چلنے کو کہنا چاہیے تھا۔''
''سوری مس! اب چلیں غریب خانہ اس قابل نہیں کہ......''
''ہم بھی کوئی جدی پشتی' دولت مند لوگ نہیں ہیں۔ ہمارا تعلق بھی متوسط گھرانے سے ہے اور اب بھی ہم کوئی رئیس نہیں ہیں۔ یہ گاڑی میرے بھائی کی ہے جو دیارغیر میں نہ جانے کتنی محنت کر کے اپنی فیملی کو سہولتیں فراہم کر رہا ہے۔''
فاطمہ گاڑی سے باہر آ گئی تھیں۔ میں مزید شرمندہ ہوا اور ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔
دادی انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں۔
''ارے یہ اچھا کیا بیٹا! کہ تم اسید کے ساتھ آ گئیں۔ وہاں تو تم سے ڈھنگ سے بات بھی نہ ہو پائی تھی۔ اللہ آفتاب بیٹے کو جنت میں جگہ عطا فرمائے۔''
اور یہ بزرگ بھی خوب ہوتے ہیں' لمحوں میں اجنبیوں سے بے تکلف ہو کر رشتے جوڑ لیتے ہیں۔ دادی بھی ایسی ہی تھیں اور ایک میں تھا۔ مجھے تو کسی سے بے تکلف ہونے میں بہت وقت لگتا تھا۔ انہیں دادی کے پاس چھوڑ کر میں بیٹھک میں آیا اور اپنی الماری سے وہ پیکٹ جو آفتاب حسین نے مجھے دیا تھا۔
وحید فوراً ہی پیپسی گلاسوں میں ڈال کر لے گیا۔ وحید اور سعید دونوں ہی کچن اور گھر کے کاموں میں دادی کا ہاتھ بٹاتے تھے جبکہ مجھے ذرا بھی ان کاموں سے دلچسپی نہ تھی بلکہ دادا بھی اکثر کچن میں دادی کے پاس بیٹھے کبھی انہیں پیاز کاٹ کر دے رہے ہوتے۔ کبھی آلو اور سبزی کاٹی جا رہی ہوتی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دادی پر اس عمر میں بہت ذمہ داریاں پڑ گئی تھیں۔ پھوپھی کا گھر نزدیک تھا۔ وہ بھی کبھی کبھی آ کر ہاتھ بٹا جاتیں۔ خاص طور پر جب دادی بیمار ہوتیں ان کے تین بچے تھے' دو بیٹیاں' ایک بیٹا۔ بڑی بیٹی تو آمنہ کی ہی ہم عمر ہوگی۔ یا کچھ کم۔ بی اے کی طالبہ تھی' اس کی وجہ سے بھی دادی کو آسانی ہو گئی تھی' وہ جب بھی فارغ ہوتی دادی کے پاس

آجاتی۔
''سعید بیٹا! ذرا عاشی کو بلا لو' کہنا مہمان آئے ہیں۔''
میں نے صحن میں دادی کی آواز سنی اور ساتھ ہی فاطمہ کی آواز آئی۔
''پلیز خالہ جان! کوئی تکلف وغیرہ مت کریں۔'' پتا نہیں دادی نے کیا کہا تھا۔ میں نے سنا نہیں اور واپس بیٹھک میں آ گیا۔ سعید' عاشی کو بلا لایا تھا۔
اور جب کچھ دیر بعد فاطمہ اور آمنہ جا رہی تھیں تو میں نے دیکھا عاشی اور آمنہ میں اچھی خاصی دوستی ہو چکی تھی۔ بلکہ ایک دوسرے سے ایڈریس اور فون نمبرز کا تبادلہ بھی ہو رہا تھا۔
''یہ لڑکیاں بھی بس۔''
اب بھلا ایک کراچی میں رہنے والی لڑکی اور ایک لاہور کی لڑکی ایک دوسرے سے دوستی کر کے کیا کرے گی۔
میں انہیں گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ عاشی بھی نئی نئی دوستی نبھانے کو ساتھ تھی۔ وہ دونوں آگے آگے جا رہی تھیں جبکہ فاطمہ اور میں کچھ پیچھے تھے۔
''آفتاب نے آخری دنوں میں کبھی میرے متعلق کوئی بات کی؟''
انہوں نے کسی قدر جھجکتے ہوئے پوچھا۔
''وہ آپ کی بہت تعریف کرتے تھے۔'' میں نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ ''آپ کی ذہانت کی' آپ کی سوچ کی' آپ کے خیالات کی۔ مرنے سے چند منٹ قبل انہوں نے نایاب اور سنی بابا کو یاد کیا تھا۔ مجھ سے کہا تھا کہ میں ان کے سنی بابا کے لیے ضرور دعا کیا کروں اور کہا تھا اگر کبھی آپ سے میری ملاقات ہو جائے تو آپ سے بھی درخواست کروں کہ ان کی اور سنی بابا کی مغفرت کی دعا کریں کہ ان کے لیے تو دعا کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔''
اور پھر گاڑی تک خاموشی رہی۔ واپس آتے ہوئے عاشی مسلسل بول رہی تھی۔
''آمنہ بہت اچھی ہے۔ آپ کو نہیں پتا' اسید بھائی! کہ مجھے آمنہ سے مل کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ پتا ہے وہ بہت اچھے افسانے لکھتی ہے۔ میں نے کئی افسانے پڑھے ہیں اس کے سچی اور فاطمہ آنٹی بھی بہت اچھی ہیں۔ انہوں نے میری بنائی ہوئی چائے کی بہت تعریف کی لیکن وہ جل ککڑ سعید فوراً بول اٹھا کہ دم تو میں نے کی تھی۔ اس نے تو صرف دودھ گرم کیا ہے' میری تعریف سے ہمیشہ جل جاتا ہے۔''
سعید' عاشی اور راحیل یوں ہی ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور تینوں میں دوستی بھی بہت تھی اور......

پھر کئی دن گزر گئے۔ میں نے دفتر جانا شروع کر دیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے

کیا کرنا ہے۔ کیا میں وہ سب کچھ کر سکوں گا جس کی خواہش آفتاب حسین نے کی تھی۔ نہیں' یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اخبار نکالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں اور میرے جیسا بندہ جس کا کوئی مددگار نہیں' وہ بھلا کیا کر سکتا ہے۔ میں کبیر سے کہوں گا کہ میں یہ ذمہ داری نہیں اٹھا سکتا۔ تم مہربانی کرو اور یہ مکان بھی کسی ادارے کو ڈونیٹ کر دو۔ اور مجھے معاف کر دو۔ میں فیصلہ کر کے کئی دنوں کے بعد مطمئن ہوا' تو مجھے اس آرٹیکل کا خیال آیا جسے میرے ایڈیٹر نے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا۔ میرا خیال ہے مجھے دوسرے اخبارات سے بھی رابطہ کرنا چاہیے۔
اس روز اور اس سے اگلے کئی روز تک میں نے کئی اخبارات سے بات کی لیکن سب نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا۔
''آپ کیا چاہتے ہیں کہ ہمارے اخبار کے دفتر کو آگ لگا دی جائے اور یہاں توڑ پھوڑ کی جائے۔''
ایک صاحب نے کہا۔
ایک اور اخبار کے ایڈیٹر نے جواب دیا۔ ''صاحب ہمارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ ہمیں ان کا مستقبل عزیز ہے۔''
میں بے حد مایوس سا گھر آیا تھا اور صحن میں بچھی چارپائی پر بازو کا تکیہ بنائے لیٹ گیا اور یہ کس قدر مشکل ہے' ہر آدمی کی اپنی ترجیحات ہیں اور اپنے مفاد۔ میں نے یوں ہی خوامخواہ اتنی تحقیق کی۔ ہاں اگر میرا اپنا اخبار ہوتا تو میں اپنی مرضی سے جو چاہے چھاپ لیتا۔
ایک لمحہ کے لیے میرے دل میں خیال آیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے یہ خیال ذہن سے جھٹک دیا۔
''نہیں' یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔''
''اسید!'' دادا بے حد چپکے سے آ کر میرے پاس بیٹھے تھے' میں ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔
''دادا! آپ......؟''
''تم کچھ پریشان ہو بیٹا؟''
''ہاں......نہیں تو......''
وہ ذرا سا مسکرائے۔
''مجھے بتاؤ' شاید مجھ بڈھے کی عقل میں کوئی بات سما جائے۔''
میں چند لمحے دادا کے شفیق چہرے کو دیکھتا رہا اور پھر میں نے وہ سب جو سوچ رہا تھا دادا کو بتا دیا۔
''دادا جان! ہم اتنے بزدل کیوں ہیں؟ ہم حقائق سے کیوں منہ پھیر لیتے ہیں۔''
''مجبوریاں ہوتی ہیں بیٹا!''

"کیسی مجبوریاں؟" میں نے ایک شکوہ بھری نظر ان پر ڈالی۔
"کئی قسم کی بیٹا! ہر شخص اپنی مجبوریوں کے حصار میں قید رہتا ہے' ہوسکتا ہے جن لوگوں کو تم بے نقاب کرنا چاہتے ہو' وہ اتنے پاورفل ہوں کہ لوگ ان کی طاقت سے ڈرتے ہوں کہ وہ انہیں نقصان نہ پہنچائیں۔"
"پھر یہ مجبوری تو نہ ہوئی نا بزدلی ہوئی۔"
"اپنے اپنے اندازِ فکر کی بات ہے بیٹا! ہوسکتا ہے ان کے نزدیک یہ بزدلی نہ ہو۔ مصلحت اور عقل مندی ہو۔"
"اور پھر بابا! یہ کالی بھیڑیں کیسے ان کی شناخت ہوگی۔ کیسے ملک کو ان سے بچایا جاسکے؟"
"ہاں' یہ بات تو سوچنے کی ہے کہ کیسے ان بھیڑیوں کے ہاتھوں سے اس ملک کو بچایا جائے جو اسے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔" انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا تھا۔
"خیر......" انہوں نے میرے بازو پر ہاتھ رکھ کر ہولے سے تھپتھپایا۔ "تم اپنی سی کوشش کرتے رہو۔ ضروری تو نہیں تم انہیں بے نقاب کرو' کسی اور طرح ان برائیوں کے خلاف لکھ کر جو معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ رہے ہیں' اپنا فرض ادا کرسکتے ہو۔"
"پتا نہیں دادا جان! مجھے کیا کرنا ہے' میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور وہ آفتاب حسین کہتے تھے۔ قلم کی حرمت کو کبھی نہ بیچنا۔ کبھی سچ لکھتے ہوئے ڈرنا مت' روشنی پھیلاتے رہنا۔"
"اچھے آدمی تھے آفتاب حسین' بہت محبت کرنے والے۔ اللہ ان کے درجات بلند کرے۔ بہت کم ملاقاتیں ہوئیں لیکن بہت اپنے اپنے سے لگتے تھے۔ گئے تو یوں لگا جیسے اپنا بچہ رخصت ہوتا ہے تو دل درد سے بھر جاتا ہے۔" وہ افسردہ سے ہوگئے تھے۔
"دادا جان! آپ کو کیا پتا۔ وہ اچھے آدمی تھے یا برے۔"
میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
"کیوں' کیا وہ تمہیں برے لگتے تھے؟ تمہارے ساتھ کیا برائی کی تھی انہوں نے؟ پھر وہ اگر برے تھے تو تم اتنا روئے کیوں تھے۔ اتنے افسردہ کیوں ہو اب تک؟"
"نہیں' میرے ساتھ تو کوئی برائی نہیں کی انہوں نے۔" میں سٹپٹا گیا۔
"لیکن دادا جان! وہ وہ نہیں تھے جو نظر آتے تھے۔"
"اچھا پھر......" دادا نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ "کیا تھے وہ؟"
"دادا جان!" مجھے لگا جیسے میرے دل پر بہت بھاری بوجھ دھرا ہو اور میں بولتا چلا گیا۔ پہلی ملاقات سے لے کر آخری لمحے تک دادا خاموشی سے بیٹھے رہے۔
"میں انہیں پسند نہیں کرتا تھا شاید' میں ان سے نفرت کرتا تھا لیکن جب وہ بیمار ہوئے اور جب میں ان کے آخری دنوں میں ان کے پاس رہا تو مجھے لگا جیسے میں ان سے نفرت نہیں کرتا'

کر ہی نہیں سکتا۔ ایسا کیوں ہے دادا جان! وہ جھوٹ سے' ریا سے' دھوکے سے نفرت کرتے تھے پھر بھی وہ یہ سب کچھ کرتے رہے' کیوں؟"
"کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی بنے بنائے راستے پر چلتا ہی چلا جاتا ہے وہ اپنے لیے کوئی الگ راستہ تلاشتا نہیں' بس جو اس کے بزرگ اس کے لیے راستہ بنا دیتے ہیں وہ اسی پر چل پڑتا ہے۔"
"لیکن اس کا اپنا دماغ اپنی سوچ بھی تو ہوتی ہے دادا جان! وہ خود بھی تو فیصلہ کرسکتا ہے کہ یہ غلط ہے یا صحیح ہے۔"
"ہاں ایسا وہ لوگ کرتے ہیں جن کے پاس کوئی نصب العین ہوتا ہے۔ زندہ رہنے کا کوئی جواز ہوتا ہے۔ آفتاب حسین کے پاس نہ زندہ رہنے کا کوئی جواز تھا نہ زندگی کا کوئی نصب العین۔ نایاب نہیں رہا تھا۔ فاطمہ بھی نہیں تھی تو......"
دادا جان ان کی وکالت کررہے تھے۔ یہ آفتاب حسین بھی جادوگر تھے پورے۔ کیسے دادا جان اور سب گھر والوں کو اسیر کرگئے تھے۔ یہ محبت تھی جو دادا جان کے لہجے سے جھلک رہی تھی' آفتاب حسین کی محبت لیکن غلط وہ بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ اگر سنی بابا ان کے لیے کوئی روشن راستہ بناتے تو پھر وہ اسی ڈگر پر چل پڑتے لیکن وہ تو خود اندھیرے رستوں کے مسافر تھے پھر آفتاب حسین کے لیے کوئی روشن رستہ کیسے چھوڑتے' سو وہ بھی اندھیروں کے ہی مسافر بن گئے تھے' کبھی کبھی آدمی کو اپنے بڑوں کی غلطیوں کی سزا بھی بھگتنا پڑتی ہے۔ کاش سب والدین اپنے بچوں کے لیے صراطِ مستقیم کا ورثہ چھوڑیں اور اگر ایسا ہوجائے تو سب سنور جائیں پھر بھی اگر کوئی بھٹک جائے تو یہ اس کی تقدیر لیکن ہوتا یوں ہے کہ والدین نہ حرام وحلال کا فرق بتاتے ہیں' نہ غلط صحیح کا ادراک دیتے ہیں' نہ جھوٹ سچ کی تمیز سکھاتے ہیں۔
اور......
"تمہیں چاہیے اسید! کہ وہ عہد جس کا وارث تمہیں آفتاب حسین نے بنایا ہے وہ ضرور پورا کرو۔" انہوں نے میری سوچوں کا سلسلہ توڑ دیا۔
"لیکن دادا جان! یہ ناممکن ہے میں سمجھتا ہوں۔"
"کچھ بھی ناممکن نہیں میری جان!" انہوں نے میری بات کاٹی۔ "تم کوشش تو کرو' اگر ناکام بھی ہوگئے تو کم از کم روزِ محشر ان کے سامنے شرمندہ تو نہیں ہوگے کہ تم نے عہد پورا کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔"
وہ مسکرا رہے تھے۔ مجھے ان کی باتوں سے بڑا حوصلہ ہوا اور میں نے سوچا کہ کوشش کر لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ آخر یہ میرا خواب بھی تو تھا بڑا رائٹر اور بڑا صحافی بننا۔ کیا پتا تقدیر نے مجھے اسی لیے آفتاب حسین سے ملایا ہو۔

***

اور پھر جدوجہد کی ایک لمبی طویل داستان ایک نیا اخبار نکالنا۔

اور اخبارات کے ہجوم میں اس کی پہچان اور شناخت بنانا کوئی آسان کام نہ تھا۔کئی دفعہ میں بددل ہوا' کئی بار ہمت ہار دی۔لیکن حوصلہ بڑھانے والے بہت تھے۔

دادا جان میرے سب سے بڑے سپورٹر تھے اور پھر ہولے ہولے اس قافلے میں دوسرے بھی شامل ہوتے گئے۔

صدف' احمر کی کزن اور منگیتر۔

***

اس روز میں احمر کے دادا اور والدہ سے ملنے گیا تھا۔میری عادت تھی کہ میں مہینے میں ایک دو چکر ضرور لگاتا تھا۔اس کے دادا جان اور والدہ خوش ہو جاتے۔احمر ان کا واحد اثاثہ تھا اور اسے کھو کر وہ کتنے تہی دامن ہو گئے تھے۔ان کے چھوٹے سے گھر میں بیٹھے' ان سے باتیں کرتے ہوئے مجھے احمر بے تحاشا یاد آتا۔میری آنکھیں جلنے لگتیں۔

احمر نوید

اس کے خواب

اس کے آدرش۔

اس روز میں پورے دو ماہ بعد ان کی طرف گیا تھا۔انہوں نے گلہ نہیں کیا تھا لیکن میں شرمندہ تھا کہ اپنی مصروفیات میں انہیں بھلا بیٹھا تھا۔

''بہت مصروف تھا بابا جان! اخبار نکالنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔''

''آپ اخبار نکال رہے ہیں؟''

یہ صدف تھی جو ابھی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔احمر کی وفات کے بعد تین چار بار اس کے گھر میں میری ملاقات اس سے ہو چکی تھی۔

''ہاں کوشش کر رہا ہوں۔''

''میری مدد کی ضرورت ہو تو......''

اور مجھے یاد آیا احمر نے کہا تھا' وہ بہت مخلص کارکن ثابت ہو گی۔

''مثلاً آپ کیا مدد کر سکتی ہیں؟'' میں نے یونہی پوچھا۔

''میں لکھ سکتی ہوں۔طنز و مزاح' سنجیدہ ہر طرح کا۔احمر اور میں اکثر خواب دیکھتے تھے کہ ہم اپنا ایک میگزین نکالیں گے اور اس میگزین میں ہم کیا کیا شامل کریں گے' وہ ایک پیور تفریحی میگزین نہیں ہو گا' اس میں......''

وہ بول رہی تھی اور میں خاموشی سے سن رہا تھا۔وہی سوچ' وہی خیالات جو احمر کے تھے۔

برائیوں کے خلاف قلم سے جہاد' اتحاد کی کوشش' محبتوں کا پرچار۔وہ یہ سارے کام اپنے قلم سے لینا چاہتی تھی' بالکل احمر کی طرح۔

بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی۔آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔میں نے دیکھا۔بابا جان اور ماں جی کی آنکھیں بھی نم ہو رہی تھیں۔وہاں موجود ہم سب احمر کی یادوں میں گھر گئے تھے۔

''او کے!'' میں نے سب کو احمر کی یادوں سے باہر لانے کی کوشش کی۔میرے اخبار میں آپ کی نوکری پکی۔دو چار روز تک ڈیکلریشن مل جائے گا تو میں آپ کو انفارم کر دوں گا۔''

اس نے سر ہلا دیا۔میں نے دیکھا باوجود ضبط کے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''کیا خیال ہے Pay وغیرہ بھی طے کر لیں ابھی۔ویسے آپ کی ڈیمانڈ کیا ہو گی؟'' میں اسے اس فیز سے نکالنا چاہتا تھا۔

ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور وہ ٹرے اٹھا کر باہر چلی گئی۔

آمنہ شاہ' فاطمہ کی بیٹی' عروج اس کی دوست' آمنہ اور عاشی کی دوستی ہو چکی تھی اور عاشی اسے سب خبریں دیتی رہتی تھی۔

''اسید بھائی! آمنہ کہہ رہی تھی کہ آپ اپنے اخبار میں اس کی کہانیاں بھی شائع کریں' کریں گے نا!''

''پاگل! اخبار میں کہانیاں نہیں چھپتیں۔'' سعید نے اسے ٹوکا تھا۔

''سنڈے میگزین میں تو چھپتی ہیں تو وہ سنڈے میگزین کے لیے بھیج دیا کرے گی۔''

لیکن وہ جو ستر ستر صفحے کی کہانیاں لکھتی ہے نا وہ سنڈے میگزین میں نہیں چھپ سکتیں۔''

''تو وہ مختصر لکھ لے گی۔''

دونوں بحث کرنے لگے تھے لیکن پھر یوں ہوا کہ آمنہ کے پپا کراچی کے حالات سے گھبرا کر لاہور شفٹ ہو گئے جب میرے اخبار کی پہلی کاپی آئی تھی تو وہ لاہور آ چکی تھی۔اور جگمگاتی آنکھوں والی وہ لڑکی بہت ایکسائیٹڈ تھی اور میرے اخبار کے آفس میں بیٹھ کر صدف اور عروج کے ساتھ اس نے مستقبل کے لیے نہ جانے کتنے پلان بنا ڈالے تھے۔عروج اس کی کزن بھی تھی اور دوست بھی۔

پھر حامد تھا' بے حد ذہین اور جینئس۔خود بخود ہی ایک ٹیم بن گئی تھی۔ہم سب ایک جیسی سوچ رکھنے والے تھے۔

''نوید سحر'' اخبار کا یہ نام آمنہ نے تجویز کیا تھا اور پتا نہیں کیا بات تھی کہ جب عاشی نے کہا کہ آمنہ کہہ رہی ہے کہ اخبار کا نام ''نوید سحر'' رکھ لیں تو میں نے اسے او کے کر دیا۔حالانکہ سعید' راحیل اور صدف نے کئی اور نام بھی تجویز کیے تھے۔جلد ہی ہمارے اخبار کا ایک نام بن گیا تھا

ہم سب بہت محنت کرتے تھے۔

آمنہ نے خواتین کا صفحہ سنبھال لیا تھا۔ صدف حالات حاضرہ پر تبصرہ کرتی تھی۔ اس کا مشاہدہ گہرا تھا اور حامد کرائم رپورٹر تھا اور اس کے علاوہ بہت اچھے فیچر لکھتا تھا۔ دفتر میں ان کے علاوہ بھی اور بہت سے لوگ تھے جو کسی بھی اخبار کو چلانے کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ یہ سب خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والے لوگ تھے۔ گو ابھی سرکولیشن زیادہ نہ تھی پھر بھی مختلف حلقوں میں ''نوید سحر'' کا ذکر ہونے لگا تھا۔ خصوصاً صدف کا کالم اور حامد کے فیچر کے علاوہ میرا کالم بھی پسند کیا جا رہا تھا۔ اور اخبار کی سرکولیشن چند ماہ کے بعد اتنی ہوگئی کہ نہ صرف اخبار کا خرچ نکل رہا تھا بلکہ سب کی تنخواہیں بھی کچھ نہ کچھ نکل رہی تھیں۔ سب بے حد پُر امید اور پُر جوش تھے۔

ہفتہ وار میگزین ہم سنڈے کے بجائے فرائیڈے کو شائع کرتے تھے۔ حامد کا خیال تھا کہ سنڈے کو سب ہی اخباروں کے سنڈے میگزین چھپتے ہیں ہمیں فرائیڈے کو میگزین نکالنا چاہیے۔ اس سے سرکولیشن پر اثر پڑے گا۔ سو میں نے ایسا ہی کیا تھا۔

اخبار نکلتے سال سے زیادہ ہوگیا تھا اور ہم نے اس سال بھر میں کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ میں نے ایک روز آفس میں بیٹھے بیٹھے سوچا اور کیا میں نے یہ اخبار اسی لیے نکالا تھا کہ چند خبریں، رپورٹیں اور چند کالم لکھ دوں بس۔ اس طرح تو اور بھی کئی اخبار تھے اور وہ آفتاب حسین اور احمر نوید سے کیا گیا وعدہ کیا ہوا؟ وہ برائیوں کے خلاف قلم سے جہاد، وہ اپنے ملک کو دنیا کا ایک بہترین ملک بنانے کی کوشش۔

غداروں اور دشمنوں کے خلاف قلمی جہاد۔

''واہ اسید عبدالرحمٰن! تمہارے سارے دعوے بھی بس دعوے ہی تھے۔''

میں نے خود کو ڈپٹا۔ تب ہی آمنہ کلپ بورڈ اٹھائے آفس میں داخل ہوئی۔ میں نے بے دھیانی سے اس کی طرف دیکھا اور پھر جیسے لمحہ بھر کے لیے میری نظریں اس کے چہرے پر ٹھہری گئیں۔ بلا کی ملاحت اور معصومیت تھی اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں اتنی جگمگاہٹیں تھیں کہ میں نے کسی اور کی آنکھوں میں اتنی چمک نہیں دیکھی تھی۔ میں نے نظریں جھکا لیں لیکن میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب سی ہوگئی تھیں۔ پتا نہیں ایسا کیا تھا کہ جب کبھی میں اکیلا خالی الذہن سا لیٹا ہوتا تو آمنہ میرے تصور میں چلی آتی، کبھی ہنستی کھلکھلاتی صدف، عاشی اور عروج سے ہنسی مذاق کرتی۔ کبھی حامد، فیصل، منیب اور مجھ سے سنجیدہ باتیں کرتی، میں کئی بار جھنجلا جاتا۔ آخر کیوں؟ کیا ہے اس لڑکی میں کہ میں اسے سوچتا رہتا ہوں لیکن کچھ تو تھا کہ میں اس سے متاثر ہو رہا تھا۔

''یہ دیکھو اسید! یہ میں نے مختلف چینلز پر ہونے والے ان پروگراموں کے متعلق لکھا ہے

جنہیں دیکھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم بھارتی ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔''

''موضوع اچھا ہے لیکن حسب معمول تم نے بہت تفصیل سے لکھا ہے۔'' میں نے کاغذات کی ورق گردانی کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ بس لکھتے ہوئے پتا نہیں چلتا۔ لاؤ مجھے دو میں اسے مختصر کرتی ہوں۔'' اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میں دیکھ لیتا ہوں پہلے۔''

ہم ایک سال سے اکٹھے کام کر رہے تھے، اس لیے ہمارے درمیان اب آپ والا تکلف نہیں رہا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔ ''آج عاشی نہیں آئی ابھی تک؟''

''وہ سعید کے ساتھ گئی ہے، اس کے کالج میں کوئی فنکشن تھا وہاں۔''

''دونوں وہاں بھی لڑتے ہی رہیں گے۔''

وہ ہولے سے ہنسی اور میں اس کی ہنسی میں کھو گیا۔ اس کی ہنسی اس کے صبیح چہرے پر کتنی سج رہی تھی۔

''یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔''

میں نے خود کو ڈپٹا۔ تب ہی صدف بھی اندر آگئی اور کرسی پر بیٹھے ہوئے اس نے میری طرف دیکھا۔

''ہم آخر کر کیا رہے ہیں اسید!''

''جھک مار رہے ہیں۔'' بے اختیار ہی میرے لبوں سے نکلا تھا۔

''تو یہاں جھک مارنے سے بہتر نہیں ہے کہ اپنے گھروں میں بیٹھ کر جھک ماریں۔ تم جانتے ہو اسید! کہ میں نے تمہارے ساتھ کام کرنے کی خواہش کیوں کی تھی، اس لیے کہ مجھے تمہارے قلم کی بے باکی اور سچ پسند تھا لیکن تم نے تو جیسے قلم کو بند کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ جومت لکھ رہے ہو، ایسا لکھنے کی تم سے امید تو نہیں تھی مجھے وہی گھسے پٹے مردہ سے لفظ۔''

کمزور سا احتجاج

''تم نے کل کے اخبار میں جو اداریہ لکھا، وہ کیا تھا۔ ایک کمزور بچے کا بے کار احتجاج۔ جس سے تمہارے نقطۂ نظر کی بھی وضاحت نہیں ہو رہی تھی۔'' میں نادم سا ہو گیا۔ وہ صحیح ہی تو کہہ رہی تھی کہ اخبار کے اداریے میں، میں نے لاپتا افراد کے متعلق لکھا تھا کہ حکومت کو چاہیے کہ انہیں تلاش کرے بس۔ واقعی یہ مردہ سے الفاظ تھے جو کسی دل میں حرارت پیدا نہیں کر سکتے تھے جو کسی زنجیر کو پگھلا نہیں سکتے تھے۔

ان لفظوں سے زیادہ اثر تو اس معصوم بچی کے الفاظ میں تھا جو اپنی ماں کے ساتھ ہمارے

اخبار کے آفس میں آئی تھی' ان بے جان لفظوں سے زیادہ طاقت ور تو وہ آنسو تھے جو اس بچی کی آنکھوں میں تھے۔

''انکل! مجھے اپنے ابو بہت یاد آتے ہیں۔ وہ تو بہت اچھے تھے' وہ بھلا دہشت گردوں کی مدد کرسکتے ہیں؟''

اس معصوم بچی کے باپ کو القاعدہ کی مالی مدد کرنے کے الزام میں گرفتار کیا گیا تھا۔ یہاں اخبار کے دفتر میں موجود ہر شخص نے اسے تسلی دی تھی اس کے آنسو پونچھے تھے۔

وہ پوچھ رہی تھی۔

''انکل! آپ اپنے اخبار میں لکھیں گے تو کیا میرے ابو واپس آجائیں گے؟''

اور میرے پاس اس کی بات کا جواب نہ تھا۔ میں نے یونہی اسے تسلی دینے کے لیے سر اثبات میں ہلا دیا تھا۔

اور اس کے مرجھائے ہوئے چہرے پر جیسے رونق سی آگئی تھی۔ اور میں نے یونہی چند بے جان اور مردہ لفظوں سے سجا کر ایک اداریہ لکھ دیا تھا اور بس گویا ایک فرض ادا ہوگیا تھا۔ ہم زیادہ تر صحافی یہی تو کررہے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم نے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ اس روز جیسے میرا ضمیر مجھے بار بار سرزنش کررہا تھا۔

تب میں نے دراز سے سال بھر پہلے لکھا جانے والا آرٹیکل نکالا جسے کوئی بھی اخبار چھاپنے کے لیے تیار نہ تھا کیونکہ اس میں چند ایسے نام بھی تھے جو اعلا عہدے دار تھے' بڑے بزنس مین تھے اور میں نے آرٹیکل پر ایک نظر ڈالی۔

''آفتاب حسین ایک بڑے اخبار کا مالک بھی ان بڑوں میں شامل ہے۔''

میں نے اپنے ہی لکھے ہوئے الفاظ کو پڑھا اور پھر اس جملے پر لکیر ماردی۔

جو چلے گئے ان کا کیا ذکر اور پھر اسی دراز سے وہ فائل نکالی جس پر میں نے وہ ٹاپک لکھ رکھے تھے جن پر مجھے لکھنا اور کام کرنا تھا۔ سال بھر میں کچھ فرق نہیں پڑا تھا' وہی مسائل تھے اور وہی پریشانیاں۔

وطن عزیز میں وہی سب کچھ ہورہا تھا جو سال بھر پہلے تھا۔ عوام کا استحصال اپنے ہی بندوں کا قتل عام' وہی مسائل وہی عذاب۔

ابھی تک وانا میں قبائلیوں کے ساتھ وہی کچھ ہورہا تھا جو پہلے تھا۔ وہی بے مقصد جنگ ایک بڑی طاقت کو خوش کرنے کے لیے جو جنگ 2003ء میں شروع کی گئی تھی' وہ ابھی تک جاری تھی۔

وہی نفرت کی دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش۔

وہی لینڈ مافیا تھا۔

وہی منشیات کے اسمگلر تھے۔

وہی بچوں کی اسمگلنگ' انسانوں کی فروخت' رشوت' کرپشن۔

سب کچھ ویسا ہی تھا' کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔

اور ہمیں ان سب کے خلاف اپنے قلم سے جنگ کرنا تھی۔

شاید ہم اس نظام کو بدل نہیں سکتے تھے۔ رشتوں کو تبدیل نہیں کرسکتے تھے۔

ہم لالچ اور ہوس سے آلودہ دلوں میں قناعت پیدا نہیں کرسکتے تھے لیکن ہم ایک کوشش تو کرسکتے تھے اور میں نے یہ کوشش کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ دادا کہتے تھے' انسان کو اپنے حصے کا کام کرلینا چاہیے۔ یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ دوسرا نہیں کررہا تو میں کیوں کروں۔ میرے ساتھ مخلص ساتھی تھے۔

محب وطن۔

اور دلوں میں کچھ کرنے کا جذبہ رکھنے والے۔ سو میں نے اس راستے پر قدم رکھ دیا تھا جہاں قدم قدم پر رکاوٹیں تھیں' مشکلات تھیں' آبلہ پائی تھی لیکن مجھے اسی راستے پر چلنا تھا۔ یہ طے ہوچکا تھا۔

اور اس کانٹوں بھرے راستے پر چلتے چلتے مجھے لگا کہ میرے اندر کہیں ایک تارا سا ٹمٹماتا ہے۔

ایک روشنی سی جگمگ کرتی ہے۔

اور یہ آمنہ کی محبت کی روشنی تھی جو کسی ٹھنڈے میٹھے احساس کی طرح تھکی ماندی زندگی کو حرارت بخشتی تھی۔

آمنہ شاہ۔

جو بہت پیاری اور کومل تھی جس کے دل کا حسن اس کے حسین چہرے پر جھلملاتا تھا اور خوب صورت اور ملیح چہرے پر کسی جھیل کے پانیوں کا عکس سوچوں کی روشن کرنوں سے چکا چوند کرتا۔

''تو میں آمنہ شاہ سے محبت کرنے لگا ہوں اور یہ محبت ہے۔''

میں نے بے حد حیران ہوکر سوچا تھا اور اس انکشاف نے مجھے ششدر کردیا۔

نہیں' بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ اور میں...... میری زندگی تو ہر لمحہ داؤ پر لگی ہے۔ صبح و شام دھمکیاں مار دینے کی' ختم کردینے کی اور نہیں' مجھے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں اپنے ساتھ اس کومل اور نازک سی لڑکی کو بھی کانٹوں پر گھسیٹوں۔ وہ جو حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔

جو اتنی نایاب اور انمول ہے کہ کسی بھی دل کی Entire desire ہوسکتی ہے اور مجھے تو ابھی بہت جنگ کرنا ہے اور اس جنگ میں کتنے زخم لگیں گے' کتنے کانٹے چبھیں گے' نہیں جانتا۔

تو نارسائی مقدر ٹھہری۔

مجھے لگا جیسے محبت کا پودا میرے دل میں اگا ہی تھا کہ اس پر نارسائی کی پت جھڑ اتر آئی تھی۔ ملن کے پھول نہ تھے۔ کیونکہ میرا سفر طویل بھی تھا اور خار دار بھی اور وہ نازک اور کومل تو میں اس محبت کی آگ کو پانی کے چھینٹے مار مار کر بجھانے لگا جو خود بخود ہی میرے اندر بھڑک اٹھی تھی۔

اور میں نے قلم اٹھالیا تھا اور بے دھڑک لکھ رہا تھا ان کے خلاف جو انسانوں کا خون چوسنے والے اور گوشت کھانے والے ویمپائیر تھے۔

جو چند سکوں کے عوض اپنے ایمان، ضمیر اور ملک کا سودا کر رہے تھے۔

جن کے اندر دھڑکتے دلوں میں سیاہیاں پیدا ہوگئی تھیں اور ان سیاہیوں نے ان کے چہرے مسخ کر دیئے تھے۔ میں لکھنے میں مگن تھا اور میں نے محبت کی طرف سے پیٹھ موڑ لی تھی۔

زندگی کے عجائب خانہ میں اترنا کوئی معمولی بات نہیں۔

کسی انجمن کی ہم رکابی کوئی عام بات نہیں لیکن میں نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور سوچا تھا محبت میرے دل سے رخصت ہوگئی لیکن وہ تو ایسے ہی میرے دل میں موجود تھی اور آمنہ شاہ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''سنو اسید عبدالرحمٰن! تم محبت سے کتنا بھی نظر چراؤ تم اس سے بچ نہیں سکتے۔ بولو کیا مجھے بھول سکو گے، کیا میرے بغیر زندگی گزار پاؤ گے؟''

میرے پاس اس کے خاموش سوالوں کا جواب نہیں تھا لیکن میں اپنے سفر پر چلتے ہوئے اس کی محبت کو دل سے نکالنے کی کوشش کرتا رہتا۔ یہ وہ پل صراط ہے جس پر مجھے اکیلے چلنا تھا۔

لیکن محبت بضد تھی کہ وہ بھی میرے ہمراہ رہے گی۔

اور میں عروج مصطفیٰ ہوں، آمنہ کی دوست اور ماموں زاد بہن، مجھے آمنہ سے ہمیشہ ہی محبت رہی ہے اور میں نے ہمیشہ اسے آئیڈیالائز کیا۔ شاید اس کی وجہ اس کی بے پناہ ذہانت ہے۔

اس کا رائٹر ہونا ہے۔

بہت کم عمری میں ہی اس نے خواتین کے پرچوں میں اپنا ایک مقام بنا لیا تھا۔

مجھے اس کی تحریر، اس کی کہانیاں بہت پسند تھیں۔ میں سوچتی تھی کاش میں بھی اس کی طرح لکھ سکوں۔ میری کہانیاں بھی خواتین کے پرچوں میں چھپیں اور لڑکیاں ان کے لیے تعریفی خط لکھیں لیکن میں یہ بھی جانتی تھی کہ شاید میں کبھی آمنہ جیسا نہ لکھ سکوں یا شاید کبھی لکھ ہی نہ سکوں جبکہ فاطمہ پھوپھو کہتی تھیں تم لکھ سکتی ہو، تمہارے اندر یہ صلاحیت ہے لیکن تم کوشش نہیں کرتی ہو۔

جب آمنہ لاہور آئی اور اس نے ''نوید سحر'' کو جوائن کیا تو میں بھی اس کے ساتھ جانے لگی۔ اسید نے میرے ذمہ خواتین کے صفحے کی ترتیب کا کام لگا دیا تھا۔ میں بس خواتین کے

صفحے کے لیے آنے والے اقتباسات شعر اور اقوال زریں ترتیب دیتی تھی۔ گو میرا اپنا تو لکھنے کا کوئی کام نہ تھا پھر بھی میں خوش تھی کہ میں ان لوگوں کے لیے کام کر رہی ہوں جو کچھ کرنے کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہ سب مخلص اور محب وطن لوگ تھے۔ ان کے ہاتھ میں قلم تھا، قلم جو ہاتھ میں ہو تو بولنے لگتا ہے، کبھی زخموں پر مرہم رکھتا ہے۔

کبھی زخموں کو کریدتا ہے اور گہرا کرتا ہے۔

کبھی گیت گاتا اور لوریاں سناتا ہے۔

کبھی سوئے ہوئے کو جگاتا ہے۔

کبھی یوں گرجتا ہے کہ آدمی سہم کر رہ جائے، دہل جائے۔

کبھی اتنا نرم و حساس کہ کسی بچے کی آنکھ میں آنسو دیکھ کر رو پڑے۔

کبھی اتنا سخت اور بے رحم کہ لاشوں کے انبار پر ہنسے۔

نیرو کی طرح بانسری بجائے۔

اور اس ساری فسوں کاری کا محرک وہ ہاتھ جس میں قلم ہے۔

وہ ہاتھ اگر معتبر ہے تو وہ قلم بھی معتبر ہے۔ محترم ہے۔

اصل میں قلم، قلم رکھنے والے کے ظرف کو آزماتا ہے، اسے پرکھتا ہے، جانچتا ہے پھر اس کی مرضی پر چلنے لگتا ہے۔

گویا وہ آئینہ ہے ایسا آئینہ جس میں ایک عکس چھلکتا ہے، ایک ہی شبیہہ اترتی ہے۔

قلم عکس ہے قلم رکھنے والے کا۔

کم ظرف ہاتھ میں قلم کم ظرف و بے وقعت ہو جاتا ہے اور باظرف ہاتھ میں معتبر و محترم، سو آدمی کو پہچاننا ہو تو اس کے قلم کو دیکھو، اس ہاتھ کو نہ دیکھو جس میں قلم ہے۔ سو قلم کی آبرو، ہاتھ کی آبرو اور ہاتھ والے کا وقار قلم کی آبرو، قلم تو بہت سے رکھتے ہیں، پر قلم کی آبرو کا پاس کسی کسی کو ہے۔ قلم کا حق کوئی کوئی ادا کرتا ہے۔ ان بہت سارے ہاتھوں میں میرے ان سب دوستوں کے ہاتھ بھی شامل ہیں جو قلم تھامے ہوئے ہیں۔ تھامے رکھنا چاہتے ہیں جیسے بہت سارے چراغ اندھیری رات میں روشن ہیں اور تاریکی سے نبرد آزما ہیں۔ شاید ان میں سے کچھ چراغ بجھ جائیں اور کچھ تندی باد مخالف میں بھی جلتے رہیں۔

قلم میرے ہاتھ میں بھی ہے، قلم آپ کے ہاتھ میں بھی ہے لیکن قلم کی آبرو کون برقرار رکھتا ہے اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ فی الحال تو آپ اس کہانی کو پڑھیے۔ یہ میری پہلی کہانی ہے۔ آمنہ شاہ کی کہانیاں پڑھ کر مجھے لکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا اور آج آمنہ شاہ اور اسید عبدالرحمٰن کی کہانی لکھتے ہوئے میرا خیال ہے کہ میں بھی لکھ سکتی ہوں۔

آپ کا کیا خیال ہے کہانی پڑھ کر مجھے ضرور بتائیے گا، میری کہانی کا نام ہے ''پل صراط''

میری بھینس کو ڈنڈا کیوں مارا؟
تیرے باپ کا وہ کیا کرتی تھی؟
وہ تو کھیت میں چارہ چرتی تھی
ہاں جی' کھیت میں چارہ چرتی تھی
سنو کھیت میں چارہ چرتی تھی

سعید ٹیبل پر پاؤں لٹکائے بیٹھا لہک لہک کر گا رہا تھا۔

''تم ڈاکٹر بننے کے بجائے سنگر کیوں نہیں بن جاتے' خدا کی قسم بہت کامیاب رہو گے۔''
فیصل نے جو اسید کے ایک آرٹیکل کی پروف ریڈنگ چیک کر رہا تھا سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''دراصل اسے خوف ہے کہ باقی سنگر اس کی سریلی آواز سن کر کہیں بھاگ ہی نہ جائیں۔''
حامد نے جو کچھ فاصلے پر کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا' مڑ کر سعید کی طرف دیکھا۔

''ویسے اس کا ٹیسٹ بھی بہت اعلا ہے نا عاشی!''
آمنہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونہ دانتوں تلے دبائے عاشی کو دیکھ رہی تھی۔

''اس میں کیا شک ہے ڈیر سسٹر!'' سعید ٹیبل سے نیچے اتر آیا۔

''ہائے داوے' تمہیں کیا آج کالج نہیں جانا تھا؟'' حامد نے پھر پوچھا۔

''جانا تو تھا بلکہ جا رہا ہوں' اس وقت تو عاشی کو چھوڑنے آیا تھا۔

''اچھا......'' آمنہ نے اچھا کو لمبا کیا اور معنی خیز نظروں سے عاشی کو دیکھا اور عاشی اس کے اس طرح دیکھنے سے یک دم سرخ پڑ گئی۔

''یہ عاشی کو ڈراپ کرنے اور پک کرنے کی ذمہ داری تم نے کیوں اٹھا رکھی ہے' یہ اسید کے ساتھ بھی تو آ سکتی ہے؟''

''دراصل......'' وہ دائیں کان کی لو مروڑنے لگا۔ ''اسید ہے سحر خیز اور یہ محترمہ اٹھتی ہیں دوپہر کو اور اسید ان کے اٹھنے کا انتظار نہیں کر سکتا۔''

''جھوٹ مت بولو' میں ساڑھے آٹھ تک اٹھ جاتی ہوں۔''

''اور ناشتا کرتے' تیار ہوتے نو بج جاتے ہیں۔'' سعید نے اس کی بات کاٹی۔ ''جبکہ اسید ساڑھے سات گھر سے نکل پڑتا ہے تو ان محترمہ نے مجھ سے دست بستہ عرض کی تھی۔ پلیز سعید! تم تو نو بجے جاتے ہو نا' مجھے بھی ڈراپ کر جایا کرو۔''
اس نے باریک آواز میں عاشی کی نقل اتاری۔

''کوئی بھی نہیں۔'' عاشی جھینپ گئی۔

''ویسے یہ سب لوگ تو کوئی کام کرنے آتے ہیں۔ تم کس لیے آتی ہو؟ کیا دل بہلانے۔''
وہ شرارت سے عاشی کو دیکھ رہا تھا۔

''تمہیں کیا؟'' عاشی چڑ گئی۔ ''تم بہلاؤ اپنی ''فل فلوٹی'' کا دل۔''

''میری فل فلوٹی۔'' اس نے دل پر ہاتھ رکھا۔ ''ہائے سوئٹی فل فلوٹی کہاں تھی وہ۔ قریب جا کر جو دیکھا تو کھلکھلا رہی تھی۔''
فیصل بے اختیار ہنسا۔

''تمہیں بھینسوں سے بہت دلچسپی ہے سعید! تم ایسا کیوں نہیں کرتے کہ ڈاکٹری چھوڑ کر گوالے بن جاؤ۔ ایمان سے دودھ تو خالص ملے گا۔ ورنہ دودھ کے نام پر جو محلول آج کل مل رہا ہے نا وہ ضرور کسی موذی مرض میں مبتلا کر دے گا۔''
آمنہ نے قلم ٹیبل پر رکھ کر بظاہر سنجیدگی سے کہا لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

''ہائے بہنا! کیا بتاؤں کتنی حسین لگتی ہیں یہ مجھے' سیاہ آبنوسی رنگت یہ مڑے ہوئے سینگ' ان کے حسن کا کیا کہنا اور پھر چال کا بانکپن' آپ کو کیا پتا۔ بالے گجر کی کتنی ہی بھینسوں میں دل اٹکا ہوا ہے میرا۔ دل چاہتا ہے اغواء کر لوں۔ دودھ تو خالص ملے گا۔'' آخری بات اس نے آہستگی سے کہی تھی۔ سب ہی ہنس رہے تھے اور عاشی سرخ چہرے کے ساتھ اسے گھور رہی تھی۔

''تمہیں تو ''بھینسوں'' کی سوسائٹی کی طرف سے ایوارڈ ملنا چاہیے۔''

تب ہی دروازہ ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا تھا۔ پیشانی پر لکیریں ڈالے ایک شخص اندر داخل ہوا۔ سب خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''فرمایئے۔'' سب سے پہلے حامد کو ہی خیال آیا تھا۔

''کس سے ملنا ہے آپ کو۔''

''وہ کہاں ہے تمہارا بڑا اسید عبدالرحمٰن۔''
اس نے کھوجتی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور اس ہال کمرے کے دائیں طرف والے کمرے پر چیف ایڈیٹر کی تختی دیکھ کر اس کی طرف بڑھا۔

''وہ ابھی نہیں آئے' آپ کو کیا کام ہے ان سے؟'' سعید بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''کام!'' وہ عجیب طرح سے ہنسا اور اپنا دایاں ہاتھ تنبیہہ والے انداز میں اوپر اٹھایا' دائیں ہاتھ کی تین انگلیوں میں موٹی موٹی انگوٹھیاں تھیں جن میں مختلف رنگوں کے پتھر جڑے تھے۔

''اس سے کہہ دینا کہ یہ جو بکواس وہ آج کل لکھ رہا ہے نا اپنے اخبار میں اسے بند کر دے ورنہ......''

''ورنہ کیا ہوگا؟''
اب حامد اپنی جگہ کھڑا ہو گیا تھا اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''ورنہ......''اس نے چٹکی بجائی۔''یوں ہوگا...... یوں لاش بھی نہیں ملے گی اس کی۔''

وہ پھر اسی طرح سے ہنسا تھا۔عجیب سی سنسنی پیدا کرتی ہوئی ہنسی۔عروج نے گھبرا کر آمنہ کی طرف دیکھا جو ساکت بیٹھی تھی۔

''تم وہی ہونا ایک وزیر کے کارندے' ایک بار اسپتال میں میری ڈیوٹی لگی ہوئی تھی اور وہ وہاں وی آئی پی روم میں داخل تھے اور تم ان کے پاس تھے۔''

لمحہ بھر کو وہ شخص خاموش ہو گیا اور پھر ایک استہزائیہ سی نظر اس پر ڈالی۔

''ڈاکٹر! تم اپنے کام سے کام رکھو' تمہیں کیا کہ میں کون ہوں اور کس کے ساتھ ہوں اور......''

وہ حامد کی طرف مڑا۔

''کہہ دینا اس سے کہ زیادہ ہاتھ پاؤں نہ پھیلائے ورنہ ہم ہاتھ باندھنا بھی جانتے ہیں اور توڑنا بھی اور تمہارے جیسے احمقوں کا یہ ٹولہ کسی کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

پھر سب کو باری باری دیکھتا ہوا وہ جس طرح آیا تھا اسی طرح باہر نکل گیا۔

''یہ...... یہ کیا تھا سعید؟''عاشی اس کے جاتے ہی اٹھ کر سعید کے پاس آ گئی۔''یہ شخص اس طرح کیوں دھمکیاں دے رہا تھا؟''

''کچھ نہیں' اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔''

اس نے ایک تسلی آمیز نظر عاشی پر ڈالی۔

ویسے آج کل وہ این جی اوز پر کام کر رہا تھا۔وہ نام نہاد این جی اوز جو عورت کو حقوق دلانے کے نام پر حکومت اور دوسرے اداروں سے لاکھوں روپے کھا رہی ہیں۔

اور وہ این جی اوز جو دیہی علاقوں کی بھلائی کے نام پر وہاں بے ہودہ لٹریچر تقسیم کر کے گمراہی کو فروغ دے رہی ہیں۔

اور وہ این جی اوز جن کے کرتا دھرتا یہودی اور مسلمان دشمن لوگ ہیں جن کا مقصد اسلام کے متعلق غلط نظریات پھیلانا اور لوگوں کو اسلام سے متنفر کرنا ہے۔''

صدف نے جو اب تک خاموش بیٹھی تھی' تفصیل سے بتایا۔

''ویسے اس وقت اسید ہے کہاں؟ وہ تو ہم سب سے پہلے یہاں موجود ہوتا تھا۔''

آمنہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔اس کے چہرے پر بکھری پریشانی کو سب نے ہی نوٹ کیا۔

''وہ کسی ڈاکٹر فہد علی سے ملنے گیا ہے۔ناشتہ کرتے ہی نکل گیا تھا۔''

''یہ ڈاکٹر فہد کون ہے؟''

آمنہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''معلوم نہیں۔''سعید نے کاندھے اچکائے۔''صبح وہ دادا جان کو بتا رہا تھا کہ میں ڈاکٹر فہد کی طرف جا رہا ہوں تو میں نے سنا۔''

''ڈاکٹر فہد دراصل ایک این جی او میں چار سال تک جاب کرتے رہے ہیں۔سو درون خانہ کئی رازوں سے واقف ہیں۔انہوں نے پہلا آرٹیکل چھپنے کے بعد خود ہی فون کیا تھا اسید کو اور بتایا تھا کہ وہ بہت کچھ جانتے ہیں اور لکھنا چاہتے ہیں ان کے متعلق کہ ان این جی اوز کی حقیقت کیا ہے؟''

صدف نے پھر تفصیل بتائی' تب ہی ایک کمرے سے کیمرہ کندھے پر لٹکائے دلیر خان نکلا۔دلیر خان بیس بائیس سال کا ایک گاؤں ڈمہ ڈولا سے تھا۔سب ہی اس سے پیار کرتے تھے۔اگرچہ اسے یہاں جوائن کیے چند ماہ ہی ہوئے تھے' ابھی پچھلے دنوں ایک عمارت میں جو آگ لگی تھی تو وہ تصویریں بنانے کے چکر میں عمارت میں بہت آگے تک چلا گیا تھا جس پر اسید نے اسے ڈانٹا بھی تھا کہ تصویروں سے زیادہ تمہاری زندگی ہمارے لیے اہم ہے دلیر!''

''فرض کے سامنے زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی سر! فرض کے لیے جان بھی قربان کی جا سکتی ہے۔''

اسے باہر آتے دیکھ کر حامد بھی اپنا بیگ کندھے پر لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

''او کے تو پھر ہم چلتے ہیں۔''

''تم لوگ کہاں جا رہے ہو بھئی؟''

''ایک تقریب کی کوریج کرنی ہے۔''

''کوئی سیاسی تقریب؟''فیصل نے پوچھا۔

''ملی جلی۔''

''او کے۔زندگی ہوئی تو پھر ملیں گے' اللہ حافظ۔''فیصل نے اپنا مخصوص جملہ دہرایا۔

اس کی عادت تھی کہ جب کوئی باہر جاتا یا خود اسے کہیں جانا ہوتا تو یہ جملہ ضرور کہتا۔

''گھر سے باہر جانے والا شخص یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ واپس آئے گا یا کسی دھماکے کا شکار ہو جائے گا یا غائب کر دیا جائے گا۔''

''اور تم...... کیا تمہیں کالج نہیں جانا؟''

صدف نے پوچھا تو سعید نے جو فیصل کے کہے گئے جملے پر غور کر رہا تھا چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں میرا موڈ نہیں ہے۔''

''یہ تمہارا فائنل ایئر ہے سعید اور تمہیں یوں لاپروائی نہیں کرنی چاہیے۔''صدف نے بڑی بہنوں کی طرح نصیحت کی۔

"تم لوگوں کو دیکھ دیکھ کر میرا جی چاہنے لگا ہے کہ میں بھی تمہاری فیلڈ میں آجاؤں۔" وہ بے حد سنجیدہ لگ رہا تھا۔

"ہمیں، ہمارے ملک کو اچھے صحافیوں کی ہی نہیں اچھے ڈاکٹروں کی بھی ضرورت ہے۔"

"ایک بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک وزیر کا بھلا این جی اوز سے کیا تعلق اور یہ شخص جو بھی دھمکی دینے آیا تھا یہ......"

عاشی نے جو ابھی تک کھڑی تھی، کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا۔

"بڑی جلدی خیال آگیا ہے صدف!" سعید تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔ "دراصل یہ جو وزیر صاحب ہیں نا، ان این جی اوز والوں نے ان کی بھینسیں چرالی تھی۔"

"خبردار، جواب تم نے بھینس کا نام لیا۔" عاشی نے اس کے بازو پر مکا مارا۔

"ویسے یہ ڈاکٹر فہد رہتا کہاں ہے؟" آمنہ نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" سعید نے کندھے اچکائے۔

"تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا نا جبکہ اسید کو ایک بار بقول تمہارے ہی گاڑی سے کچلنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔"

"ریلیکس آمنہ! کچھ نہیں ہوتا، آجائے گا ابھی۔" صدف نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

"چلو دیکھیں ذرا، صفدر صاحب نے "سرخیاں" بنالیں۔ اسید نے کہا تھا نا ایک نظر دیکھ لینا۔"

تب ہی سعید کے سیل کی بپ ہوئی، اس نے پاکٹ سے فون نکال کر دیکھا اور ماتھے پر ہاتھ مارا۔

"اوہ...... میں تو بھول ہی گیا تھا۔ آج تو نورین نے ہم سب فرینڈز کو ٹریٹ دینا تھی اپنی برتھ ڈے کی، اسی کی مس کال ہے۔ او کے میں چلا۔"

"تحفے میں بھینس دے دینا۔"

عاشی نے پیچھے سے آواز دی تو دروازہ کھولتے ہوئے اس نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"تمہارا مشورہ اچھا ہے لیکن میرے جیسا غریب اسٹوڈنٹ بھینس کی تصویر دے سکتا ہے بھینس نہیں اور ہاں۔" اس نے انگلی اٹھائی۔ "اب تم نے بھینس کا ذکر کیا ہے میں نے نہیں۔"

اور عاشی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی تیزی سے باہر نکل گیا اور اس کے جانے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہوگئے تھے۔ اندر دوسرے ہال میں بھی اخبار سے متعلق لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے لیکن آمنہ قلم ہاتھ میں تھامے خالی الذہن سی بیٹھی تھی۔

یہ اسید نے کس خارزار میں قدم رکھ دیا ہے۔

گو ایک بے باک صحافی کی حیثیت سے اس نے اپنی پہچان کروالی تھی اور ان چند ماہ میں اخبار کی سرکولیشن مزید بڑھی تھی۔ کئی بڑے اخباروں میں تبصرہ کیا گیا تھا کہ "صبحِ نو" کے بند ہو جانے سے جو خلا ہوگیا تھا "نوید سحر" نے اس کی کمی کی بہت حد تک پوری کردی ہے۔

پھر بھی یہ ہر لمحہ خوف کی زندگی۔

کتنی دھمکیاں دی جاتی تھیں اسید کو۔

بھلا زندگی کو یوں داؤ پر لگانا عقل مندی تو نہیں ہے نا، اب جو اسید نے منشیات اور بھکاریوں پر لکھا تو کیا یہ سب ختم ہوگیا؟ یا اب یہ این جی اوز ختم ہو جائیں گی یا اس سے پہلے جو کالے جادو کرنے والوں کے خلاف اتنے آرٹیکل اتنے انٹرویو چھپے۔ اتنے لوگوں نے اظہار خیال کیا تو یہ لوگ کام چھوڑ کر چلے گئے کہیں؟ ان کا کاروبار تو پہلے سے بھی زیادہ چمک رہا ہے اور ہر اخبار میں کیبل پر، دیواروں پر ان کے اشتہارات کی بھرمار ہے۔ میں کہوں گی اسید کہ چھوڑ دے سب۔ کیا ضرورت ہے خوامخواہ مصیبتیں مول لینے کی۔ جب زندگی سیدھے سادے راستے پر چلتے ہوئے سکون سے گزر سکتی ہے تو پھر کیوں آدمی ٹیڑھے راستے اپنائے۔ وہ تو اپنے افسانوں کے کرداروں جیسی زندگی گزارنا چاہتی تھی۔

سبک رو ندی کی طرح۔

دھیرے دھیرے بہتی زندگی۔

جس میں محبت اور خوشی کے رنگوں کی ہلچل ہو اور بس......

اس نے یہ سب سوچا تو تھا لیکن جب اسید آفس آیا تو اس سے ایک لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ بہت پُرجوش تھا۔

"ڈاکٹر فہد نے جو انکشافات کیے ہیں، وہ بہت حیران کن ہیں۔ تم تصور بھی نہیں کرسکتیں صدف! کہ ان این جی اوز کے پوشیدہ مقاصد کیا ہیں؟ یہ یہاں ہمارے ملک میں کیا انقلاب لانا چاہ رہے ہیں۔"

اس نے مختصراً فہد سے معلوم ہو جانے والی باتیں بتائی تھیں۔ وہ سب خاموشی سے اس کی بات سنتے رہے تھے اور جب اس نے بات مکمل کرلی تو فیصل نے اسے آفس میں آنے والے شخص اور اس دھمکی کے متعلق بتایا جو وہ دے گیا تھا۔

"ہوں۔" اسید نے سر ہلایا۔ "ایسی دھمکیاں تو بہت دنوں سے مل رہی ہیں۔ میں نے جب اس خارزار میں قدم رکھا تھا تو میں جانتا تھا کہ یہ آسان نہیں ہے، جان بھی جاسکتی ہے۔ مگر مجھے یہ سب کرنا ہے کہ میں نے اس کا عہد کیا ہے احمر سے اور آفتاب حسین سے کہ میں اپنی آخری سانس تک برائیوں کے خلاف جہاد جاری رکھوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔"

"ہم سب تمہارے ساتھ ہیں اسید!" صدف نے فوراً کہا۔

"تم سب!" اسید نے باری باری سب کی طرف دیکھا۔
"فیصل! آمنہ عاشی، عروج! تم سب چاہو تو کہیں کسی اور اچھے اخبار میں جاب کر سکتے ہو۔ حامد اور دلیر کو بھی میرا پیغام دے دینا۔ حامد کے سیاسی تبصرے اتنے زبردست ہوتے ہیں کہ کوئی بھی اخبار اسے بخوشی قبول کر لے گا۔ فیصل کے فیچر صدف اور آمنہ کے سروے تم سب کا اتنا نام ہو چکا ہے کہ کہیں بھی تمہیں اچھی جاب مل سکتی ہے اور آمنہ کا تو خیر پہلے ہی ایک مقام ہے، ایک نام ہے ادب کی دنیا میں۔"
"تم کیا سمجھتے ہو اسید عبدالرحمٰن! کہ صرف تم ہی ایک سچے اور بے باک صحافی ہو اور ہم سب قلم کی حرمت بیچنے والے۔"
آمنہ کو نہ جانے کیوں غصہ آ گیا تھا۔
"ہم اگر بزدل ہوتے تو اسی روز تمہارا ساتھ چھوڑ جاتے جب تم نے یہاں اسی کمرے میں ہم سے کہا تھا کہ اب تم وہ لکھو گے جس کے لیے ہم نے یہ اخبار شروع کیا تھا، تمہیں شاید یاد نہ ہو لیکن تم نے بہت اچھی طرح سے ہر بات ہر خطرے اور ہر مشکل کی وضاحت کر دی تھی۔"
اسید کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی، وہ بہت دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"آئی ایم سوری آمنہ! شاید تم میری باتوں سے ہرٹ ہوئی ہو۔ لیکن میرا فرض بنتا ہے کہ میں تمہیں وہ سب بتا دوں جو تم نہیں جانتے۔ مجھے خود اندازہ نہیں تھا کہ یہ اتنا مشکل کام ہو گا اور اس طرح قدم قدم پر مجھے روکا جائے گا اور مجھے دھمکیاں دی جائیں گی۔ کبھی قتل کی دھمکی، کبھی اخبار کا ڈیکلریشن ضبط کروانے کی دھمکی اور کبھی پیسے سے خریدنے کی کوشش۔ میں سچ مچ نہیں چاہتا کہ تم لوگ کسی مشکل میں پڑو۔"
"تو تم یہ سب چھوڑ کیوں نہیں دیتے اسید!" عاشی نے احمقوں کی طرح کہا۔ "کیا صرف ہماری زندگیاں قیمتی ہیں تمہاری زندگی قیمتی نہیں۔"
"اوہ عاشی! کیا سعید نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ دادی جان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ تمہیں بلا رہی تھیں۔"
اسید کو اب یاد آیا تھا کہ عاشی کو تو آج گھر ہونا چاہیے تھا۔
"نہیں تو۔" عاشی نے انکار کیا۔ "وہ ہے ہی بھلکڑ۔ پتا نہیں میڈیکل کی اتنی بڑی بڑی کتابیں کیسے رٹ لیتا ہے۔ خیر میں ابھی چلی جاتی ہوں۔"
"اب کیسے جاؤ گی اکیلی، میرے ساتھ ہی چلنا۔"
"اچھا!" عاشی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ موضوع بدل گیا تھا۔
"مجھے آج جلدی جانا ہے۔" آمنہ کھڑی ہو گئی۔ "میں اسے ڈراپ کرتی جاؤں گی۔"
"ناراض ہو کر جا رہی ہو؟" اسید بے اختیار پوچھ بیٹھا۔

"نہیں، آج ماما کے ساتھ جانا تھا کہیں۔" آمنہ کی آنکھوں میں یک دم روشنی سی کوندی تھی تو اسے، اسید عبدالرحمٰن کو اس کا احساس ہے۔
"تھینکس۔" اسید اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔
اور آمنہ، عروج اور عاشی باہر نکل گئیں۔

☆☆☆

"کچھ محبتیں آہستہ آہستہ سرائیت کر جاتی ہیں اور کچھ محبتیں بند دروازے کھول کر زبردستی دل میں گھس کر بیٹھ جاتی ہیں۔ پلک جھپکتے میں جب احساس ہوتا ہے کہ ایسا ہو گیا ہے تب تک دل اور روح کے تمام خلا پُر ہو چکے ہوتے ہیں لیکن خالی خولی محبت دل میں اتر آنے سے بھی کہیں زندگی سہل ہوئی ہے۔"
"یہ حقیقت ہے یا افسانہ؟" عروج نے آمنہ کے کندھے پر سے جھکتے ہوئے پڑھا۔
"افسانے بھی تو حقیقتوں سے جنم لیتے ہیں نا عروج!" آمنہ نے فائل بند کر دی تو عروج اس کی کرسی کی پشت سے ہٹ کر اس کے سامنے پڑی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔
"بہت دنوں سے تمہارا کوئی نیا افسانہ نہیں آیا۔ کیا یہ کوئی نیا افسانہ لکھ رہی ہو۔"
"نہیں۔" آمنہ مسکرائی۔ "بس یونہی قلم چلا رہی تھی۔"
"تمہاری قارئین تمہیں مس کر رہی ہیں، کب لکھ رہی ہو نیا افسانہ؟"
"پتا نہیں۔" آمنہ نے پیشانی پر آ جانے والے بالوں کو پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ "آج کل تو زندگی میرا افسانہ لکھ رہی ہے پتا نہیں اس کا اینڈ ٹریجک ہو گا یا خوش گوار۔"
"آمنہ! ایک بات پوچھوں۔" عروج نے بغور اسے دیکھا۔
"پوچھو۔" آمنہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"تم..... تم اسید عبدالرحمٰن سے محبت کرتی ہو؟" ایک لمحہ کو آمنہ چپ سی اسے دیکھتی رہی۔
"ہاں شاید۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔
"اسے شاید محبت ہی کہتے ہیں۔"
وہ ہولے سے ہنسی۔
"اپنے ڈھیروں ڈھیر افسانوں میں محبت کا ذکر کرنے کے باوجود مجھے لگتا ہے جیسے میں محبت کو صحیح طرح سے نہیں سمجھ سکتی۔ پتا نہیں یہ محبت ہے، انسیت ہے، لگاؤ ہے، احترام ہے یا کیا؟ لیکن عروج مصطفیٰ میں اس شخص اسید عبدالرحمٰن کو بہت سوچتی ہوں۔ جب میں نے اسے دیکھا نہیں تھا، تب بھی کئی بار خیالوں میں اس کا پیکر تراشا تھا۔ اس کے کالم اور آرٹیکل پڑھ کر۔"
وہ سانس لینے کو ذرا سا رکی۔
"ایک ناراض، خفا خفا سا شخص۔ اپنے علاوہ تمام لوگوں کے لیے مخلص۔ اپنے وطن سے

جنون کی حد تک محبت کرنے والا اور پتا ہے عروج! جب پہلی بار میں نے اسے آفتاب حسین کے گھر نایاب کی تصویر کے سامنے کھڑے دیکھا تو وہ مجھے ایسا ہی لگا۔ اس وقت اس کی آنکھیں نم تھیں اور وہ پتا نہیں اس سے کیا کہہ رہا تھا لیکن وہ مجھے ایسا ہی لگا تھا جیسے میرے خیالوں نے اسے تراشا تھا۔''

''تم اس سے محبت کرتی ہو آمنہ! اور یہ میں نے پہلے دن ہی جان لیا تھا جب یہاں آفس میں پہلی بار میں تمہارے ساتھ آئی تھی اور تم نے مجھے اس سے متعارف کرایا تھا۔''

عروج نے پورے یقین سے کہا تو آمنہ ایک بار پھر مسکرا دی۔

''حیرت ہے عروج! وہ بات جسے جاننے میں مجھے اتنا عرصہ لگا بلکہ اب بھی میں کبھی کبھی تذبذب میں پڑ جاتی ہوں کہ کیا یہ محبت ہے۔ یہ جذبہ جو ہولے ہولے دل میں چٹکیاں لیتا ہے اور سارے وجود میں عجیب انوکھی سی سنسنی پیدا کرتی خوشی بن کر بکھر جاتا ہے' کیا واقعی محبت ہے۔ تم نے اسے لمحوں میں جان لیا۔ کہیں تمہارا دل تو محبت آشنا نہیں۔''

''نہیں جناب! تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔''

اور دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے اسید عبدالرحمٰن نے ایک گہری سانس لے کر ہاتھ ناب سے اٹھا لیا اور کلپ بورڈ اٹھائے واپس اپنے آفس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ نہ جانے آمنہ سے کس بات پر ڈسکس کرنے آیا تھا کہ عروج کی زبان سے اپنا نام سن کر ٹھٹک گیا۔

''تو......؟'' اپنے آفس میں آکر کرسی پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا۔

''تو آمنہ شاہ......''

کئی بار اسے گمان تو گزرا تھا لیکن اس نے ہمیشہ ہی اپنے گمان کو جھٹلایا تھا۔ نہیں' بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے اور اب عروج مصطفیٰ کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتی ہے اور خود آمنہ......!''

اس نے یونہی بے مقصد ٹیبل پر پڑے کاغذات کو اِدھر اُدھر کیا۔

''اور تم اسید عبدالرحمٰن کیا تم بھی؟''

اندر دل میں کہیں چراغاں سا ہوا۔

وہ بھی تو اسے دیکھ کر دل کی ایک دھڑکن مس کر بیٹھا تھا۔ لیکن دل میں یک دم چراغاں نہیں ہوا تھا بلکہ آہستہ آہستہ ایک احساس دل میں سرایت کرتا گیا تھا جسے شاید محبت کا نام دیا جا سکتا ہو۔ یہ احساس آمنہ کی موجودگی میں اندر کہیں پھول کھلائے رکھتا تھا اور جس روز آمنہ غیر حاضر ہوئی تو جیسے......

''اوہ نہیں!'' سر کو جھٹکا۔ ''میں جس راہ پر قدم رکھ چکا ہوں وہاں محبت کو ہم قدم لے کر نہیں چلا جا سکتا اسید عبدالرحمٰن!''

اس نے میز پر پڑی فائل اٹھالی اور آمنہ کے سامنے بیٹھی عروج' آمنہ کی آنکھوں میں محبت کے رنگ دیکھ کر پوچھ رہی تھی۔

''کیا اسید عبدالرحمٰن بھی تم سے محبت کرتا ہے؟''

''پتا نہیں۔'' آمنہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ ایسا شخص ہے کہ محبت اس کے قریب سے ہو کر چلی جائے تو اسے پتا نہ چلے۔''

وہ ہولے سے ہنسی۔

''اسے اپنے کام کے سوا کچھ نہیں سوجھتا۔ لگتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر رکھ دیا ہے۔''

''خیر اتنا مبالغہ تو نہ کرو آمنہ! اگر اس کے سینے میں پتھر ہوتا تو وہ اس اجنبی لڑکی عافیہ سلیمان کے لیے یوں سرگرداں نہ ہوتا۔ یوں انصاف کا ہر دروازہ نہ کھٹکھٹاتا۔''

''پتا نہیں عافیہ سلیمان کہاں کھو گئی زمین نگل گئی اسے یا آسمان۔''

''ہاں لیکن اس کی ماں کو یقین ہے کہ اسے اس این جی او نے غائب کیا ہے جہاں وہ جاب کرتی تھی۔''

آمنہ نے کرسی سے اٹھ کر دراز کھولی اور دراز سے کوئی فائل نکال کر واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے عروج کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''تمہیں پتا ہے عروج! ڈاکٹر فہد نے اسید کو بتایا تھا کہ اس نے عافیہ سلیمان کو نہ جانے کتنی ہی بار اس این جی او میں دیکھا تھا بلکہ اس کی عافیہ سے بات چیت بھی ہوتی رہتی تھی۔''

''ڈاکٹر فہد کیا اسی این جی او میں جاب کرتا تھا؟''

عروج نے پوچھا۔

''ہاں......اور اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ جس رات اس کی ماں اس کے گھر نہ آنے پر اس کا پتا معلوم کرنے پریشان ہو کر این جی او کے آفس گئی تھی' اس روز بھی عافیہ سلیمان آفس آئی تھی لیکن وہ لوگ سرے سے مکر ہی گئے کہ وہ آئی تھی۔''

''پھر وہ کہاں گئی؟'' عروج کو حیرت ہو رہی تھی۔

''معلوم نہیں لیکن عروج! یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ بے چاری لڑکیاں جو اپنے گھر والوں کو بہتر مستقبل دینے اور ان کی آسائش کے لیے گھروں سے نکلتی ہیں' زیادہ تنخواہوں کی لالچ میں ان این جی اوز کے چکروں میں پھنس جاتی ہیں۔''

آمنہ نے تفصیل بتائی۔

''یہ عافیہ بھی اسی لالچ میں اس این جی او میں آئی تھی۔ اس کی ایجوکیشن صرف ایف اے تھی۔ باپ کی وفات کے بعد اس نے محلے کے کسی پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی تھی۔

جہاں اسے صرف پندرہ سو ملتے تھے پھر وہاں ہی کسی نے اس سے ''مددگار'' نام کی اس این جی او کا ذکر کیا تھا اور پتا ہے اس کی ماں نے بتایا ہے کہ یہ لوگ اسے دس ہزار تنخواہ دے رہے تھے۔''

''اور انہوں نے اسے غائب کیوں کر دیا؟'' عروج نے حیرت سے پوچھا۔

''میں کیا کہہ سکتی ہوں عروج! ان کا مقصد کیا تھا۔ ڈاکٹر فہد نے بتایا تو ہے کہ وہ لوگ بہت مذموم مقاصد رکھتے تھے' گو اس نے ابھی تفصیل نہیں بتائی۔ تاہم وہ سب کچھ لکھ رہا ہے جلد ہی اسید کو اپنی رپورٹ دے گا۔''

''لیکن آمنہ!'' عروج نے جرح کی۔ ''اتنے سارے لوگ مختلف این جی اوز میں کام کر رہے ہیں۔ سنا ہے ان کی تنخواہیں بہت اچھی ہیں اور یہ این جی اوز بہت کام کر رہی ہیں تو کیا سب این جی اوز کے پس پردہ اور مقاصد ہیں؟''

''یار! میں کیا کہہ سکتی ہوں؟'' آمنہ ہنستے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ ''کیا خبر کچھ این جی اوز واقعی کوئی بہتر اور رفاحی کام کر رہی ہوں۔ یہ اسید اور حامد اس پر کام تو کر رہے ہیں۔ مضمون چھپیں گے تو پڑھ لیں گے۔''

''تو کیا اسید اب بھی مضمون لکھے گا آمنہ! جبکہ وہ شخص اس روز اتنی دھمکیاں دے کر گیا ہے۔'' عروج نے حیرت سے پوچھا۔

''وہ اسید ہے عروج!'' آمنہ کے لہجے میں خود بخود ہی ایک فخر سا شامل ہوگیا۔'' وہ ایسی دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں۔''

''ماما کہتی ہیں آفتاب حسین کہتے تھے اسید عبدالرحمٰن روشنی کا مینار ہے۔''

اور ایک بار پھر دروازے کی ناب پر ہاتھ رکھے رکھے اسید عبدالرحمٰن ٹھٹک کر رہ گیا۔

''اور کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی کو اتنی بلندیوں پر بٹھا دیتا ہے کہ پھر خود کو ان بلندیوں کا اہل ثابت کرنے کی کوشش میں آدمی ہانپ ہانپ جاتا ہے۔''

ابھی کچھ دیر پہلے وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس آرٹیکل کو نہ چھپوائے جسے کل رات اس نے لکھا تھا اور اس میں عافیہ سلیمان کی پوری اسٹوری تھی اور ارباب اقتدار سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ بیوہ ماں کی اس بیٹی کو اس نام نہاد این جی او کے پنجے سے رہائی دلوائے۔ اس سے قبل اس سلسلے کے اس کے تین آرٹیکل چھپ چکے تھے اور حامد کا ایک سروے ان این جی اوز کے متعلق چھپ چکا تھا جو صرف یہاں لاہور میں کام کر رہی تھیں۔ ابھی اس سلسلے میں اس کا ارادہ مزید سروے کرنے کا بھی تھا۔ وہ ان کے اصل مقاصد کی کھوج میں بھی تھا لیکن مسلسل دھمکی آمیز فون آ رہے تھے کہ وہ اس سلسلے کو ختم کر دے ورنہ نقصان اٹھائے گا۔

ابھی کچھ دیر پہلے اپنے آفس میں اس نے ایک بے حد ذمہ دار حکومتی افسر کا فون ریسیو کیا تھا کہ اگر اس نے مضامین چھاپنے کا یہ سلسلہ بند نہ کیا تو اس کے اخبار کا ڈیکلریشن ضبط کر لیا

جائے گا۔ تب اس نے سوچا تھا کیا فائدہ اگر یہ مضمون چھپ بھی گئے تو کیا ہوگا۔ کون سا یہ این جی اوز ختم ہو جائیں گی اور کون سا لڑکیاں ان میں جاب کرنا چھوڑ دیں گی' یہاں جاب کرنے والی اسی فیصد لڑکیاں اخبار کہاں پڑھتی ہیں تو خواہ مخواہ ڈیکلریشن ضبط کیوں کرواؤں۔ فرائیڈے ایڈیشن کے لیے کوئی اور ٹاپک دیکھ لیتا ہوں۔ لیکن اب ہینڈل پر ہاتھ رکھے رکھے اسے لگا تھا جیسے اس کے کندھوں پر کوئی بھاری سا بوجھ آ پڑا ہو اور اسے کسی کی توقعات پر پورا اترنا ہے۔ وہ تو اندھیروں کا حصہ بننے جا رہا تھا اور آمنہ شاہ کہہ رہی تھی وہ روشنی کا مینار ہے احمر اور آفتاب حسین یکا یک ہی اس کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

''اسید! ہمت نہ ہارنا۔ جو لوگ ہمت نہیں ہارتے ایک وقت آتا ہے کہ راستے خود بخود ان کے لیے کشادہ ہو جاتے ہیں اور منزلیں بازو وا کیے انہیں اپنی منتظر ملتی ہیں۔''

''تو یہ طے ہوا کہ فرائیڈے ایڈیشن میں یہ آرٹیکل چھپے گا' اب چاہے ڈیکلریشن ضبط ہو یا۔''

اس نے دروازے کو ہلکا سا دھکا دیا اور اجازت طلب کرتے ہوئے اندر آ گیا۔ آمنہ فائل ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی اور عروج کرسی پر بیٹھی اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''کیا ہو رہا ہے گرلز؟'' وہ مسکرایا۔

''اسید! میں آپ کی طرف ہی آ رہی تھی۔ یہ میں نے اسپتالوں کی حالت زار پر رپورٹ تیار کی ہے۔ میں اور صدف پچھلے دو ہفتوں سے مختلف اسپتالوں کے چکر لگا رہے تھے۔''

اسید نے فائل لے لی۔

''اوکے میں دیکھ لیتا ہوں۔'' اس نے کمرے میں نظر دوڑائی۔

''آج صدف نہیں آئی۔''

''ہاں' پتا نہیں کیوں؟'' عروج نے جواب دیا۔

''طبیعت خراب تھی اس کی۔'' آمنہ نے جواب دیا۔

''ٹمپریچر ہو رہا تھا۔'' اسید نے سر ہلا دیا۔

''عاشی کیسی ہے' آ نہیں رہی؟'' آمنہ نے پوچھا۔ اسید ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا اور فائل کی ورق گردانی کر رہا تھا۔

''ٹھیک ہے' دراصل دادی جان کی طبیعت بگڑتی ہی جا رہی ہے۔ ٹمپریچر کم ہی نہیں ہو رہا' اس پر چیسٹ انفیکشن شدید ہے' سو عاشی ادھر ہی ہے۔''

''میں آج چلوں گی دادی جان کو دیکھنے' عروج! تم چلو گی میرے ساتھ۔''

آمنہ' عروج سے پوچھ رہی تھی جبکہ فائل میں موجود پیپر دیکھتے ہوئے اسید کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ ابھری تھی۔

"یہ غالباً تم نے لکھا ہے آمنہ!"

جب بھی روانی میں وہ آمنہ کو تم کہہ کر بلاتا تھا' آمنہ کو بہت اچھا لگتا تھا۔

"ہاں' ایکچوئلی صدف کی طبیعت ٹھیک نہ تھی تو اس نے مجھے لکھنے کو کہہ دیا۔"

"ہاں تمہارا افسانوی رنگ جھلک رہا ہے اس میں اور یہ رپورٹ کے بجائے ایک درد بھرا افسانہ لگ رہا ہے۔"

"سوری' یہ فائل مجھے دے دیں' میں دوبارہ لکھتی ہوں۔"

"فی الحال رہنے دو' میں فالتو جملوں کو انڈر لائن کر دیتا ہوں۔ تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ کیسے لکھنا ہے۔"

آمنہ نے سر ہلا دیا۔ اس کا دل کسی انوکھی لے پر دھڑک رہا تھا۔ آج سے پہلے اسید نے کبھی اس طرح اتنی بے تکلفی سے بات نہیں کی تھی۔ تو کیا محبت کی آنچ نے اس کے دل کو بھی پگھلا دیا ہے۔ اس نے سوچا۔ ابھی کچھ دیر پہلے عروج نے ہی تو کہا تھا کہ محبت کی آنچ تو پتھر سے پتھر دل کو بھی پگھلا دیتی ہے اور اسید اتنا پتھر بھی نہیں کہ اسے آمنہ شاہ کی آنکھوں میں کھلتے محبت کے پھول نظر نہ آئیں' نہ ہی وہ اتنا کوتاہ بین ہے کہ تمہارے گالوں پر بکھرتے ان رنگوں کو کوئی مفہوم ہی نہ پہنا سکے جو اسے دیکھ کر یک دم تمہارے رخساروں پر ہولی کھیلنے لگتے ہیں۔ تب اسے عروج کے جملوں پر ہنسی آئی تھی۔

"یار! تم بھی کسی افسانہ نگار سے کم نہیں ہو' افسانے لکھنا شروع کر دو۔"

اور عروج نے دل گرفتی سے سوچا تھا۔ بھلا وہ کیسے افسانے لکھ سکتی ہے۔ چند لفظ بول دینے سے بھلا کوئی افسانہ نگار بن سکتا ہے۔ افسانہ نگار تو پیدائشی ہوتا ہے آمنہ شاہ کی طرح لیکن اس کے اندر ایک چھپی ہوئی خواہش نے چٹکی ضرور بھری تھی۔ کاش ایسا ہو کہ کبھی وہ بھی لکھ سکے آمنہ شاہ کی طرح۔

تب ہی اسید عبدالرحمٰن کے موبائل کی بیل ہوئی تو عروج اور آمنہ دونوں ہی اپنے اپنے خیالوں سے چونک کر اسید کو دیکھنے لگیں۔ اسید نے ہاتھ میں پکڑی فائل میز پر رکھ کر پاکٹ سے فون نکالا۔

"ارے ڈاکٹر فہد آپ...... خیریت؟"

"کیا...... عافیہ سلیمان کا پتا مل گیا؟"

"اوہ کہاں' کیا یہ ممکن ہے کہ اس سے بات ہو سکے؟"

"اوکے' میں آرہا ہوں۔"

اس نے سیل آف کر کے دونوں کی طرف دیکھا۔

"میں ذرا ڈاکٹر فہد کی طرف جا رہا ہوں۔ اگر حامد یا فیصل میں سے کوئی آجائے تو انہیں بتا

دینا کہ فرائیڈے اسپیشل میں میرا این جی او والا آرٹیکل بھی لگے گا۔"

اور وہ انہیں خدا حافظ کہتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

"کیا ہوا اسید؟" حامد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تم کچھ بتاتے کیوں نہیں ہو۔"

"کیا بتاؤں دوست!" اسید نے سر اٹھاتے ہوئے گہری سانس لی۔

"تم جب سے آئے ہو' یوں اپ سیٹ سے لگ رہے ہو۔"

"ہاں' میں رات بھر سو نہیں سکا۔" اسید نے پیشانی پر آئے بالوں کو ہاتھوں سے پیچھے کیا۔

"عافیہ سلیمان کو کسی نے قتل کر دیا۔"

"کیا......؟" حامد اچھل پڑا۔ "آمنہ نے بتایا تھا کہ تم اس سے ملنے گئے ہو۔"

"ہاں...... لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں پولیس تھی اور......"

حامد الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"تمہیں علم تو ہے حامد! ڈاکٹر فہد اس این جی او میں ملازمت کرتا تھا جہاں عافیہ بھی جاب کرتی تھی۔ فہد نے مجھے بتایا تھا کہ عافیہ بہت پریشان تھی۔ وہ لوگ اسے کسی ایسے کام کے لیے مجبور کر رہے تھے جو وہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک روز فہد سے کہا تھا کہ وہ جاب چھوڑنا چاہتی ہے لیکن اسے ڈر ہے کہ یہ لوگ اسے نقصان پہنچائیں گے۔ ڈاکٹر فہد نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ اس طرح کا خوف کیوں محسوس کر رہی ہے تو اس نے کہا تھا کہ وہ فون پر ان سے بات کرے گی اور یہ کہ اب اسے ان کی مدد کی ضرورت ہے۔ فہد نے اسے اپنا سیل نمبر دے دیا اور اس سے اگلے روز کی بات ہے کہ وہ آفس نہیں آئی اور اس این جی اوز کے کرتا دھرتا نعیم ملک نے بتایا کہ وہ جاب چھوڑ گئی ہے۔

اور اسی شام عافیہ سلیمان کی ماں اسے تلاشتی ہوئی آفس آئی تھی جبکہ آفس والوں نے اس کے آفس میں آنے سے انکار کر دیا اور اس کی ماں کو بتایا کہ وہ تو بہت دنوں سے آفس نہیں آرہی۔ جب عافیہ کی ماں کی اپیل ایک اخبار میں چھپی تو فہد نے مجھے فون کر کے بتایا کہ شاید اس نے جاب چھوڑ دی ہوگی۔ یہ اخبار سے پتا چلا تھا کہ وہ گھر نہیں پہنچی' یکم دسمبر صبح وہ گھر سے نکلی اور واپس نہیں پہنچی۔"

اسید حامد کو تفصیل بتا رہا تھا اور حامد بہت توجہ سے سن رہا تھا۔ میں نے فہد سے حاصل کردہ معلومات کے مطابق عافیہ کے متعلق ساری تفصیل اپنے آرٹیکل میں لکھ دی تھیں کہ دو ماہ سے اس کی ماں بیٹی کی تلاش میں خوار ہو رہی ہے اور میں نے فہد کو اس کے متعلق بتایا تھا کہ کل صبح فہد کا فون آ گیا کہ عافیہ نے اسے فون کیا ہے' وہ اس سے ملنا چاہتی ہے' وہ کسی پرائیویٹ ہوسٹل میں تھی۔"

''وہ اپنے گھر کیوں نہیں گئی؟'' حامد نے پوچھا تو اسید افسردگی سے مسکرایا۔

''کاش یہ بتانے کے لیے وہ زندہ رہتی۔ وہ فہد سے مل کر اسے سب کچھ بتانا چاہتی تھی۔ فہد نے مجھے فون کر دیا لیکن جب ہم وہاں پہنچے تو وہ نہیں رہی تھی۔''

''یہ این جی او کیا کام کرتی ہے؟'' حامد نے پوچھا۔

''اس کا کام Rural Development یعنی دیہی علاقوں میں لوگوں کی Learning (تعلیمی پروگرام) کا جائزہ لینا' ان کی طبی سہولتوں کا جائزہ' ان میں شعور پیدا کرنا' انہیں حفظانِ صحت سے آگاہ کرنا جس میں فیملی پلاننگ بھی شامل ہے۔''

اسید نے تفصیل بتائی۔

''اگر مقصد صرف یہی ہو تو یہ بہت اچھے مقاصد ہیں۔''

حامد نے آہستگی سے کہا۔ ''لیکن افسوس میں تمہیں بتاؤں تم جس این جی او کے متعلق تحقیق کر رہے تھے اس کے متعلق کیا جانا ہے؟''

''یہ دراصل حدود آرڈیننس کے خلاف ویمن ایکشن فورم کے نام سے بنائی جانے والی تنظیم کی طرح کی این جی او ہے۔ دورانِ خانہ مقاصد تو ابھی پوری طرح واضح نہیں مجھ پر لیکن جلد ہی پتا چل جائے گا۔ بظاہر یہ انسانی حقوق' حقوقِ نسواں خواتین کے خلاف امتیازی سلوک اور gender balance کے نعرے لگا رہے ہیں۔ میں اس کی بانی بیگم نصر اللہ سے ملا ہوں' ان کا انٹرویو لیا ہے۔''

''فائن!'' اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ''کیا فرمایا محترمہ نے؟''

''یہی کہ انہوں نے یہ این جی او مظلوم عورتوں کے حقوق حاصل کرنے کے لیے بنائی ہے۔ عورت جس کا استحصال کیا جا رہا ہے۔''

''جتنے حقوق عورت کو اسلام نے دیے ہیں' اتنے حقوق تو دنیا کے کسی مذہب نے نہیں دیے۔'' صدف نے جو کچھ دیر پہلے خاموشی سے آ کر ایک طرف بیٹھ گئی تھی' گفتگو میں مداخلت کی۔ ''یہ جن رسموں رواجوں کا سہارا لے کر مسلمان عورت کی مظلومیت کا رونا ساری دنیا کے میڈیا پر کرتی پھر رہی ہیں' وہ رسم و رواج جہالت اور لاعلمی کا نتیجہ اور اسلام سے دوری کی وجہ سے ہیں۔ اسلام تو ان کی حمایت نہیں کرتا۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو صدف! کاش کوئی ریفارمر ان کو شعور دے' ان میں صحیح اسلام کی تبلیغ کرے۔ یہ نام نہاد فلاحی انجمنیں اور این جی او صرف اپنا مقصد نکالنا چاہتے ہیں۔ تم ایسا کرو مسلمان عورت کے حقوق کے متعلق کچھ آرٹیکل لکھ ڈالو۔''

صدف نے آہستہ سے سر ہلا دیا تو اسید کو یاد آیا کہ اس کی طبیعت خراب تھی۔

''تمہاری طبیعت کیسی ہے اب؟''

''ٹھیک ہوں۔''

''اور دادا جان اور احمر کی والدہ کی طبیعت کیسی ہے؟ بہت دنوں سے جا نہیں پایا ہوں۔'' اسید نے پوچھا۔

''ٹھیک ہیں' تمہیں یاد کرتے ہیں۔ لیکن تمہاری مصروفیات سے بھی باخبر ہیں۔'' صدف نے بتایا' تب ہی حامد نے اس کی طرف دیکھا۔

''صدف! اگر تمہیں اپنے آرٹیکل کے لیے کچھ معلومات چاہئیں تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ ۱۹۹۵ء میں بیجنگ میں عورتوں کے حقوق کے متعلق کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کے بعد اڑتالیس ممالک کے سفارت خانوں میں ایسے دفاتر کھولے گئے جو ایسے لوگوں کو امداد دیتے تھے جو خواتین کی امداد کے نام پر ادارے یا این جی اوز بناتے تھے' انہیں دفاتر' کمپیوٹر کیمرے اور ملٹی میڈیا سے لے کر گاڑی تک فراہم کی جاتی تھی۔''

صدف بے حد دھیان سے سن رہی تھی۔

''دراصل این جی اوز کے سلسلے میں تحقیق کرتے ہوئے میرے علم میں یہ ساری معلومات آئیں۔ مختصراً تمہیں بتا رہا ہوں کہ شاید اس میں سے کچھ تمہارے کام آ سکے۔ تو میں کیا بتا رہا تھا کہ ان افراد کو ورکشاپ کروانے' کانفرنس کرنے اور احتجاج کرنے کے لیے پیسہ دیا جاتا تھا۔ دراصل امریکہ کی نیشنل سیکورٹی ریسرچ نے جسے RAND کہا جاتا ہے' پوری مسلم امہ کے خلاف جامع منصوبہ بنایا تھا 2003ء میں جس کا نام اس کی دو اہم شقوں کے متعلق میں تمہیں بتاتا ہوں۔ ایک تو یہ کہ ماڈرن اسکالرز کو سامنے لایا جائے' انہیں چینلز پر موقع دیا جائے۔ ایسے اخبارات اور چینلز کو پیسہ دیا جائے جو اسلام کے خلاف کم علم علماء کو سامنے لائیں اور دوسرا یہ کہ مسلمان عورت کو ہر طرح سے تحفظ دیا جائے' اسے اعلیٰ تعلیم اور جائز مواقع دیے جائیں۔ اسے احساس دلایا جائے کہ وہ بہت گھٹن کی اور پابند زندگی گزار رہی ہے۔ اسے آزادی کے نام پر بے راہ روی کی طرف مائل کرنا' اسے آزاد زندگی گزارنے کی ترغیب دینا' اسے اتنی سہولتیں مہیا کرنا کہ وہ شادی کرنے کے بجائے خود مختار زندگی گزارنے کی طرف مائل ہو جائے۔ ایسے ایشوز کو سامنے لانا کہ پتا چلے کہ مسلمان عورت دنیا کی مظلوم ترین عورت ہے۔''

''مختاراں مائی کا ایشو بھی مجھے ایسا ہی ایک ایشو لگتا تھا۔'' صدف نے کہا۔ ''کیا یورپی ممالک میں مختاراں مائی جیسی عورتیں نہیں ہوتیں؟''

''کیوں نہیں ہوتیں۔'' اسید عبدالرحمن نے اس کی طرف دیکھا۔ ''یورپ کی عورت تو بہت قابلِ رحم ہے' وہاں تو کم عمر بچیاں اور......''

تب ہی دروازہ کھلا اور آمنہ نے اندر جھانکا۔

ہمیشہ کی طرح بہت فریش اور شگفتہ سی۔ لمحہ بھر کے لیے اسید کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہریں اور پھر فوراً ہی اس نے نگاہیں جھکا لیں۔

''السلام علیکم۔'' وہ سب کو سلام کرتے ہوئے اندر آ گئی۔

''کیسی ہو صدف؟''

''شکر ہے تم آ گئیں۔ سچ بہت بوریت ہو رہی تھی ان دنوں۔ عاشی اور عروج بھی نہیں آ رہیں اور وہ سعید بھی آج کل بہت بری طرح سے اپنی اسٹڈی میں مصروف ہے۔'' تیز تیز بولتی ہوئی وہ صدف کی کرسی کے ہتھے پر ہی ٹک گئی اور پھر اسید کی طرف دیکھا۔

''اسید! تمھاری ملاقات ہوئی عافیہ سے' کیا کہا اس نے؟''

''عافیہ کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔''

''اوہ نو!'' بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔

''اور فہد...... ڈاکٹر فہد تو ٹھیک ہے نا۔ وہ.....''

''ہاں فہد تو ٹھیک ہے' تمھارا مطلب۔ اوہ نو۔'' اسید عبدالرحمٰن یکدم پریشان نظر آنے لگا۔

''تم صحیح سوچ رہی ہو مائی گاڈ! مجھے پہلے اس کا خیال ہی نہیں آیا جو لوگ عافیہ کو قتل کر سکتے ہیں وہ ڈاکٹر فہد کو بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔''

بات کرتے کرتے اس نے فون اپنی طرف گھسیٹا اور فہد کو نمبر ملانے لگا۔

اسے چند ہی ملاقاتوں میں یہ نوجوان ڈاکٹر بے حد عزیز ہو گیا تھا۔ اس کی باتوں سے وطن کی محبت کی خوشبو آتی تھی۔ بہت سچا' کھرا اور بولڈ لڑکا تھا۔

''ہیلو..... ہیلو ڈاکٹر فہد سے بات کرنا ہے۔'' شاید نمبر مل گیا تھا' تینوں اسید کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''میں ڈاکٹر فہد بول رہا ہوں' اسید خیریت ہے۔'' دوسری طرف سے ڈاکٹر فہد پوچھ رہے تھے۔

''اوہ ہاں......'' اسید نے اطمینان بھرا سانس لیا۔ ''میں نے پریشانی میں تمہیں پہچانا نہیں۔ میں تمہارے لیے پریشان ہو رہا ہوں۔ یار! وہ لوگ تمہارے لیے بھی خطرہ ہو سکتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ وہ میرے متعلق نہیں سوچ سکتے۔ میرا تعلق تو طبی شعبے سے تھا۔ یہ جو کچھ میرے علم میں آیا اتفاقاً تھا۔ اور عافیہ سے نہ تو وہاں بات چیت اکثر ہوتی تھی نہ ایسی کوئی خاص ملاقات تھی۔ وہ تو صرف دو تین بار میرے کلینک میں آئی تھی اپنی آنکھیں چیک کروانے کے لیے۔ الرجی ہو گئی تھی تو اتفاق سے میں اکیلا تھا تو اس نے بات کی۔ میں چونکہ ان دنوں ان کی سرگرمیوں سے متعلق کچھ مشکوک ہو چکا تھا تو میں نے اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔''

فہد نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

''بہرحال اپنا خیال رکھنا بہت۔''

''او کے' تھینک یو۔''

فون بند کر کے اس نے فہد کی گفتگو سے انہیں آگاہ کیا۔

''تو میرے لیے اب کیا حکم ہے سر؟''

حامد نے قدرے مزاحیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں' تم اپنا آرٹیکل مکمل کر لو۔ میں چاہتا ہوں دونوں آرٹیکل ایک ہی ایڈیشن میں آ جائیں' اسی فرائیڈے کو۔''

''او کے۔'' حامد اٹھ کھڑا ہوا تو اسید ٹیبل پر بکھرے کاغذات کو اکٹھا کر کے فائل میں رکھنے لگا۔

''اسید! جو لوگ عافیہ کو قتل کر سکتے ہیں' وہ ان آرٹیکل کے چھپنے کے بعد تمہارے بھی تو دشمن ہو سکتے ہیں۔'' آمنہ کے لہجے میں تشویش تھی۔

''پھر؟'' اسید نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔

''کیا ان آرٹیکل کے چھپنے کا کوئی فائدہ ہو گا اسید؟'' آمنہ اب اسے دیکھ رہی تھی۔

''معلوم نہیں آمنہ! اگر نہ بھی ہو تو ایک کوشش تو کی ہے نا ہم نے عوام کو' حکومت کو' لوگوں کو آگاہ کرنے کی' یہ ہے ان کا اصل چہرہ۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم بہت سے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں۔ بے روزگاری' لامحدود خواہشات' آسائشوں کی طلب' ہمیں اندھا دھند بھگا رہی ہے۔ ہمیں جہاں پیسہ زیادہ ملتا ہے' ہم ادھر ہی لپکتے ہیں۔ ان آرٹیکل کو پڑھ کر چند افراد نے بھی ان کے جال میں آنے سے خود کو بچا لیا تو یہ میرے نزدیک کامیابی ہے۔ بڑی نہ سہی چھوٹی کامیابی۔ کہیں نہ کہیں سے تو کام کی ابتدا کرنا ہے نا آمنہ!''

اس نے بے حد ٹھہرے ٹھہرے انداز میں سمجھایا تو آمنہ کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ رہا۔ وہ صحیح کہتا تھا کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے نا! تو پھر یہاں سے ہی سہی۔ لیکن کیا اس شخص کے دل میں کبھی میرا خیال بھی آتا ہوگا۔ میں آمنہ شاہ جو اپنے دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ تمہیں سوچتی ہوں اور ہر لمحہ میرے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کیا کبھی آمنہ شاہ کو اسید عبدالرحمٰن کی رفاقت مل سکتی ہے۔

''آمنہ!'' صدف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونکی۔ ''چلیں اپنے کمرے میں۔''

''ہاں۔'' وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''چلو مجھے ابھی فرائیڈے ایڈیشن کے لیے اپنی رپورٹ مکمل کر کے دینا ہے حامد کو۔'' اسید بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''تم کہیں جا رہے ہو اسید؟'' صدف نے پوچھا۔

''ہاں مجھے ذرا حسن پرنٹنگ پریس تک جانا ہے۔ اخبار کے سلسلے میں کچھ بات کرنا ہے۔''
'نوید سحر' حسن پرنٹنگ پریس سے ہی چھپتا تھا۔
''خیریت' کہیں انہوں نے بصیر پرنٹنگ والوں کی طرح ہمارا اخبار چھاپنے سے انکار تو نہیں کر دیا؟'' صدف نے بے اختیار پوچھا۔
''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کچھ اور مسئلے ہیں۔''
اسید اپنا موبائل اٹھا کر باہر نکل گیا تو آمنہ اور صدف بھی اس کے کمرے سے باہر نکل آئیں۔ ہال میں فیصل اور حامد کسی مسئلے پر بحث کر رہے تھے اور سعید ٹیبل پر پڑی تصویروں کو چھانٹ رہا تھا جبکہ دلیر اس کے پاس خاموش کھڑا کچھ سوچ رہا تھا۔
''صدف! تمہیں آرٹیکل کے سلسلے میں اگر کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو مجھے بتانا' میرے پاس ''اسلام میں عورت کے حقوق پر'' ایک کتاب بھی ہے' وہ میں تمہیں لا دوں گا۔''
حامد نے بات کرتے کرتے مڑ کر صدف سے کہا اور صدف سر ہلاتی ہوئی آمنہ کے ساتھ اس کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں وہ تینوں بیٹھتی تھیں۔

🏳☪✋🏳☪✋🏳

''سیونی اسی نیناں دے آکھے لگے۔''
کتاب گود میں دھرے آنکھیں بند کیے آگے پیچھے جھولتے ہوئے سعید گنگنا رہا تھا جب عاشی' آمنہ' صدف اور عروج آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوئیں۔
''یہ پڑھائی ہو رہی ہے یا ریاض؟'' عاشی نے آگے بڑھ کر کتاب اس کی گود سے اٹھا لی۔
''ہائے نی سیو اسی نیناں دے آکھے لگے۔''
نیم وا آنکھوں سے عاشی کو دیکھتے ہوئے وہ پھر گنگنایا۔
''آنکھیں کھولو' دیکھو کون آیا ہے؟''
''ارے ہاں بابا......'' اس نے آنکھیں کھولیں اور یکدم اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ ''بڑی بڑی ہستیاں تشریف لائی ہیں آج غریب خانے پر۔ آیئے آیئے حضور!'' وہ تھوڑا سا جھکا۔
''زہے نصیب اتنی بڑی افسانہ نگار اور کالمسٹ نے ہمارے غریب خانے پر قدم رنجہ فرمایا ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کروں' پھول بچھاؤں۔''
''بکومت۔'' عاشی نے بیٹھتے ہوئے تینوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''نانو کہاں ہیں' یہ سب نانو کی مزاج پرسی کے لیے آئی ہیں۔''
''تمہاری نانو اور ہماری دادو اس وقت دادا جان کے ساتھ گھومنے کے بعد آرام کر رہی ہیں۔''
''کیا مطلب ہے تمہارا۔ نانو' ڈاکٹر کے پاس گئی ہیں نانا جان کے ساتھ' تم نہیں جا سکتے تھے

ساتھ۔''
''ہاں جا سکتا تھا۔'' سعید نے سر کھجایا اور کمرے میں پڑی اکلوتی میز پر اچھل کر بیٹھ گیا۔
''لیکن افسوس وہ میرے کالج سے واپس آنے سے پہلے ہی اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ ڈاکٹر کے کلینک تک چہل قدمی کر کے واپس آ گئے تھے۔''
''توبہ ہے سعید! تم کس قدر فضول بولتے ہو۔'' عاشی نے عاجز آ کر کہا۔ ''نانو کہاں ہیں؟''
''ظاہر ہے عاشی بی بی! اپنے کمرے میں ہوں گی۔ یہ کمرہ جس میں آپ تشریف فرما ہیں' میرا اور راحیل کا ہے۔''
''ٹھیک ہے ہم نانو کے کمرے میں جا رہے ہیں۔''
عاشی نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ فوراً بول اٹھا۔
''ارے نہیں' اب اگر اس کمرے کی قسمت جاگ ہی اٹھی ہے کہ اتنی اہم ہستیاں یہاں تشریف لائی ہیں تو آپ یہاں سے جا کر اس کی قسمت کو سلانے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔ یوں بھی دادی جان محترمہ اس وقت خوابِ استراحت کے مزے لے رہی ہیں اور دادا جان کرسی پر نیم دراز ''عمرو عیار'' کے کارنامے پڑھ رہے ہیں اور گاہے گاہے دادی جان پر بھی نظر ڈال لیتے ہیں۔''
عاشی نے اس کی اس اتنی لمبی چوڑی گفتگو پر برا سا منہ بنایا۔
''اسید بھائی اور ماموں بھی نظر نہیں آ رہے۔''
''اسید بھائی اور تمہارے ماموں کچھ دیر پہلے ہی گھر سے باہر نکلے ہیں لیکن چونکہ اس وقت میں یہ غور کر رہا تھا کہ ہم آخر نینوں کے ''آکھے'' ہی کیوں لگتے ہیں اور یہ دو نیناں کب ہمیں مشورے دینے لگتے ہیں اور مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان بے چاری گونگی آنکھوں پر الزام کیوں لگایا جاتا ہے خوانخواہ میں اور میرا دل ان کی مظلومیت پر اتنا رقیق ہو رہا تھا کہ میں پوچھ ہی نہ سکا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔'' تب ہی راحیل ٹرے میں پیپسی کے گلاس رکھے اندر داخل ہوا۔
''اٹھیے سعید بھائی' میز خالی کریں۔''
''اوہ ہاں' میز کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔''
''ماشاءاللہ' بہت سگھڑ ہے میرا بھائی۔''
راحیل نے ٹرے ٹیبل پر رکھی اور گلاس اٹھا کر سب کو دیے۔
''اس کی کیا ضرورت تھی؟'' عروج نے گلاس لیتے ہوئے کہا۔ ''ابھی ہم عاشی کے گھر سے پی کر آئے ہیں۔''
''اوہ اچھا!'' سعید نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا صدف نے پوچھا۔

"سعید! دادی جان کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اسید بہت پریشان تھا کل۔ ٹمپریچر کیوں نہیں اتر رہا۔"

"ایکچوئلی ملیریا بگڑ گیا تھا' اب کافی بہتر ہیں۔ پہلے ڈاکٹر یوں ہی دوا دیتا رہا۔ دو دن پہلے ہی تو بلڈ ٹیسٹ کروایا تو پتا چلا کہ ملیریا ہے۔"

"یہ ڈاکٹر بس ایویں ہی ہوتے ہیں صدف! یوں ہی بس تکّے سے دوائیاں دے دے کر مریض کو مار ڈالتے ہیں۔ میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر ڈاکٹر بننے کی ضرورت ہی کیا ہے' جب مریض کو مارنا ہی ہے تو اس بے چارے کو بغیر علاج کے ہی مرنے دیں۔ اچھا خاصا دوائیوں کا خرچ بچ جائے گا۔"

عاشی کو اب موقع ملا تھا سعید کو تنگ کرنے کا۔

"ہاں واقعی میں بھی اکثر سوچتا ہوں بالکل ایسا ہی۔ یہ ہم دونوں کی سوچ کتنی ملتی ہے نا۔"

صدف اور آمنہ کے لبوں پر مسکراہٹ تھی' تب ہی ایک طرف کھڑکی سے ٹیک لگائے کھڑے راحیل نے کہا۔

"بھائی! میں تو جا رہا ہوں ٹیوشن پر۔ چائے آپ خود بنا لیجئے گا۔"

"ہاں ہاں' تم جاؤ۔" اس نے اپنا گلاس خالی کر کے میز پر رکھا۔ "یہ ہے نا عاشی! اپنا ہی گھر ہے اس کا۔ کل کو بھی تو اس نے ہی میزبانی کرنا ہے۔ تو آج......"

"جی نہیں۔" عاشی نے اس کی بات کاٹی۔ "آج تو میں مہمان ہوں' چائے تم پلاؤ گے۔"

آمنہ نے ایک نظر عاشی پر ڈالی۔

"تو......تو اسید کے ساتھ عاشی۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ میرا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں اور اسے لگا جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا ہو۔ کیا یوں بھی ہوتا ہے۔ ابھی تو دل نے اسید کے نام پر دھڑکنا شروع کیا تھا' ابھی تو آنکھوں میں خواب اترے تھے اور......"

"بڑی گھنی ہو تم!" عروج نے عاشی کی پیٹھ پر مکہ مارا تو وہ چونک کر عاشی کو دیکھنے لگی۔

"میں نے کیا کیا ہے؟" عاشی منمنا رہی تھی۔ "اس سے پوچھو۔"

"میں کیا بتاؤں؟" سعید دانتوں تلے انگلی دبائے شرمانے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ "جوں ہی میں نے دنیا میں آنکھ کھولی تو بس ہماری پھوپھو صاحبہ نے جھٹ پٹ اپنی بیٹی کا نام ہمارے ساتھ لگا دیا کہ اتنا سوہنا منڈا ہے۔ کہیں کوئی اغوا ہی نہ کر لے بڑا ہونے پر......"

"پڑوس میں بالا گجر بھی تو رہتا ہے نا۔" عاشی شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"تو......تو......تم......اور سعید......" آمنہ نے رک رک کر اپنا جملہ مکمل کیا۔ "یعنی تم دونوں کی انگیج منٹ ہو چکی ہے۔"

اندر جیسے ایک بار پھر سے چراغاں ہو گیا تھا۔

"پتا نہیں یہ انگیج منٹ ہے یا کیا ہے۔ بس دادی نے اسی وقت ایک لڈو پھوپھو کے منہ میں ڈالا اور کہا۔ لو منہ میٹھا کرو آج سے منڈا تمہارا ہے۔"

"بکومت۔ اماں کی تب شادی بھی نہیں ہوئی تھی جب تم پیدا ہوئے تھے۔"

عاشی جھینپ رہی تھی۔

"یہ تو بعد میں جب مامی بیمار تھیں تو انہوں نے اماں سے مجھے مانگ لیا تھا۔"

"چلو بعد میں ہی سہی لیکن تمہاری اماں تو مجھ پر فدا تھیں نا' نہیں تو اسید بھی تھا اور فیصل بھی۔"

"تم خود ہی ہر وقت اماں کی گود میں گھسے رہتے تھے تو قدرتی بات ہے' اماں کو تم سے محبت تھی اور جب مامی نے کہا تو انہوں نے تمہارا نام دے دیا۔"

"ویسے......" وہ تھوڑا سا اس کی طرف جھکا۔ "یہ اماں نے اپنی محبت کچھ تمہاری طرف بھی منتقل کی ہے یا......"

عاشی کے رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔ وہ تینوں ان کی باتوں کو انجوائے کر رہی تھیں جب سعید نے ٹرے اٹھا کر راحیل کو پکڑائی۔

"یہ تم کھڑے کھڑے کیا دانت نکال رہے ہو' ٹیوشن پر نہیں جانا۔"

"تم پڑھایا کرو نا اسے۔" عروج نے مشورہ دیا۔ "پتا نہیں ٹیوشن سینٹر میں کیسا پڑھاتے ہیں۔ پیسہ کمانے کا ذریعہ ہیں سب۔"

"مشورہ اچھا ہے عروج بی بی!" سعید اچھل کر پھر ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ "لیکن یہ ٹیوشن لینے نہیں دینے جاتا ہے اور یہ حضرت خود اس قدر تیز ہیں کہ میرے جیسے دس بندوں کو پڑھا دیں' مجھ سے کیا پڑھنا ہے اسے۔"

"یعنی ایں ہمہ خانہ آفتاب است۔" عاشی نے اپنی فارسی کی لیاقت جھاڑی۔

"تمہیں فارسی پڑھنے کا مشورہ کس نے دیا تھا؟" سعید نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"فارسی میں نمبر زیادہ آتے ہیں۔ ہماری کلاس کی سب لڑکیوں نے آپشنل فارسی ہی رکھا تھا۔"

"ہائے کاش' مجھے بھی کوئی مشورہ دے دیتا تب فارسی رکھنے کا۔ خیر مستقبل میں تم سے پڑھ لوں گا۔ بہت کام آتی ہے فارسی۔ ویسے اب تم کیوں نہیں فارسی میں ماسٹرز کر لیتیں۔ خوامخواہ وقت ضائع کر رہی ہو۔"

"جی نہیں' میں نے وقت ضائع نہیں کیا۔ نانو نے منع کیا تھا مجھے ایڈمیشن لینے سے۔"

"اوہ ہاں ہاں لیکن میں نے تو ابھی ہاؤس جاب بھی کرنا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں شرارت تھی' عاشی نے اس کی طرف سے منہ پھیر کر آمنہ کی طرف

دیکھا۔

''آمنہ! کیا انگلش میں ماسٹرز کرنا بہت مشکل ہے۔''

''نہیں' خیر ایسا مشکل بھی نہیں۔ شوق ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔ اب کے ایڈمیشن کھلیں تو تم لے لینا ایڈمیشن۔''

''بی اے میں میرے پاس اسلامیات' ہسٹری اور اردو تھی کیا پھر بھی میں......''

''چھوڑ یار! انگلش میں کیا رکھا ہے' مجھے بالکل پسند نہیں ہے انگلش۔ اب دیکھو نا انگریزی ادب کا ہمارے احساسات سے کیا تعلق' ہمارے ہاں آہ ہوتا ہے ان کے ہاں آوچ ہے اور پھر انگریزی میں عشق نہیں ہوتا' محبت ہوتی ہے' یعنی Love لیکن محبت بھی کہاں ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے آمنہ جی! عشق کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟''

آمنہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری۔

''دیکھا'' اس نے چٹکی بجائی۔ ''انگریزی میں عشق نہیں ہوتا' وہ والا عشق جس میں کہتے ہیں۔''

عشق ہویا گھر وسریا در وسریا

''تم اتنا کیوں بولتے ہو سعید؟'' عاشی زچ ہو کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''میں اس لیے بولتا ہوں کہ تم مجھے یاد رکھو' ایسے ہی جیسے کوئی بادشاہ۔ یہ غالباً خلیل جبران نے کہا تھا اور مجھے اس وقت بالکل بھول گیا ہے کہ خلیل جبران نے کیا کہا تھا۔''

آمنہ کو پتا نہیں کیوں لگا جیسے اس کی آواز کی شوخی اچانک ختم ہو گئی ہو لیکن جب اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو اس کے ہونٹوں پر ویسی ہی مسکراہٹ تھی اور آنکھیں یوں ہی چمک رہی تھیں۔

''ویسے آمنہ جی!'' اس نے آمنہ کو اپنی طرف دیکھتے پا کر پھر سے بولنا شروع کر دیا تھا۔

''آپ لوگوں نے ادب کو شیکسپیئر کے عامیانہ ڈراموں تک ہی کیوں محدود کر دیا ہے' حیرت ہے کسی نے خلیل جبران' حافظ اور شیرازی کی گہرائی کو محسوس نہیں کیا۔ آمنہ جی! بھی جبران اور حافظ کو پڑھ کر دیکھیں۔''

''میں چائے بنا کر لاتی ہوں آمنہ! صرف آپ ادھر ہی دادی جان کے کمرے میں آجائیے گا۔ میں دیکھتی ہوں اگر وہ جاگ رہی ہوں تو۔''

''لو جی۔ اسید بھائی بھی آ گئے۔''

وہ جہاں ٹیبل پر بیٹھا تھا وہاں قریب ہی کھڑکی سے باہر گلی کا منظر نظر آ رہا تھا۔ آمنہ کی آنکھیں یکدم جگمگا اٹھیں۔ وہ دن میں نہ جانے کتنی بار اسید کو دیکھتی تھی اور ہر بار اسے لگتا تھا جیسے نہ جانے کب سے وہ اسید سے نہیں ملی اور ہر بار میں اس کی پُرشوق نظروں میں یوں ہی

جگمگاہٹیں اتر آتی تھیں۔ غیر ارادی طور پر وہ کھلے دروازے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ سعید ہولے سے کھنکارا۔ اس کے لبوں پر بڑی شریر سی مسکراہٹ تھی۔ آمنہ نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں' کچھ نہیں آمنہ جی! آپ بڑے شوق سے باہر کا نظارہ کریں۔ میں تو یوں ہی کھانسا تھا۔ گلے میں خراش پڑ گئی تھی۔'' آمنہ اس کی بات سمجھ نہیں سکی تھی جبکہ صدف کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی تھی' تب ہی اسید صحن میں نظر آیا اور پھر وہ دادا جان کے کمرے کی طرف جاتے جاتے سعید کے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ شاید عاشی نے کچن سے آواز دے کر اسے بتایا تھا۔

''السلام علیکم۔'' کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس نے سب پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی اور لحہ بھر کے لیے اس کی نظریں آمنہ کے چہرے پر ٹھہری تھیں پھر اس نے سعید کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ اس سے پہلے کہ سعید کچھ بتاتا عاشی نے دروازے کے باہر سے آواز لگائی۔

''دادی جان جاگ چکی ہیں۔''

''اوہ اچھا!'' آمنہ سب سے پہلے کھڑی ہوئی تھی۔

''ہم سب دادی جان کی مزاج پرسی کے لیے آئے ہیں۔'' آمنہ نے اس کے الجھے الجھے سے انداز کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

''اوہ...... تھینکس......'' وہ چونک کر ایک طرف ہٹا۔

''دادی جان اب تو کافی بہتر ہیں لیکن پچھلے دنوں بہت طبیعت خراب ہو گئی تھی ان کی۔'' وہ ان کے ساتھ چلتے ہوئے تفصیل بتانے لگا۔ دادی جان انہیں دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔

''خوش رہو' سکھی رہو۔'' انہوں نے سب کو دعا دی۔

آمنہ جگہ نہ ہونے پر ان کے پاس ہی ان کی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی۔ عاشی نے میز درمیان میں رکھ کر چائے کی ٹرے رکھی تھی' ساتھ میں نمکو' بسکٹ اور سموسے بھی تھے۔

''ارے اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔'' صدف نے عاشی کی طرف دیکھا لیکن جواب اسید نے دیا۔

''تکلف کہاں' یہاں یہی کچھ میسر ہوتا ہے۔ گھر میں کوئی خاتون تو ہے نہیں کہ کچھ بنا کر محفوظ کر دے۔''

''یعنی کچھ کیا؟'' عروج کے لہجے میں شرارت تھی۔

''یہی کباب' نگٹس وغیرہ۔'' سعید نے سموسہ اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''تو کب سے کہہ رہا ہوں تمہاری دادی جان سے کہ اب اسید کی شادی ہو جانی چاہیے لیکن

ہماری بات تو ایک کان سے سن کر دوسرے سے اڑا دی جاتی ہے۔''
''ارے مانے بھی تو تب نا۔''
''میں...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔'' اسید شپٹایا۔
''تو مطلب نہیں تھا' تب بھی اب سیٹل ہو گئے ہو۔ اخبار بھی چل نکلا ہے تو......''
''نہیں دادا جان!'' اسید نے ان کی بات کاٹی۔
''ابھی نہیں' آپ پہلے سعید کی کر دیں۔''
''اور وہ کہے گا مجھے ابھی امتحان دینا ہے۔ ہاؤس جاب کرنا ہے پھر پارٹ ون کرنا ہے پارٹ۔''
''ارے نہیں دادا جان! آپ اپنی خوشی پوری کریں' باقی سب تو چلتا رہے گا۔''

حاضر ہوں جان و دل سے
کیڑا ہوں گر چہ میں ذرا سا

اس نے دایاں ہاتھ سینے پر رکھ کر سر خم کیا۔
''میں تو چاہتی ہوں' دونوں کی اکٹھی ہی کر دوں۔'' دادی جان نے محبت بھری نظر دونوں پر ڈالی۔
''رہے راحیل اور وحید تو دونوں ابھی چھوٹے ہیں۔ جب سے بیمار ہوئی ہوں' دونوں کچن کی ذمہ داریاں بھی نبھا رہے ہیں اور پڑھائی بھی۔''
''ہاں یاد آیا' یہ وحید کدھر ہے۔ صبح سے نظر نہیں آیا مجھے۔'' اسید نے پوچھا۔
''ہاں' میں نے بھی نہیں دیکھا۔''
''راحیل بتا رہا تھا کہ وہ صبح کہہ رہا تھا کہ دیر سے آئے گا۔ اسکول میں فٹ بال کا میچ ہے۔''
دادا جان نے بتایا تو اسید نے گھڑی پر نظر ڈالی۔
''لیکن اب تو چھ بجنے والے ہیں۔''
آمنہ نے یک دم نظر اٹھا کر اسید کی طرف دیکھا' وہ بے حد پریشان اور مضطرب سا لگ رہا تھا۔
''اسید! خیریت ہے نا' آپ یکا یک پریشان ہو گئے ہیں۔'' آمنہ کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔
''ہاں بس یونہی۔'' وہ مضطرب سا ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں پتا کرتا ہوں اس کے اسکول سے۔''
''بیٹھ جاؤ اسید بیٹا! وہ اب اتنا چھوٹا بچہ بھی نہیں ہے' میٹرک کا طالب علم ہے۔ ماشاء اللہ قد تو راحیل سے بھی بڑا ہو گیا ہے اس کا۔''

دادا جان نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ یونہی مضطرب اور بے چین سا بار بار گھڑی کی طرف نگاہ ڈالتا رہا۔ آمنہ نے دو تین بار اس کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔
''ہم اب چلتے ہیں دادی جان! پھر کسی روز آئیں گے۔''
صدف اور عروج بھی کھڑی ہو گئیں۔
''خوش رہو بیٹا! جیتی رہو۔ کیسی رونق سی ہو گئی تھی تمہارے آنے سے' کبھی کبھی آتی رہا کرو۔''
''جی ضرور۔''
آمنہ اور صدف نے ایک ساتھ کہا اور سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلیں۔
''اسید!'' آمنہ نے مڑ کر اسے دیکھا۔
''وحید کا اسکول کہاں ہے' ہمارے ساتھ آ جاؤ۔ اسکول سے پتا کر لینا تمہاری تسلی ہو جائے گی۔''
''ہاں۔'' اسید نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بڑبڑایا۔ ''ساڑھے چھ ہونے والے ہیں اور وہ کبھی اتنی دیر تک گھر سے باہر نہیں رہا۔ آج کل حالات بھی تو ایسے ہی ہیں۔''
وہ دادا جان کو بتا کر ان کے ساتھ ہی باہر نکل آیا تھا۔
''کدھر جانا ہے اسید؟''
آمنہ نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھے اسید کی طرف دیکھا۔
''یہ ادھر سامنے ہی سیدھی روڈ ہے پھر چوک سے رائیٹ سائیڈ پر ہو جانا۔''
آمنہ نے سر ہلا دیا۔
''پریشان نہ ہو اسید! انشاء اللہ وحید اسکول میں ہی ہو گا۔''
وہ سامنے روڈ پر دیکھ رہی تھی۔
اسید کی نظریں اسٹیئرنگ پر دھرے اس کے ہاتھوں پر ٹک سی گئیں۔ بہت خوب صورت ہاتھ تھے آمنہ کے یا ایسے ہی لگے تھے۔
اس نے نظریں ہٹائیں' وہ اب سامنے دیکھ رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر گہری لکیریں تھیں۔
''کیا یہ ممکن ہے کہ وہ لوگ وحید کو اغوا کر لیں؟''
اس کے ذہن میں بس ذرا سی دیر کو خیال آیا تھا۔ پچھلے تین چار دنوں میں کتنے ہی دھمکی بھرے فون آ چکے تھے لیکن وہ ان کی پروا کیے بغیر لکھ رہا تھا' وہ سب جو اس کے علم میں آ رہا تھا۔
بیگم زبیدہ حسن کی این جی اوز اور ان کے کچے چٹھے۔
ایک سابق فلمی اداکارہ عذرا سبحان کا پارلر اور وہاں ہونے والی سرگرمیاں' نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کا اغواء اور ان میں ملوث یہ پارلر اور این جی اوز۔

"تو کیا......" اس نے سر جھٹک کر دائیں طرف دیکھا۔ گاڑی وحید کے اسکول کے گیٹ کے پاس کھڑی تھی۔

"اسید! مجھے تو اسکول ویران ہی نظر آ رہا ہے' بہرحال تم اتر کر چوکیدار سے پتا کرو۔ وہ یہیں کہیں ہی ہوگا۔"

"ہاں تھینک یو آمنہ! تم لوگ جاؤ اب' میں پتا کرکے پھر گھر چلا جاؤں گا۔"

اس نے گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے آمنہ کی طرف دیکھا۔

"نہیں اسید! تم پتا کرکے آؤ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔ اسکول کے اندر اتنی خاموشی ہے کہ مجھے پریشانی ہوگئی ہے اور پھر گیٹ بھی بند ہے۔ اگر میچ کھیلنے والے بچے ابھی تک یہاں ہوتے تو اتنی ویرانی نہ ہوتی۔"

اسید کچھ جواب دیے بغیر گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی پلٹ آیا۔

"چوکیدار کہہ رہا ہے کہ میچ تو چار بجے ختم ہوگیا تھا اور سب لڑکے ساڑھے چار تک چلے گئے تھے۔"

"تو پھر......؟" آمنہ نے پریشانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"میرا خیال ہے میں گھر جا کر راحیل سے اس کے دوستوں کے متعلق پتا کرتا ہوں۔"

اس نے قریب سے گزرتے ہوئے رکشہ کو ہاتھ دے کر روکا۔

"میں تمہیں گھر ڈراپ کر دیتی ہوں اسید!"

"نہیں' مغرب کی اذان ہونے والی ہے' تم لوگ گھر جاؤ' میں چلا جاؤں گا۔"

"اسید! کیا کوئی پریشانی کی بات ہو سکتی ہے۔ تم کیا سوچ رہے ہو؟"

صدف نے کھڑکی کا شیشہ سرکا کر پوچھا۔

"میں...... پتا نہیں...... خدا کرے ایسا کچھ نہ ہو۔ لیکن کچھ لوگ دھمکیاں دے رہے تھے کئی دنوں سے۔ گو کچھ واضح نہیں تھا کہ وہ کیا کریں گے لیکن......"

"وہ ضرور کسی دوست کی طرف ہی چلا گیا ہوگا۔"

صدف نے گویا تسلی دی لیکن اسید کا دل پتا نہیں کیوں مطمئن نہیں تھا۔

ابھی کل شام ہی کو تو وہ فون آیا تھا۔

"صبح اخبار میں کل والے اداریے کے سلسلے میں معذرت اور تردید چھپنی چاہیے ورنہ انجام کے ذمہ دار تم خود ہوگے۔"

اداریے میں اس نے ان نام نہاد این جی اوز اور ان پارلرز کے متعلق لکھا تھا جو بے حیائی پھیلا رہے تھے اور جن کے رابطے خلیج کی ریاستوں تک تھے۔

اس نے کسی بھی طرح کی کوئی تردید نہیں کی تھی اور......

وحید کہیں بھی کسی دوست کے گھر نہیں تھا۔

"پولیس میں رپورٹ کرواتے ہیں۔"

ابا جان نے مشورہ دیا۔

لیکن اسید جانتا تھا کہ پولیس میں رپورٹ لکھوانے کا مطلب ہے ذلیل و خوار ہونا۔ وحید خود سے کہیں نہیں جا سکتا تھا' یہ اسے یقین تھا۔ سڑک تک وہ اپنے دوست کے ساتھ ہی آیا تھا' بس کے دوست نے بتایا تھا۔ پھر وہ اپنی گلی کی طرف مڑ گیا تھا تو کیا۔ گلی سے گھر تک کے فاصلے میں اس کے ساتھ کچھ ہو گیا تھا۔

"آخر کہاں چلا گیا وہ؟" دادی نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے اسید کی طرف دیکھا۔

"کہیں کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو۔"

"میں نے مختلف اسپتالوں سے پتا کروایا ہے۔ آج کوئی اتنی عمر کا بچہ زخمی ہو کر ایمرجنسی میں نہیں آیا۔"

سعید دادی کو بتا رہا تھا جب اسید کا سیل بج اٹھا۔ اسید نے نمبر دیکھا۔ آمنہ کا فون تھا۔

"کچھ پتا چلا وحید کا؟"

"نہیں آمنہ!"

"تمہیں جس نمبر سے دھمکیاں ملتی رہی ہیں' اس نمبر پر چیک کرو فون کرکے۔"

"وہ نمبر کسی پی سی او کا تھا۔ میں نے اسی وقت چیک کر لیا تھا۔"

اسید نے مختصر بات کرکے فون آف کر دیا' تب ہی پھر بیل ہونے لگی تو اسید نے اسکرین پر نظر ڈالی' کوئی اجنبی نمبر تھا۔

وہ آف کرتے کرتے ٹھٹکا اور پھر کمرے سے باہر آ گیا۔

"ہیلو مسٹر اسید!" آواز اجنبی تھی۔

"آپ کون؟"

"اس سوال کو رہنے دو' یہ بتاؤ ہمارا سرپرائز کیسا رہا؟"

"کیا مطلب' صاف بات کرو۔"

"ارے......" لہجے میں حیرانی تھی۔ "کیا تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا کہ تمہارا بھائی آج گھر نہیں پہنچ سکا۔"

"تم......" اسید کے ماتھے کی رگیں ابھر آئیں۔

"ہاں میری جان! ہم نے کہا تھا نا تم سے کہ بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ مت ڈالو لیکن......"

"شٹ اپ۔" اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ "اگر وحید کو کوئی نقصان پہنچا تو میں

تمہیں نہیں چھوڑوں گا' تم بلیک میلر' ڈاکو' بردہ فروش......''

''ہاآ......'' دوسری طرف وہ شخص عجیب طرح سے ہنسا تھا۔ ''کیا کرلو گے تم۔ کیا حقیقت ہے تمہاری ہمارے سامنے۔ تم محض ایک معمولی قلم کار چند لفظوں پر اترا رہے ہو۔''

''دیکھو۔'' اس نے لہجے کو حتی الامکان نرم رکھنے کی کوشش کی۔ ''تمہیں جو بھی کچھ شکایت ہے یا جھگڑا ہے وہ میرے ساتھ ہے' میری فیملی کے افراد کو اس میں ملوث نہ کرو۔ جو کچھ کرنا ہے کہنا ہے میرے ساتھ کرو۔''

''تمہارے ساتھ ہی تو کر رہے ہیں بچو!'' وہ پھر ہنسا تھا۔ ''ابھی تو تمہارا بھائی ہے پھر باپ پھر دادا پھر......''

''بکومت۔'' اس نے کہتے کہتے خود کو روکا۔

''ہاں کہو کیا کہہ رہے ہو۔ دیکھو' تم وحید کو چھوڑ دو۔''

''چھوڑ دیں گے لیکن آئندہ تمہارے اخبار میں میڈم عذرا کے پارلر کے متعلق کچھ غلط چھپا تو یاد رکھنا پھر زندہ بھائی کے بجائے بھائیوں کی لاشیں وصول کرنا۔''

اسید ہونٹ بھینچے کھڑا تھا' دوسری طرف سے فون بند کر دیا گیا تھا۔

''اسید! کس کا فون تھا؟''

سعید نے جو نہ جانے کب باہر آ گیا تھا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

اسید نے ایک گہری سانس لی اور سعید کو برآمدے میں پڑی چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور ہولے ہولے اس نے تفصیل بتا دی۔

''تو اب؟'' سعید اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا سعید! کہیں وہ وحید کو کوئی نقصان نہ پہنچائیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں کبھی خود کو معاف نہ کر سکوں گا کہ کہ محض میری وجہ سے۔''

اس کی آواز میں نمی تھی۔ سعید ہولے سے اس کے کندھے تھپتھپا کر فون کی طرف بڑھ گیا۔

''آخر کیا ضرورت تھی مجھے سچائی کھوجنے اور اس کا ڈھونڈورا پیٹنے کی۔ اتنے سارے سالوں سے یہ سب کچھ ہو رہا ہے' اس سے پہلے تو کسی نے آواز نہیں اٹھائی اور اگر کوئی میرے جیسا بے وقوف سچائی کا علم بردار بن کے اٹھا بھی تو کیا کر لیا اس نے۔ کوئی تبدیلی' کوئی چینج...... وہی سب کچھ ہے جو پہلے تھا۔ وہی رشوت' وہی کرپشن' وہی فریب' وہی دغا۔''

وہ ہولے سے ہنسا۔

''اور میں چلا ہوں معاشرے کو سنوارنے۔ بھلا کیا کر لوں گا میں...... آج وحید کو کھو دوں گا تو کل......''

''نہیں۔'' اس کے دل میں ہوک سی اٹھی۔ ''وحید کو کچھ نہیں ہوگا۔'' اس کی آواز قدرے

بلند ہو گئی تھی۔

''یار! کبھی نہ ہارنا۔'' احمر نے جیسے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی۔

''یہ بہت مشکل راہ ہے کانٹوں سے بھری لیکن مجھے یقین ہے تم سچائی کا علم اٹھائے چلتے رہو گے۔'' اور آفتاب حسین نے کہا تھا۔

''دیکھو اسید! کئی مقام تمہاری زندگی میں ایسے آئیں گے جب تم سوچو کہ شاید تم نے غلط کیا ہے۔ لوگ تو بھر بھر جھولیاں فیض یاب ہو رہے ہیں اور تم لہولہان ہو رہے ہو۔ شاید تمہیں پچھتاوا ہو کہ تم نے ایسے راستے پر قدم کیوں رکھا جس پر چلتے ہوئے تمہاری ذات سے تمہارے پیاروں کو دکھ پہنچ رہا ہے اور یہی لمحے آزمائش کے ہوں گے۔ یہیں تمہیں اپنے آپ کو ثابت قدم رکھنا ہے اور اگر یہاں تم لڑکھڑا گئے تو پھر کبھی پورے قد سے کھڑے نہیں ہو پاؤ گے۔''

اسید نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا ایک ندامت کے احساس نے اسے گھیر لیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کیا سوچ رہا تھا۔ اسے وہی سب جدوجہد اور تگ و دو بے معنی لگ رہی تھی۔ اہم صدف' وحید اور اس کی زندگی تھی۔

چارپائی پر پڑا اس کا سیل فون بج رہا تھا۔ شاید رنگ کی آواز پر ہی وہ چونکا تھا لیکن سمجھ نہیں پایا تھا۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے فون اٹھا لیا۔ دوسری طرف ڈاکٹر فہد تھا۔

''یار! ابھی آمنہ نے وحید کے متعلق بتایا ہے' کچھ پتا چلا؟''

''نہیں۔''

''یہ وہ این جی اووالے نہ ہوں۔'' ڈاکٹر فہد نے خدشہ ظاہر کیا۔

''وہی جنہوں نے عافیہ کو قتل کروایا ہے۔''

''نہیں۔'' اسید نے اسے ساری بات بتائی۔ ''پریشان مت ہونا' میں آ رہا ہوں۔''

''نہیں' اس وقت مت آنا اور پھر آ کر کیا کرو گے۔''

''جو کچھ تم کر رہے ہو۔''

ڈاکٹر فہد نے فون بند کر دیا تھا' اسید کو اس پر پیار آیا۔ یہ نوجوان ڈاکٹر بے حد مخلص اور محب وطن تھا اور ایسے ہی نوجوانوں کی وجہ سے یہ ملک اب تک قائم ہے ورنہ جس قدر لوگ اس ملک کو لوٹ کھسوٹ رہے ہیں' اس کا قائم رہنا کمال ہی نہیں' معجزہ ہے۔

رات بہت طویل اور کٹھن تھی' حالانکہ گرمیوں کی راتیں اتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ لگتا ہے کہ ابھی سوئے تھے اور ابھی صبح ہو گئی لیکن آج تو رات جیسے گزر ہی نہیں رہی تھی۔ دادی اور دادا جان کو سعید نے بمشکل سلیپنگ پلز دے کر سلا دیا تھا۔ ابا جان جاگ رہے تھے' انہیں کسی پل چین نہیں تھا۔ کبھی جائے نماز بچھا کر نفل پڑھنے لگتے' کبھی برآمدے اور صحن میں ٹہلنے لگتے۔ سعید نے ان سے بھی سونے کے لیے کہا تھا لیکن جواب میں انہوں نے ایسی نظروں سے سعید کو

دیکھا کہ وہ اصرار نہ کر سکا۔ جانتا تھا کہ اپنے سارے بچوں میں سے انہیں وحید سب سے پیارا ہے۔ شاید سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اور خود وحید بھی والدہ کی ڈیتھ کے بعد باپ سے زیادہ قریب ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر فہد، اسید، سعید، راحیل میں سے بھی کوئی نہیں سویا تھا۔ عاشی اور پھوپھو بھی ادھر ہی تھیں۔ عاشی نے کتنی ہی بار چائے بنا کر دی تھی۔ اسید اور سعید، فہد کے ساتھ یوں ہی بے مقصد کتنی ہی دیر تک مختلف سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے پھرے تھے۔

''انتظار۔'' ڈاکٹر فہد نے اسید سے کہا۔ ''انہوں نے کہا تھا نا تم سے کہ وہ وحید کو چھوڑ دیں گے تو سعید کے دوست کے بھائی نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ صبح تک انتظار کریں۔ اگر کوئی کال آئے تو ریکارڈ کر لیں۔''

اور صبح فجر کی نماز کے لیے عبدالرحمٰن صاحب مسجد گئے ہوئے تھے اور اسید وضو کر رہا تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ سعید بے اختیار ہو کر دروازے کی طرف بھاگا۔

''یہ...... یہ دستک دینے کا انداز وحید کا ہے۔''

اسید بھی ایک دم کھڑا ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا دل بے تحاشا تیزی سے دھڑک رہا تھا اور پھر سعید نے دروازہ کھول کر وحید کو جیسے بازو سے پکڑ کر اندر کھینچ لیا تھا۔

''وحید...... وحید......'' وہ اسے گلے سے لگائے کھڑا تھا اور اس کی آنکھیں برس رہی تھیں۔

وہ ان سب کو کتنا عزیز اور پیارا تھا اس کا اندازہ دور کھڑا ڈاکٹر فہد کر سکتا تھا۔ سعید کے بعد اسید نے اسے گلے سے لگا لیا۔

''دادے...... عاشی......'' سعید وہیں کھڑے کھڑے چیخا۔ ''وحید آ گیا ہے۔'' اور پھر عاشی کے پیچھے پیچھے سب ہی باہر نکل آئے۔

''ویدو!'' اسید اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں کچھ ہو جاتا تو میں کبھی بھی خود کو معاف نہ کر سکتا۔ کبھی بھی نہیں۔''

اس سے الگ ہوتے ہوئے اس نے قدرے پیچھے ہٹ کر اپنی آنکھوں میں آ جانے والی نمی کو ہاتھوں کی پشت سے صاف کیا تو فہد نے آہستگی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہولے سے دبایا اور مسکرا کر اسے دیکھا۔

مدھم سی مسکراہٹ نے اسید کے لبوں کو چھوا اور وہ فہد کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔

''تم کچھ دیر سو جاؤ، یہاں میرے بیڈ پر۔ رات سے جاگ رہے ہو۔''

''ڈونٹ وری یار! نائٹس بھگتا بھگتا کر عادی ہو گئے ہیں راتوں کو جاگنے کے۔ تم کچھ دیر آرام کر لیتے۔''

''ہاں کر لوں گا آرام لیکن تم بھی کچھ دیر لیٹ جاؤ۔ اسپتال بھی جانا ہو گا تمہیں تو، او کے ایز یو وش۔''

فہد مسکراتا ہوا بیڈ پر لیٹ گیا جبکہ اسید جلد آنے کا کہہ کر باہر نکل آیا۔ باہر ابھی تک سب وحید کو گھیرے بیٹھے تھے۔ وہ بتا رہا تھا کہ ''جوں ہی اس نے گلی میں قدم رکھا ایک شخص نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ دوسرے نے ماؤزر کمر سے لگا دیا اور وہ چیخ بھی نہ سکا۔ اتفاق سے گلی بھی سنسان تھی، وہ اسے گلی کے ساتھ ہی باہر روڈ پر کھڑی گاڑی تک لے آئے۔''

''لیکن تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو۔ ہم کوئی امیر آدمی نہیں ہیں۔ مجھے اغواء کر کے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔''

اس نے احتجاج کیا لیکن وہ اسے زبردستی گاڑی میں بٹھا کر لے گئے۔

''توبہ......'' دادی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ دن دیہاڑے اتنے بڑے لڑکے کو اغواء کر لیا۔''

''انہوں نے تمہیں مارا تو نہیں۔'' راحیل نے جو اس کے ساتھ لگا بیٹھا تھا پوچھا تھا۔

''نہیں، انہوں نے مجھے کچھ نہیں کیا۔ بس لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا۔ رات کو کھانے کے لیے بھی دیا اور پھر صبح یہاں گلی کے نکڑ پر اتار کر چلے گئے۔ شاید انہیں پتا چل گیا تھا کہ میں کوئی دولت مند لڑکا نہیں ہوں۔''

''ضرور یہی بات ہو گی۔'' دادی نے بھی سر ہلایا۔ ''بے چاروں کی محنت اکارت گئی۔''

وحید ہنسا تو اسید نے دل میں ایک اطمینان سا پھیلتا محسوس کیا۔

''سعید! کسی نے ابا کو بھی بتایا؟'' اس نے پوچھا۔

''اوہ ہاں، میں جاتا ہوں مسجد میں۔'' سعید تیزی سے صحن کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔

''وحید! کیا دوبارہ وہ لوگ تمہیں نظر آئیں تو پہچان لو گے؟'' اسید نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ پہچان لوں گا۔''

''اے چھوڑو، ہمیں کیا پہچان کر کرنا۔ ہمارا بچہ واپس آ گیا، بس اللہ کا شکر ہے، کسی سے دشمنی مول لینے کی ضرورت نہیں۔ چلو سب کمرے میں کچھ دیر کمر سیدھی کر لو۔''

دادی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

''اور عاشی! تم نماز پڑھ چکی ہو تو چائے کا پانی رکھ دو۔''

''اسید!'' دادا جان نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے لیکن پھر خاموش ہو گئے۔

''جی دادا جان!''

''کچھ نہیں، تم جاؤ اور ہاں کہیں ڈاکٹر فہد یوں ہی بغیر ناشتے کے نہ چل دے۔ دھیان رکھنا۔ ساری رات ہمارے ساتھ پریشان رہا۔ اللہ اسے زندگی دے، بہت اچھا بچہ ہے۔''

اسید سر ہلا کر بیٹھک کی طرف بڑھ گیا۔ فہد جو جاگ رہا تھا، اسے دیکھ کر اٹھ بیٹھا۔

''میں اب چلتا ہوں۔''

''کہاں؟'' اسید نے اس کے کندھوں پر بازو ڈالتے ہوئے اسے پھر بٹھا دیا۔

''گھر......'' اس کے لبوں پر ایک افسردہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''گھر ہی سمجھ لو۔''

''کیا مطلب؟'' اسید اس کے پاس ہی بیٹھ گیا۔

''گھر تو گھر میں رہنے والے افراد سے بنتا ہے' وہ تو ایک اپارٹمنٹ ہے بس جہاں میں ٹھہرا ہوا ہوں۔''

''تم نے کبھی اپنے متعلق بتایا نہیں فہد! تمہاری فیملی۔''

''پھر کبھی سہی۔'' فہد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ابھی تو میں چلتا ہوں۔ نو بجے اسپتال بھی جانا ہے۔''

''کمال کرتے ہو یار! عاشی ناشتہ بنانے لگی ہے۔ ناشتہ کر کے جانا' ابھی تو بہت ٹائم ہے۔''

تب ہی سعید اندر داخل ہوا۔

''ابا آ گئے۔'' اسید نے پوچھا۔

''ہاں۔'' سعید سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اب تم نے کیا سوچا ہے' کیا تردید چھاپو گے؟''

''کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ مجھے تو سب...... نہیں سعید! شاید میرا سفر یہاں تک ہی تھا۔ شاید میں کسی ایسے امتحان کے قابل نہیں ہوں۔''

''تم اپنے راستے پر چلتے رہو اسید! پروا مت کرو کسی کی۔''

''کیسے پروا نہ کروں؟'' اسید کی آواز قدرے بند ہو گئی۔ ''کیسے سعید! جانتے ہو گزری رات کا ایک ایک پل میں نے کتنی اذیت میں کاٹا ہے۔ کتنا کرب سہا ہے میں نے۔ اگر خدانخواستہ وحید کو کوئی نقصان پہنچتا تو میں ابا کو' دادا کو' دادی کو کسی کو عمر بھر منہ دکھا سکتا تھا۔''

''ریلیکس اسید!'' فہد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا' گھبراؤ مت۔ آئندہ چند دنوں تک تم ان کے متعلق کچھ بھی مت چھاپو۔ کیا صبح کے اخبار میں پارلر کے متعلق بھی کوئی آرٹیکل ہے۔''

''نہیں۔'' اسید نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''یہ لوگ کچھ ایسے اونچے لوگ نہیں ہیں۔ جانتا ہوں میں' ماضی کی ایک ایکسٹرا کے طور پر کام کرنے والی یہ اداکارہ کوئی اتنی پاورفل بھی نہیں ہے۔ چند ایک کرائے کے غنڈے پال رکھے ہیں اس نے اور......''

''نہیں فہد! بھلے وہ ایکسٹرا ہی سہی لیکن اس وقت اس کی رسائی عرب ریاستوں تک ہے۔''

''اوکے۔ دیکھ لیں گے اسے بھی۔''

اس نے اندر آتی عاشی کی طرف دیکھا جو ٹرے اٹھائے آ رہی تھی اور اس کے ساتھ راحیل تھا۔ راحیل کے ہاتھ میں بھی ٹرے تھی۔ سعید نے ٹیبل بیڈ کے قریب کی۔ عاشی نے ٹیبل پر

ناشتہ لگا دیا۔

''پراٹھے' آملیٹ' اچار۔''

فہد مسکرایا۔

''آج تو مزا آ گیا۔ مدتیں ہو گئیں پراٹھے اور آملیٹ کا ناشتہ کیے۔''

''تھینکس سسٹر!'' راحیل نے بھی ٹرے ٹیبل پر رکھ دیا تھا جس میں پیالا اور ٹی پارٹ وغیرہ رکھے تھے۔

''آ جاؤ سعید!'' اسید نے پلیٹ فہد کو پکڑائی۔

''چائے آپ خود بنا لو گے یا میں آ کر بناؤں۔'' عاشی نے سعید کی طرف دیکھا۔

''بنا لیں گے تم جاؤ۔ ویسے یہ پراٹھے تمہارے ہاتھ کے پکے تو نہیں لگتے۔ تم تو ساری دنیا کے نقشے بنا دیتی ہو۔''

''امی بنا رہی ہیں۔'' عاشی نے برا نہیں مانا تھا۔

اسید نے اچار کی پلیٹ اپنی طرف کھسکائی۔

سعید مسکراتے ہوئے پلیٹ میں آملیٹ ڈالنے لگا اور فہد کھو سا گیا۔

کہیں کسی منظر نے یادداشت کے کینوس پر ابھر کر جیسے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا اور وہ اردگرد سے بے خبر سا ہو گیا تھا۔

''فہد! یہ لو نا آملیٹ' سب ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ تم کیا سوچنے لگے؟''

''ہاں؟'' وہ چونکا۔

''کچھ نہیں۔ یوں ہی میڈم عذرا اور ان کے حواریوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔''

وہ خاموشی سے ناشتہ کرنے لگا تھا لیکن اندر کہیں نمی پھیلتی جا رہی تھی۔

☆☆☆

''اور بالآخر وہ سب اپنے انجام کو پہنچ گئے۔'' صدف نے شولڈر بیگ میز پر پھینکا اور خود کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ سب انجام کو پہنچ گئے؟''

آمنہ نے فائل میں کاغذات کو ترتیب سے رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ؟'' صدف نے کرسی کو گھسیٹ کر میز کے مزید قریب کیا اور دونوں کہنیاں میز پر ٹکا دیں۔

''سب مجرم گرفتار ہو گئے۔ پارلر سیل ہو گیا۔ این جی او کا بھی خاتمہ ہوا سب کرتا دھرتا پکڑے گئے پھر......''

''یقین نہ کرنے کی بہت سی وجوہات ہیں۔'' آمنہ نے بغور اسے دیکھا۔

"اس ملک کی ساٹھ سالہ تاریخ.....اور......" ذرا سے توقف کے بعد اس نے بات آگے بڑھائی۔ "تمہارا کیا خیال ہے' کیا اس طرح کی اور این جی اوز نہیں ہوں گی جو عافیہ ایسی لڑکیوں کی مجبوریوں کو اس طرح خریدنا چاہتی ہوں گی اور ناکامی اور راز کے افشا کے خوف سے پھر انہیں موت کے گھاٹ اتار دیتی ہوں گی اور کیا کسی اور شہر میں کہیں اور کسی نے ایسے پارلر نہ کھول رکھے ہوں گے جو کسٹمرز اور ملازم لڑکیوں کو اس طرح فراڈ کر کے اپنے گھناؤنے کاروبار میں ملوث کرتے ہوں گے۔"

"ہوسکتا ہے۔" صدف نے یونہی میز پر کہنیاں دھرے دھرے اس کی طرف دیکھا۔

"لیکن آمنہ! ہم نے کوشش تو کی نا اپنی حد تک برائی ختم کرنے کی اور شاید کہیں کسی اور جگہ ہمارے جیسا کوئی اور سرپھرا اٹھ کھڑا ہو اور یوں چراغ سے چراغ جلتا جائے۔"

اس کی آنکھیں یوں دمکنے لگیں جیسے ان میں اچانک کسی خواب کو تعبیر پانے کی امید لو دینے لگی ہو لیکن آمنہ یوں ہی دل شکستہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"تم دیکھ لینا صدف! یہ سب چند دنوں میں آزاد ہو جائیں گے اور پھر کسی اور نام سے کسی اور جگہ اپنا دھندا شروع کر دیں گے' سالوں سے ایسا ہی ہوتا چلا آ رہا ہے' اس طرح کی یہ این جی اوز ان کی سرگرمیاں اور یہ اس طرح کے پارلر سالوں سے یہی کچھ کر رہے ہیں۔ کبھی یوں ہی شور مچتا ہے' پکڑ دھکڑ ہوتی ہے اور پھر سب کچھ پہلے کی طرف ہو جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے' مما نے بتایا تھا آج سے دس بارہ سال پہلے بھی یوں ہی ان این جی اوز کے خلاف شور اٹھا تھا اور کسی پارلر کے متعلق ایسی ہی کوئی کہانی اخبار میں چھپی تھی۔ غالباً آفتاب حسین کے اخبار میں اور پھر کیا ہوا؟"

اس نے سوالیہ نظروں سے صدف کو دیکھا۔

"یو آر رائٹ لیکن آمنہ جی! کم از کم میں اپنی جگہ بہت مطمئن ہوں کہ ہمیں ایک برائی کا کھوج ملا اور ہم نے صرف اس برائی کی نشان دہی ہی نہیں کی بلکہ اسے ختم کرنے میں بھی اپنا کردار ادا کیا۔ ہم نے اپنے حصے کا کام کر دیا ہے۔"

"بہت مثبت سوچ ہے تمہاری صدف! بہت مثبت سوچ رکھتی ہو تم۔ لیکن میں پتا نہیں کیوں تمہاری طرح اس سارے عمل سے جو ہوا' مطمئن نہیں ہوں۔ جیسے سب رائیگاں اور بے فائدہ ہے۔ حالانکہ پہلے میں ایسی نہ تھی۔ بہت پُرامید رہتی تھی۔ مجھے زندگی بہت خوبصورت لگتی تھی۔ بہت حسن دکھتا تھا مجھے اس میں۔ چھوٹی چھوٹی رومانی کہانیاں لکھنا بہت اچھا لگتا تھا مجھے۔ دنیا میرے لیے' میرے افسانوں جیسی تھی' جہاں سب اچھا تھا۔ یہاں اتنی بدصورتیاں جو اب مجھے اپنے چاروں اور نظر آتی ہیں' پہلے کبھی نظر نہیں آتی تھیں۔ لیکن جب میں یہاں آئی' میں نے تمہاری باتیں سنیں' تم سب کی.....تو میں چونک چونک کر اپنے اردگرد دیکھنے لگی' حیران ہوں کہ

یہ یہاں کیا ہو رہا ہے' میرے اس ملک میں' جسے اتنی قربانیوں کے بعد حاصل کیا گیا تھا۔" وہ ہولے ہولے بول رہی تھی اور صدف خاموشی سے اسے سن رہی تھی۔ "ہم لوگ ایسے کیوں ہیں۔ اتنے لالچی اور حریص.....ہم یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ یہ سب یہاں دھرا رہ جائے گا اور ہمارا نصیب وہی مٹھی بھر خاک اور دو گز زمین تو پھر کس لیے.....ہمیں تو سب کے لیے مثال بننا تھا' سب سے بڑی مسلمان ریاست لیکن میں اس قوم' اس پاکستانی قوم سے بہت مایوس ہو چکی ہوں۔"

"مایوسی کفر ہے آمنہ! ہمیں اچھی امید رکھنی چاہیے۔"

"لیکن میں پُرامید نہیں ہوں' ہر آنے والا دن جیسے اس قوم کو مزید ذلتوں میں گراتا جا رہا ہے۔ کچھ سال پہلے تک تو ہم ایسے نہ تھے اور نہ ہی ہمارے ملک میں اس طرح اتنی......"

اس نے ایک گہری سانس لی۔

"تم نے اس لڑکی کا بیان پڑھا تھا جو اس پارلر میں کام کرتی تھی' اس کے انکشافات پڑھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے گھر میں زکوٰۃ اور خیرات کا پیسہ آئے' وہ تو اپنے خاندان والوں کو عزت کی روٹی دینے کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ کیا عزت سے جینے کے لیے سوچنا اور حلال روزی کمانے کے لیے تگ و دو کرنا جرم ہے۔"

"آج تم بہت قنوطی ہو رہی ہو آمنہ!" صدف نے اس کا موڈ بدلنے کے لیے خوشگوار لہجے میں کہا۔ "ورنہ ہر اندھیرے کے پیچھے اجالے کی کوئی نہ کوئی کرن ضرور چھپی ہوتی ہے۔"

پتا نہیں کیوں وہ اتنی قنوطی ہو رہی تھی' حالانکہ سب ان دنوں بہت خوش تھے۔ ڈاکٹر فہد نے آئی جی صاحب سے خود بات کی تھی۔ ایک بار ان کی بیٹی اس کے کلینک میں ایڈمٹ ہوئی تھی اور تب سے ہی وہ ان کو جانتا تھا' وہ جب بھی ملتے بہت محبت سے ملتے تھے اسے۔ پھر سعید کے دوست کے بھائی نے بھی کافی مدد کی تھی۔ بڑی خاموشی سے ثبوت اکٹھے کیے گئے تھے' اس دوران ایس پی صاحب کی ہدایات کے مطابق اخبار میں ان دونوں کے بارے میں کچھ بھی نہیں چھاپا جا رہا تھا۔ پھر دس بارہ دن بعد یکایک وسیع پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں' چھاپے مارے گئے۔ اخبارات دھڑا دھڑ سنسنی خیز انکشافات چھاپ رہے تھے۔

"چیئر اپ آمنہ!"

صدف نے اسے خاموش دیکھ کر خوش دلی سے کہا۔

"میں خوش ہونا چاہتی ہوں صدف! لیکن خوش نہیں ہو پا رہی۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے صدف! کہیں بھی کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"یار! ہمیشہ اچھی امید رکھنی چاہیے۔" صدف ہولے سے ہنسی۔

"صدف! تم جانتی تھیں کہ احمر کو بلڈ کینسر ہے تو کیا تم پھر بھی پُرامید تھیں' تمہیں یقین تھا

کہ......"

صدف کی آنکھیں یکدم بجھ سی گئیں۔

"یقین تو نہیں لیکن امید تو تھی کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

"اور جب ڈاکٹروں نے بتایا کہ He in no more تب بھی مجھے لگا کہ شاید وہ کہیں زیادہ اچھی جگہ چلا گیا ہے۔ بس ہم......"

اس نے لب بھینچ کر بے اختیار اُمڈ آنے والے آنسو پینے کی کوشش کی۔

"ہمارے پاس صرف اس کی یادیں رہ گئی ہیں۔"

"تم بہت بہادر ہو صدف......" آمنہ نے ستائشی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم احمر سے محبت کرتی تھیں لیکن تم نے اس کی جدائی کو بڑے حوصلے سے برداشت کر لیا لیکن میں...... مجھے لگتا ہے جیسے میری محبت کی قسمت میں نارسائی کے سوا کچھ نہیں۔"

"پھر وہی مایوسی۔" صدف مسکرائی لیکن اس کی آنکھوں کے گوشے ابھی تک نم تھے۔

"تم اسید سے کہہ دو نا سب!"

"کیا...... کیا کہہ دوں؟" آمنہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"وہی سب جو تم سوچتی ہو اس کے لیے۔"

"پاگل ہو تم کیا' محبت بھی اپنے اظہار کے لیے لفظوں کی محتاج ہوتی ہے کیا' وہ خود نہیں بتاتی کہ میں ہوں یہاں تمہارے لیے اس دل میں' کیا تم نے کبھی احمر کو بتایا تھا کہ تم اس سے محبت کرتی ہو۔"

"نہیں...... لیکن میری بات اور تھی' ایک طویل عرصہ تک ہم ایک ہی گھر میں رہے۔ ہمارا بچپن' ہمارا لڑکپن' جوانی سب ایک ساتھ ہی تو گزرا۔ ہم جانتے تھے کہ ہمیں ایک دوسرے کا رفیق بننا ہے۔ ہم نے گھنٹوں ایک جگہ بیٹھ کر مستقبل کے پلان بنائے لیکن ہمیں کبھی ایک دوسرے کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں پڑی کہ ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں۔"

"اسید صاحب کہہ رہے ہیں کہ وہ آرٹیکل مل گیا ہو تو لے آئیں۔"

پیون نے ذرا سا کھلے دروازے سے اندر جھانکا۔

"اوہ ہاں۔" آمنہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں بس آ ہی رہی تھی۔"

اس نے میز پر پڑی فائل میں سے پن اپ کیے ہوئے چند پیپر نکالے اور کھڑی ہو گئی۔

"یہ آرٹیکل اسید نے مانگا تھا اور میں تم سے باتیں کرنے لگی۔ میں ابھی دے کر آتی ہوں' اتنے میں تم عروج کا کام دیکھ لو۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ ہی چلتی ہوں' دادا جان کو کوئی کام تھا' اسید سے انہوں نے کہا تھا۔

سے ان کا میسج دے دوں کہ وہ انہیں فون کر لے۔"

صدف بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

اسید کے کمرے میں اس کے علاوہ فیصل' حامد اور ڈاکٹر فہد بھی تھے۔ فہد سے بات کرتے کرتے اس نے آمنہ کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ سے آرٹیکل لے لیا اور انہیں بیٹھنے کا شارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فہد کی طرف وہ کاغذات بڑھا دیے۔

"یہ ہے وہ آرٹیکل جو کسی عرفان عزیز نامی شخص نے بھیجا ہے اور درخواست کی ہے کہ اسے چھاپ دیا جائے۔"

"تم نے اسے پڑھا آمنہ!"

کاغذات فہد کو دے کر وہ پھر آمنہ کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ آمنہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"تو تمہارا کیا خیال ہے' یہ سب سچ ہے جو اس نے لکھا ہے۔"

"ہے بی' لیکن اس شخص نے اپنا ایڈریس وغیرہ نہیں لکھا۔ سو ہم اس سے رابطہ نہیں کر سکتے' اپنی تسلی کے لیے اور بغیر پروف کے تو یہ نہیں چھاپا جا سکتا۔ ہم پر کیس ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے یہ سب جھوٹ ہو۔"

اسید نے ایک ستائشی نظر اس پر ڈالی۔

"تم صحیح کہتی ہو۔ بغیر کسی پروف کے اسے چھاپنا صحافتی غیر ذمہ داری ہو گی۔"

"لیکن اس آرٹیکل میں ہے کیا؟"

حامد نے جو کونے میں رکھی کمپیوٹر ٹیبل کے پاس کھڑا تھا' پوچھا۔

"یہ کسی دور دراز دیہات میں قائم ہونے والی ایک این جی او کے متعلق ایک شخص نے رپورٹ بھیجی ہے اور بتایا ہے کہ یہ ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہے' اس نے ان سرگرمیوں کی کچھ تفصیل بھی لکھی ہے۔"

"لیکن بہرحال اسے اپنا ایڈریس لکھنا چاہیے تھا۔ یا کوئی فون نمبر نام تو جعلی بھی ہو سکتا ہے۔" فیصل نے بھی رائے دی۔

"ایسی بہت سی ملکی اور غیر ملکی تنظیمیں اور انجمنیں یہاں ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور یہ کئی سالوں سے ہو رہا ہے' اگر کوئی ایسی کسی سرگرمی کے متعلق عوام کو باخبر کرنا چاہتا ہے تو اسے کم از کم ہم پر تو اعتماد کرنا پڑے گا۔ بہرحال اس شخص نے رابطہ کیا تو سوچیں گے۔"

اسید کی بات سے کسی نے اختلاف نہیں کیا تھا۔

"اسید! اب کیا تم اسی طرح کی دوسری این جی اوز پر بھی کام کرنا چاہتے ہو؟"

ڈاکٹر فہد نے کاغذات میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال ہے اس وقت اور بھی بہت سی اہم ایشوز ہیں' ہمیں ان سب پر کام کرنا ہے لیکن

بعد میں۔اس وقت ہماری ترجیح ہونا چاہیے اپنے ملک کو بچانا۔''

حامد کمپیوٹر ٹیبل کے پاس سے ہٹ کر اسید کے پاس آ گیا تھا اور اب اسید کی ٹیبل پر دونوں ہاتھ رکھے ہولے ہولے کہہ رہا تھا۔

''ان سب پر نہ جانے کب سے لکھا جا رہا ہے۔لکھا جاتا رہے گا۔شاید کہیں کچھ بہتری بھی ہو جائے لیکن......لیکن آپ لوگ جانتے ہیں باہر لوگ ہمارے ملک کے ٹوٹنے کی باتیں کرتے ہیں اور میرا دل کہیں پاتال میں گر جاتا ہے۔یہ ملک اس لیے نہیں بنا تھا کہ یہاں قتل و غارت گری کا سلسلہ شروع ہو جائے' اپنے اپنوں کا قتل عام کریں۔سوات' فاٹا' وزیرستان یہاں کیا ہو رہا ہے' کیوں ہو رہا ہے؟ ہمیں اس کو کھوجنا چاہیے۔کون صحیح ہے' کون غلط ہے۔صوبوں میں ایک دوسرے کے خلاف اتنی نفرت کیوں ہے......ہمیں اس نفرت کو دھونا ہے۔ان سازشوں کے خلاف کام کرنا ہے جن کے تانے بانے کہیں اوپر بنے جا رہے ہیں۔''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو حامد!''

اسید نے میز پر رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔حامد کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ وہاں سے ہٹ کر ڈاکٹر فہد کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''میرا خیال ہے' ہم چلیں۔''

صدف نے آہستگی سے آمنہ سے کہا۔جو بہت دھیان سے اسید کو دیکھ رہی تھی۔

''نہیں بھئی۔'' اسید نے سن لیا۔''چائے آ رہی ہے اور آپ کے لیے ایک اچھی خبر بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' صدف نے اس کی طرف دیکھا۔

''اب ڈاکٹر فہد بھی ہمارے لیے لکھیں گے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے' میرا خیال ہے سب سے پہلے آپ کو ڈاکٹروں کے رویے پر لکھنا چاہیے۔مریض کے ساتھ تو ایسے پیش آتے ہیں جیسے وہ کوئی بہت گھٹیا مخلوق ہو۔''

''اس پر بھی لکھیں گے لیکن اس وقت تو میں وہ کام کرنا چاہتا ہوں جو اقبال نے کیا تھا۔اس قوم کو جگانے کا کام' احساس دلانے کا کام' میں بتانا چاہتا ہوں۔خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا۔''

''تو آپ کا خیال ہے ڈاکٹر فہد! آپ کے چند لفظ اس قوم کو غفلت کی نیند سے جگا دیں گے۔'' آمنہ نے یکدم پوچھا۔

''ہاں شاید......'' ڈاکٹر فہد اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''غلط فہمی ہے آپ کی۔'' آمنہ کے لبوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ ابھری۔''نہیں جاگے گی یہ قوم۔اس قوم میں پہچان ہوتی تو اتنے عرصہ تک ظالم ہمارے اوپر مسلط رہتے۔یہ غلامی میں

خوش ہیں' ڈاکٹر فہد! امریکہ کی غلامی' پیسے کی غلامی' نفس کی غلامی۔''

''اتنی ناامیدی اچھی نہیں ہوتی آمنہ بی بی! یہ قوم خدانخواستہ اگر پاکستان پر کوئی بیرونی مشکل آئی تو یہ لوگ سروں پر سامان اٹھا کر مہاجر بننے کے بجائے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر سرحدوں کی طرف بھاگیں گے' میں ہمیشہ کہتا ہوں آمنہ بی بی! اس جیسے جیالے دنیا کی کسی ماں نے نہیں جنے۔میدان جنگ میں پاکستان جیسی سرپھری قوم روئے زمین پر کوئی دوسری نہیں' وہ پاگل عاشق ہیں کہ ایک قومی ترانہ سنا کر ان کی لاشوں کو سڑک بنا لو۔یہ اپنے ہاتھ سے اپنا سر دھڑ سے الگ کر کے پاکستان پر وار دینے والی قوم ہے۔''

ڈاکٹر فہد یکدم جذباتی ہو گیا تھا۔سب نے اس کی اتنی لمبی چوڑی بات بہت دھیان سے سنی تھی۔آمنہ کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھری تھی۔وہ ڈاکٹر فہد کی طرف مڑ گئی۔

''ہم نے بھی سنا تھا ۶۵ء کی ۷۱ء کی جنگوں کے بارے میں۔خاص طور پر ۶۵ء کی جنگ کے بارے میں اس پاکستانی قوم کی ایسی ہی باتیں لیکن یہ صرف سنی سنائی باتیں ہیں اور ان میں نہ جانے کوئی حقیقت ہے بھی یا نہیں۔آپ اس قوم کی بات کر رہے ہیں' ان لوگوں کی ڈاکٹر فہد! جنہوں نے ڈاکٹر عبدالقدیر کی اسلام آباد میں قبر بنائی اور انسان دشمن قرار دیا۔جنہوں نے محسن پاکستان کو......''

وہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئی۔

''یہ میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگوں سے بھری قوم ہے اور یہ بڑھتے جا رہے ہیں یاجوج ماجوج کی طرح۔پاکستانی خون میں زہر کی آمیزش ہو چکی ہے۔ڈاکٹر فہد! عورت' پیسہ اور عریانی نے نئی جنریشن کو بے کردار کر ڈالا ہے۔آپ کچھ بھی لکھ لیں۔چاہے قلم کو خون دل میں ڈبو لیں کچھ نہیں ہونے والا۔''

''بری بات آمنہ! اتنی مایوسی اچھی نہیں۔'' ڈاکٹر فہد مسکرایا۔

''اس جنریشن میں آپ صدف' فیصل' اسد' حامد جیسے لوگ بھی تو ہیں نا۔ان جیسے ہزاروں ہوں گے۔روشنی کی ایک ننھی سی کرن بھی اندھیرے کی موت ہوتی ہے۔چیر اپ' لیجیے چائے آ گئی۔''

ہوٹل والے لڑکے نے ٹرے ٹیبل پر رکھ دی تھی اور چائے دانی سے چائے پیالیوں میں ڈال رہا تھا۔حامد سب کو چائے پکڑانے لگا۔اسید کی نظریں آمنہ کی طرف دو تین بار اٹھیں اور اس نے بغور آمنہ کو دیکھا۔اس کا چہرا اترا ہوا تھا اور آنکھیں تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔حالانکہ ہمیشہ وہ بہت فریش نظر آتی تھی۔

''کیا کوئی پرابلم ہے' اسے کوئی گھریلو پرابلم جو یہ اتنی ڈسٹرب ہو رہی ہے ورنہ پہلے تو کبھی اتنی تلخ باتیں نہیں کی تھیں اس نے۔'' چائے پیتے ہوئے وہ مسلسل آمنہ کے متعلق ہی سوچ رہا

تھا۔
چائے پی کر ڈاکٹر فہد اٹھ کھڑے ہوئے۔
''او کے اسید! پھر میں چلتا ہوں۔''
''اللہ حافظ!'' اسید نے کھڑے ہو کر اس سے ہاتھ ملایا۔
''تو پھر تمہارا کالم پکا ہے نا-''
''شیور۔'' ڈاکٹر فہد مسکرایا۔
''آپ اپنا کالم اس عنوان کے تحت لکھیں ''نہ ہو جس کو خیال'' تو کیسا رہے گا۔ ابھی آپ نے شعر پڑھا تھا نا کہ

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی

تو اس وقت میرے دل میں خیال آیا تھا لیکن پھر بات اور سمت چلی گئی۔'' صدف نے رائے دی۔ فیصل کا کالم ''شاید کہ تیرے دل میں اتر جائے'' کے عنوان سے چھپتا تھا جسے بہت پسند کیا جا رہا تھا۔ اس میں وہ ہمیشہ کسی نہ کسی مسئلے پر لوگوں کی توجہ مبذول کرواتا تھا۔ اس کا لکھنے کا انداز بہت متاثر کن تھا اور اب ڈاکٹر فہد کا کالم بھی یقیناً اتنا ہی پسند کیا جائے گا۔
یہ صدف کا خیال تھا جس کا اس نے اظہار بھی کر دیا تھا۔ فہد نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور سب کو اللہ حافظ کہتا ہوا چلا گیا۔ اس کے بعد فیصل اور حامد بھی چلے گئے۔ صدف بھی چائے پی کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر آمنہ بھی اٹھی تھی۔
''آمنہ!'' اسید نے اپنا خالی کپ ٹرے میں رکھا۔
''تم نے ''فرائیڈے اسپیشل'' کے لیے ابھی تک کچھ نہیں بتایا کہ کیا لکھ رہی ہو۔ آؤٹ لائن لکھ لی ہو تو ڈسکس کر لیتے ہیں۔''
''نہیں، ابھی نہیں لکھا کچھ، شاید اس بار نہ لکھ سکوں۔''
''کیوں، خیریت ہے آمنہ! کوئی پریشانی؟''
اسید پوچھ رہا تھا۔ صدف باہر نکل گئی تھی، ابھی اسے اپنا کام مکمل کر کے عروج کا کام بھی دیکھنا تھا۔
''نہیں تو، کوئی پریشانی نہیں۔''
''کچھ تو ہے آمنہ! کیا تم میرے ساتھ شیئر نہیں کر سکتیں۔''
آمنہ نے نظریں اٹھائیں، اسید اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ آمنہ کی نظریں جھک گئیں۔
''نہیں، ایسا کچھ خاص نہیں ہے، بس یونہی شاید ملکی حالات کی وجہ سے مایوسی سی طاری ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں سے بھی کچھ اچھا سنائی نہیں دیتا۔''
''بات اگر صرف ملکی حالات کی ہے آمنہ! تو یقین رکھو ایک دن سب اچھا ہو جائے گا ان

شاء اللہ۔''
مایوسی، دل گرفتی، اداسی۔ یہ آمنہ کی شخصیت کا حصہ تو نہیں تھی۔ ملکی حالات تو پچھلے آٹھ نو سالوں سے ایسے ہی چل رہے تھے۔ مایوس کن، تکلیف دہ۔
''کچھ اور بھی ہے آمنہ! جو آپ کو پریشان کر رہا ہے۔ آپ پلیز کہہ دیں مجھ سے، شاید میں آپ کے کام آسکوں۔''
''میرا خیال ہے کچھ معاملوں میں کوئی بھی آپ کے کام نہیں آ سکتا۔'' آمنہ کے لہجے میں گہری افسردگی کی جھلک تھی۔ ''جب آپ کا اپنا دل آپ سے بغاوت کرنے لگے تو......''
''آپ کیا کر سکتے ہیں بھلا۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔
''بے چارے دل نے کیا بغاوت کر دی ہے آمنہ!'' اسید نے خوش دلی سے کہا۔
''یونہی ایک بات کی ہے۔'' آمنہ نے نظریں چرالیں۔
''آمنہ.....'' اسید اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔
''ایسا کیا مسئلہ ہے جو تم مجھ سے ڈسکس نہیں کر سکتیں۔''
''پلیز......کوئی اور بات کریں۔ میں نے بتایا تو ہے کہ ایسا بتانے لائق کچھ نہیں ہے۔''
''کوئی اور بات؟''
اسید نے بغور اسے دیکھا تو اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔ اسید کو اس کی آنکھوں میں نمی سی پھیلتی محسوس ہوئی۔ اس نے یکدم چہرہ جھکاتے ہوئے رخ موڑ لیا۔
''صدف انتظار کر رہی ہو گی۔'' اس نے یونہی جھکے اور رخ موڑے موڑے کہا۔
''کیا میں؟'' اسید نے سوچا۔ ''کیا اس کی اس بے تحاشا اداسی کی وجہ میں ہوں۔''
''کیا وہ......'' اس نے پھر اس کی طرف دیکھا، وہ سر جھکائے آنسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔
میں نے تو کبھی اس سے کچھ نہیں کہا۔ کوئی ایسی بات نہیں کی جو اس کی دل آزاری کا باعث بنی ہو۔ لیکن......
''تم سے محبت کرتی ہے اسید! اور تم اس بات کو جانتے ہو۔'' دل نے سرگوشی کی۔ ''محبت کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے، اسے سراہا جائے لیکن میں...... میں کیسے اس لڑکی سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اس کی محبت کی قدر ہے۔ میں بھی اسے چاہتا ہوں اور اگر میں کسی دروازے پر دستک دینا چاہوں تو وہ اسی کا ہو گا لیکن مسائل ذاتی نہیں اجتماعی ہیں۔ میں دو وعدوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں بیک وقت دو ذمہ داریوں کو نہیں سنبھال سکتا، میں نے محبت کا آنچل تھاما تو شاید اپنے فرائض سے کوتاہی کر جاؤں۔''
''آمنہ! بیٹھ جاؤ۔''

اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور واپس ٹیبل کے پیچھے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔
''مجھے آج تم سے کچھ کہنا ہے۔''
آمنہ نے کسی قدر حیرت سے اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے پیچھے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔
تھوڑی دیر تک وہ یونہی پیپر ویٹ کو دائیں ہاتھ سے گھماتا رہا۔ شاید کہنے کے لیے لفظ ڈھونڈ رہا تھا۔ آمنہ کبھی کبھی سر اٹھا کر اسے دیکھ لیتی تھی۔
''پتا نہیں اسید کیا کہنا چاہتا ہے اور کہہ نہیں پا رہا ہے۔''
''آمنہ! محبت ہمیشہ اپنا آپ منوا لیتی ہیں۔'' بالآخر اسید نے کہا۔
''اور محبت چھپ نہیں سکتی۔ چاہے کوئی اسے لاکھ چھپائے۔ ہزاروں پردوں میں سے بھی یہ اپنی جھلک دکھاتی رہتی ہے۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ مجھے تمہارے دل کی خبر نہیں ہے تو ایسا نہیں ہے۔ میں پتھر دل یا بے حس انسان نہیں ہوں۔ میں تم سے کچھ کہتے ہوئے اس لیے ڈرتا ہوں کہ کہیں میرے حالات مجھے اتنا بے بس نہ کر دیں کہ میں اپنے کہے لفظوں کو نباہ نہ پاؤں۔ تم......اور تمہارا دل بہت خوبصورت ہے۔ تم جیسا کوئی اور نہیں ہے۔''
اس نے ذرا سا توقف کیا۔ آمنہ سر جھکائے خاموشی سے سن رہی تھی۔
''بخدا آمنہ!'' اس نے ایک نظر آمنہ پر ڈالی۔ ''تمہاری یہ افسردگی' تمہاری آنکھوں کی یہ نمی مجھے بے چین کر دیتی ہے۔ پتا نہیں کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اس کا سبب میں ہوں۔ آمنہ! تم ہو' بہت کشادہ ظرف اور انوکھی ہو۔ میں تمہارے لائق نہیں......تمہاری محبت کے لائق......'' آمنہ نے ایک دم تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔
''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں۔ یہ فیصلہ تو کسی اور دل کا ہے کہ آپ کس لائق ہیں۔ ہاں' شاید میں آپ کے لائق نہیں۔''
آمنہ نے آج سب کچھ کہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
''لیکن میں نے آپ سے کچھ طلب نہیں کیا۔ کچھ مانگا نہیں۔ ہاں کچھ جذبوں میں آدمی بے اختیار ہوتا ہے اور میں بھی شاید بے اختیار ہو گئی تھی' سوری آئندہ آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میری آنکھوں کی نمی اور میری افسردگی سے آپ ڈسٹرب ہوئے ہیں تو میں خیال رکھوں گی کہ اب ایسا نہ ہو۔'' یہ آنسو اور یہ افسردگی محبت کی ناقدری پہ تھے۔ اس کی آواز بھرا گئی تھی' وہ یکدم کھڑی ہو گئی تھی۔
''بیٹھ جاؤ آمنہ!'' اسید کے ہونٹوں پر ایک دم مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
''بڑے بدنصیب لوگ ہوتے ہیں جو محبت کی قدر نہیں کرتے اور میں ان بدنصیبوں میں نہیں۔ تم کیا جانو' کس لائق ہو۔ تم پاس ہو تو صرف تمہیں دیکھنے اور سننے میں عمر بیت جائے۔ تم کیا جانو آمنہ! میں کب سے تمہاری محبت کے سحر میں گرفتار ہوں۔ لیکن میں نے اپنی محبت کے

پیدا شدہ احساس کو خود ہی دفن کیا' بار بار کہ میں آپ......'' وہ یکدم جذباتی ہو گیا تھا کہ آمنہ نے اسے ٹوکا۔
''پلیز اور کچھ مت کہیے گا اسید! میرے لیے آپ کا اتنا کہا ہی کافی ہے' میں خود اپنی نظروں میں معتبر ہو گئی ہوں۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے اور میں آپ سے کبھی کچھ طلب نہیں کروں گی۔ نہ آپ کی محبت اور نہ رفاقت۔ میری محبت رائیگاں نہیں ہے' آپ کو اس کی قدر ہے۔ میرے زندہ رہنے کے لیے یہ احساس ہی بہت ہے۔''
بات مکمل کرتے ہی وہ اٹھی اور تیزی سے باہر نکل گئی۔
اسید جو کچھ کہنا چاہتا تھا' حیرت سے منہ کھولے کچھ دیر دروازے کی طرف دیکھتا رہا پھر مسکراتے ہوئے ایک فائل اٹھا کر اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔

''عاشی! کیا سوچ رہی ہو؟'' صدف نے یکایک لکھتے لکھتے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔
''کچھ نہیں سوچ رہی تھی کہ یہ ہمارے ملک کے مقدر میں ہمیشہ انوکھے اور نایاب قسم کے لیڈر ہی کیوں آتے ہیں۔''
''ہاں یہ تو ہے' ہم ہمیشہ آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جاتے ہیں۔'' عروج نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔
''جمہوریت' جمہوریت' الیکشن کتنا ''رولا'' تھا اور ہم بھی سمجھ رہے تھے کہ ادھر جمہوری حکومت قائم ہوئی' ادھر سب دلدر دور۔
وہی ہے چال بے ڈھنگی جو پہلے تھی سو اب بھی ہے''
''یار! ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ سال ہی تو ہوا ہے نئی حکومت کو۔'' صدف نے مسکرا کر عروج کی طرف دیکھا۔
''پوت کے پاؤں پالنے میں۔'' عاشی کے لہجے میں تلخی تھی۔ ''نظر تو آ رہا ہے کہ سب کیا جا رہا ہے اور کس کی ایماء پر۔''
''یار عاشی! یہ آج تم اتنی سنجیدہ کیوں ہو رہی ہو؟'' آمنہ نے بھی لکھنا چھوڑ کر قلم دانتوں تلے دباتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔
''یونہی......'' عاشی نے افسردگی سے کہا۔ ''آج دل بہت اداس ہے۔ جب جب خبریں سنتی ہوں کہ آج امریکی جاسوس طیارے نے وزیرستان میں میزائل گرایا۔ اتنے بندے مر گئے۔ آج سیکورٹی فورسز پر حملہ ہوا' اتنے شدت پسند مارے گئے۔ سوات کے اندر آگ لگی ہوئی ہے' لاکھوں لوگ بے گھر ہیں۔ آج باجوڑ......او مائی گاڈ! آمنہ! مجھے لگتا ہے میں پاگل ہو جاؤں گی۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ سب کیا ہے' کیوں ہے؟ ہم اپنے ہی شہریوں کو

کیوں قتل کررہے ہیں' کیوں ان کے خون سے ہولی کھیل رہے ہیں' نیٹو افواج قبائلی علاقوں میں کیوں حملے کررہی ہیں؟ ہم اپنی ہی سرحدوں کو کیوں کمزور کررہے ہیں؟ آمنہ! مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آمنہ چند سال پہلے تک تو یہاں اس ملک میں کوئی دہشت گرد نہیں ہوتے تھے۔ اب یکا یک یہ سارے دہشت گرد کہاں سے پیدا ہوگئے۔ کیا کسی جادو کے زور سے زمین سے اگ آئے ہیں۔''

''دراصل یہ اسامہ کی تلاش میں قبائلی علاقوں میں حملے کررہے ہیں۔'' عروج نے عاشی کو مطمئن کرنا چاہا۔

''تورا بورا کی پہاڑیوں کے پتھر تک پگھل گئے امریکی بمباری سے لیکن اسامہ بچ گیا' کیسے عروج بی بی!''

صدف نے عروج کو مخاطب کیا۔

''اندرون خانہ کہانی کچھ اور ہے۔ مختصراً یہ سمجھ لو کہ امریکہ' پاکستان کے بے پناہ ذخائر کا بلاشرکت غیرے مالک بننا چاہتا ہے۔ اس کا اصل ہدف اسلام ہے۔ وہ تمام عالم اسلام کے ذخائر کو اپنے تصرف میں لانا چاہتا ہے۔ عراق پر حملہ' افغانستان پر' اب ایران اور پاکستان اس کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔''

عاشی الجھی الجھی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے اب بھی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ امریکہ کو آخر تکلیف کیا ہے۔ وہ خود اتنا امیر ملک ہے۔ ہمارے ملک سے لوگ بھاگ بھاگ کر پیسہ کمانے وہاں جاتے ہیں۔ اسے پھر کیوں اتنا لالچ ہے۔''

عاشی سوالیہ نظروں سے صدف کو دیکھ رہی تھی' جب حامد کاغذوں کا پلندہ اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔

''کیا ہورہا ہے خواتین؟''

''فی الحال تو عاشی کی الجھن دور کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔'' صدف نے حامد کو ساری تفصیل بتائی۔

''صدف نے صحیح کہا کہ امریکہ نے بہت پہلے یہ پلان کرلیا تھا کہ اسے خود کو مضبوط بنانے کے لیے تیسری دنیا کا استحصال کرنا اور ان کے ذخائر پر قبضہ کرنا ہے۔ جو کچھ قبائلی علاقوں میں ہورہا ہے' وہ بھی ایک منظم منصوبے کے تحت ہورہا ہے۔''

''آپ لکھنے والے صحافی' قلم کار سب جانتے ہیں تو پھر اسے لکھتے کیوں نہیں ہیں۔ بتاتے کیوں نہیں لوگوں کو امریکہ کے عزائم۔'' عاشی نے حامد کو ٹوک دیا۔

''کئی ویب سائٹ ایسی ہیں جہاں سے تمہیں ان اسلام دشمن لوگوں کی سازشوں کا پتا چلے گا' یوں لگتا ہے جیسے ساری دنیا اسلام کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔''

''تو یہ جو ہمارے لیڈر ہیں' ہمارے سربراہ ہیں' یہ نہیں پڑھتے۔ یہ سب جو امریکہ کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہیں۔ حامد! آپ ان سارے مضامین اور تجزیوں کی کٹنگ انہیں بھجوا دیں تو شاید پڑھ کر انہیں بھی پتا چل جائے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔''

عاشی نے معصومیت سے کہا تو سب کے لبوں پر ہی مسکراہٹ آگئی۔

''ہمارے لیڈر اپنی آنکھیں اور کان بند رکھتے ہیں' تمہیں علم نہیں ہے کیا؟'' صدف نے کہا۔

''پگلی! سب جانتے ہیں اور سب کچھ ان کے علم میں ہے' کیا ہماری ایجنسیوں نے انہیں خبر نہیں دی ہوگی۔ انتہا پسندوں کے پاس جدید اسلحہ کہاں سے آیا ہے' کون ان کی پشت پناہی کررہا ہے؟''

حامد نے کاغذوں کا پلندہ میز پر رکھا اور خود کرسی پر بیٹھتے ہوئے عاشی سے مخاطب ہوا۔

''کون کررہا ہے؟'' عاشی نے پوچھا۔

''امریکہ......''

حامد کا جواب تھا۔ اور ہماری ایجنسی نے یہ حقیقت جان لی تھی۔ ایک بار نشاندہی کے باوجود امریکی ڈرون نے دہشت گردوں پر نا صرف یہ کہ اس پر فائر نہ کیا بلکہ اس کو اپنے سیٹلائٹ کمیونیکیشن سے لاک کردیا تاکہ کوئی اور نقصان نہ پہنچا سکے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ ان لوگوں کو سی آئی اے نے تحفظ دے رکھا ہے اور امریکی تعاون حاصل ہے اسے۔ اور ہماری ایجنسی کی مخالفت بھی اسی سبب ہے کہ اس نے اصل حقیقت جان لی ہے۔'' عاشی حیرت سے منہ پھاڑے حامد کو دیکھ رہی تھی۔

''باجوڑ' سوات' فاٹا' بلوچستان ہر جگہ یہ...... یہی لوگ ہیں جو خودکش حملے کررہے ہیں۔ را' خاد' موساد اور سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں' سب ملک میں افراتفری پھیلا کر اسے توڑنا چاہتے ہیں۔'' حامد کے لہجے میں نفرت تھی۔

''تم کیا جانو عاشی! یہ کیسے چاروں طرف سے ہم پر حملہ آور ہوچکے ہیں۔

ایک طرف تو یہ دہشت گردی کا سلسلہ ہے۔ دہشت گردی کے نام پر کتنے ہی بے گناہوں کا خون بہایا جاچکا ہے۔ دوسری طرف ہماری معیشت پر حملہ کیا جاچکا ہے۔ ہر طرح سے ہماری معیشت کو تباہ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہمارا بے چارہ کاشت کار...... اسے تباہ کرنے کی سازش' وقت پر ان سے دھان نہیں خریدا گیا۔ کپاس بونے والے الگ رو رہے ہیں۔ کیوں دھان نہیں خریدا گیا' وقت پر کہ وہ رقم حاصل کرکے گندم کی بوائی کرسکیں۔ کیوں کھاد مہنگی کی گئی۔ کیوں گندم گوداموں میں پڑے پڑے خراب ہوگئی۔ آنے والا وقت بتائے گا کہ یہ سب سازشیں کہاں اور کس جگہ بیٹھ کر تیار کی جارہی ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے ملک کو قحط اور

مہنگائی سے دوچار کرنے کے لیے کیا کیا جارہا ہے۔ دریاؤں کا پانی بند کردیا گیا۔ ہماری زمینیں بنجر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔''

''آج کی تازہ خبر۔ آج کی تازہ خبر!'' سعید اخبار ہاتھ میں لہراتا اندر داخل ہوا۔

''کیا ہوا' کیا امریکہ نے پاکستان پر حملہ کردیا۔'' عاشی نے بوکھلا کر پوچھا۔ اس کے ذہن میں ابھی تک حامد کی باتیں گونج رہی تھیں۔

''امریکہ' پاکستان پر کب کا حملہ کرچکا ہے مائی ڈیر کزن!''

سعید نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور کونے میں پڑی ٹیبل سے فائلوں کا ڈھیر ہاتھ سے پیچھے کرتے ہوئے اس پر بیٹھ گیا۔

''تم ہمیشہ ٹیبل پر ہی کیوں بیٹھتے ہو۔'' صدف نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں کسی ایسی چیز پر نہیں بیٹھنا چاہتا جس سے چپک جانے کا خطرہ ہو۔''

سعید نے لاپروائی سے کہتے ہوئے عاشی کی طرف دیکھا۔

''تو عاشی ڈیر! تمہاری بے نیازی پر حیرت ہورہی ہے۔ کتنے سال ہوگئے ہیں امریکہ کو ہمارے ملک میں دراندازی کرتے اور تم اتنی معصوم ہو کہ تمہیں خبر ہی نہیں۔''

''لیکن وہ حملہ تو نہیں ہے نا۔''

''یار! اور حملہ کسے کہتے ہیں۔ دندناتا پھر رہا ہے امریکہ' میاں جب جی چاہتا ہے اس کے ڈرون آکر میزائل گرا کر چند بندے پھڑکا جاتے ہیں۔ ابھی تو قبائلی علاقے اس کی زد پر ہیں' دیکھنا کسی روز اس کا کوئی ڈرون یہاں بھی میزائل پھینک جائے گا۔ اسامہ بن لادن یا کسی دہشت گرد کے بھلاوے میں اور ہم احتجاج کا ڈرامہ کردیں گے بس؟'' عاشی کی رنگت زرد ہوگئی۔

''کیا وہ سچ مچ ادھر آسکتے ہیں۔''

''تم میڈیا کی طرح خوامخواہ ہراس نہ پھیلاؤ۔ سعید!'' صدف نے اسے ٹوکا۔

''ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ہمیں کتنا مضبوط کردیا تھا۔ ایٹمی طاقت تھے ہم۔''

''ہم اب بھی ایٹمی طاقت ہیں۔'' حامد نے کہا۔

''پتا نہیں' مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے ہم نے ایٹم بم بھی امریکہ کے حوالے نہ کردیے ہوں۔''

''مجھے تو فیصل کے ساتھ جانا تھا' یہاں ہی آکر بیٹھ گیا۔'' حامد کھڑا ہوگیا۔

''کہاں جارہے ہو تم؟''

''یار! ایک بندے کا انٹرویو لینا تھا۔''

''پچھلے دنوں وہ خبریں آرہی تھیں نا کہ فلاں اسپتال' فلاں ڈاکٹر گردوں کی چوری میں

ملوث ہیں تو مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ مسیحا قاتل کیسے بن سکتا ہے۔ تو فون آیا تھا ایک بندے کا بے چارہ اسپتال میں گیا پیٹ میں درد تھا' ڈاکٹر نے کہا اپنڈکس ہے' آپریشن کرنا پڑے گا۔ پرائیویٹ کلینک تھا۔ آپریٹ کروایا' ڈاکٹر نے ایک گردہ بھی نکال لیا جس کا انکشاف اتفاق سے دو ہفتے بعد ہی ہوگیا کیونکہ اسے اچانک یورین پرابلم ہوگیا تھا۔ پتا چلا ایک گردہ ہی غائب ہے۔'' حامد نے تفصیل بتائی۔

''میں تو اپنے پیشے پر شرمندہ ہوتا ہوں' ایسی ایسی کہانیاں پڑھ کر۔'' سعید نے شرمندگی سے کہا۔

''کہانیاں نہیں' حقیقت۔''

آمنہ نے جو بہت دیر سے خاموش بیٹھی تھی کہا۔

''ہمارے ملک کے یہ حالات ہورہے ہیں۔ امریکہ دانت گاڑے بیٹھا ہے اور بھارت اور اسرائیل بھی اپنے پنجے تیز کیے اسے نگلنے کو تیار ہیں اور ہمارا لالچ اور ہوس ختم نہیں ہورہی۔ ہمارا ملک...... ہمارا پاکستان اگر اسے کچھ ہوگیا تو ہم کیا کریں گے' کہاں جائیں گے آمنہ!''

''یہ ملک...... یہ پاک سرزمین حکومت کرنے والے ان چند ہزار لوگوں نے حاصل نہیں کی۔ ارے یہ تو اللہ کا معجزہ ہے اور اسے بنانے والے اللہ کے بعد اس کے عوام ہیں اور وہی اسے قائم رکھیں گے۔ ان شاء اللہ جان دے دیں گے' مرجائیں گے' اس کی حفاظت کے لیے۔'' خدا بخش چاچا جانے کب اندر آئے تھے۔

بزرگ آدمی تھے' چند ماہ پہلے ہی یہاں آئے تھے۔ کچھ عرصہ انہوں نے حسین احمد کے دفتر میں بھی کام کیا تھا۔ انہوں نے پاکستان کو اپنی آنکھوں سے بنتے دیکھا تھا۔

عاشی کے دل کو خدا بخش چاچا کی بات سے حوصلہ سا ملا تو اس نے اچھی طرح سے اپنا چہرہ ہاتھوں سے صاف کیا' پلکیں ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔

''فیصل صاحب آپ کا انتظار کررہے ہیں حامد بیٹا!''

''ہاں بس آرہا ہوں۔'' دونوں ہی آگے پیچھے باہر نکل گئے تو عاشی نے سعید سے پوچھا۔

''تم اسپتال سے آرہے ہو۔''

''ہاں......''

''گھر جاؤ گے اب......''

''ہاں......'' سعید نے سر ہلادیا۔

''مجھے بھی لے جانا۔''

''ویسے تم آئی کیوں ہو۔ نہ کام نہ کاج' خوامخواہ انہیں بھی آکر ڈسٹرب کرتی ہوگی اور آنے جانے کا خرچا الگ۔''

''میرا بھی جی چاہتا ہے کہ میں کچھ کروں اس ملک کو غاصبوں سے بچانے کے لیے لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

''تم بس دعائیں کرتی رہو' یوں ہی آنسو بہا بہا کر بارگاہ ایزدی میں' کبھی تو شنوائی ہوگی۔'' سعید لمحہ بھر کے لیے سنجیدہ دکھائی دیا تھا۔

''خالی دعاؤں سے تو کچھ نہیں ہوتا نا سعید!''

''تو پھر اور کیا کرنا چاہتی ہو۔''

''یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''چلو ایسا کرتے ہیں' ہم دونوں مل کر ایک پارٹی بناتے ہیں۔ ق لیگ' م لیگ' ن لیگ وغیرہ تو ہیں۔ ہم اپنی پارٹی کا نام ذرا بھاری بھرکم رعب دار سا رکھیں گے۔ سعید اینڈ عاشی لیگ۔ واؤ کیا فنٹاسٹک نام ذہن میں آیا ہے۔''

عاشی نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ صدف نے لکھتے لکھتے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

''تم ڈاکٹر فہد سے کب ملے تھے سعید؟''

''آج ہی بلکہ ابھی چند گھنٹے پہلے لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں' کوئی کام تھا کیا؟''

''نہیں بس یونہی۔ بہت دن سے آئے نہیں ادھر تو میں نے سوچا کہ شاید ادھر نہیں ہیں۔''

صدف بات کر کے پھر لکھنے لگی تھی اور سعید نے بغور اس کے چہرے کے تاثرات کو جانچا تھا۔ بالکل سپاٹ۔ فہد کا ذکر کرتے ہوئے چہرے پر نہ کوئی رنگ دمکے تھے' نہ آنکھوں میں کوئی چمک آئی تھی۔ تو گویا فہد میاں کا دل پتھروں میں الجھ گیا ہے اور شاید صدف اب بھی احمر کی محبتوں کے حصار میں رہتی ہے۔ تب ہی تو ڈاکٹر فہد کی آنکھوں کے رنگ پہچان نہیں پائی اور فہد اس کی محبت میں ''گوڈے گوڈے'' ڈوب چکا ہے۔

آمنہ نے کلپ بورڈ سے کاغذ الگ کیے اور میز پر پڑے کچھ کاغذ سمیٹتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

''ارے آمنہ جی! یہ آپ کہاں چل دیں' اتنے دنوں بعد تو ہم آئے ہیں۔ کچھ خاطر تواضع' کچھ چائے پانی تو پوچھ لیں۔'' سعید نے چونک کر آمنہ کی طرف دیکھا۔

''میں ذرا اسید کے کمرے میں جا رہی ہوں' ابھی آتی ہوں۔ تم جانا نہیں' میں چائے کا کہہ جاتی ہوں چھوٹے کو۔''

جب سے اسید نے محبت کا اعتراف کیا تھا' آمنہ کے چہرے پر رنگ ہی رنگ بکھرے رہتے تھے اور وہ بے حد خوبصورت ہوگئی تھی۔ اعتماد' یقین اور محبت ان سب نے مل کر اس کے حسن میں جیسے رنگ بھر دیے تھے۔

''آمنہ بہت پیاری ہوگئی ہے صدف! ہے نا۔''

''پیاری ہوگئی کیا' وہ تو ہمیشہ سے پیاری ہے۔''

صدف نے لکھتے لکھتے عاشی کی بات کا جواب دیا اور آمنہ نے باہر نکلتے ہوئے دونوں کی بات سنی تو اس کے لبوں پر ایک دل فریب سی مسکراہٹ بکھر گئی۔ یہ سب محبت کا اعجاز ہے' جس نے عام سی آمنہ کو خاص بنا دیا ہے۔

اسید کمپیوٹر کے سامنے بیٹھا تھا جب آمنہ دستک دے کر اندر داخل ہوئی تو ریوالنگ چیئر کو گھماتے ہوئے اسید نے آمنہ کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

''ہاں تو تیار ہوگئے تمہارے آرٹیکل۔ کیا لکھا ہے۔''

''ابھی کوئی چیز کمپلیٹ نہیں ہے' مجھے آپ سے ڈسکس کرنا تھا۔''

''ہاں ضرور' کیا مسئلہ ہے۔ بیٹھ جاؤ۔'' آمنہ سائیڈ پر رکھی چیئر پر بیٹھ گئی۔

''میں نے کچھ ٹاپک سلیکٹ کیے ہیں اور ان پر مرحلہ وار لکھنا چاہتی ہوں۔ میڈیا بھی اس میں شامل ہے' پرنٹ میڈیا تو بہر حال کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ کر ہی رہا ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا نے تو اسلامی اقدار کے پرخچے ہی اڑا دیے ہیں اور میں سمجھتی ہوں کہ آج کل کے دور میں الیکٹرانک میڈیا قوم کو بگاڑ بھی سکتا ہے اور سنوار بھی۔

میں ایک بات بتاؤں' کل کی بات ہے۔ پڑوس سے ایک بچہ ہمارے گھر آیا ہوا تھا' بمشکل چار سال کا ہوگا۔ میں نے اس کے مانگنے پر اسے پانی دیا۔ وہ کھڑا ہوا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں گلاس پکڑے وہ بیٹھ گیا اور اس نے بیٹھ کر پانی پیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کے گھر میں اسے بتایا گیا کہ پانی بیٹھ کر پیو۔ ہمارا میڈیا' ہمارا نصاب' ہم جو کچھ انہیں دیں گے وہ وہی سیکھیں گے۔ لیکن ہم تو انہیں صرف ناچ گانا' دیوی دیوتاؤں کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا ہی سکھا رہے ہیں نا۔''

اسید نے ایک ستائشی نظر اس پر ڈالی اور لمحہ بھر کو اس کی نظریں اس کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ دل نے چاہا کہ وہ کچھ دیر یونہی اس چہرے کو اپنی نظروں میں بسائے رکھے لیکن دل کی خواہش کو رد کرتے ہوئے اس نے اپنی نظریں اس کے چہرے سے ہٹا لیں۔

''بہت اچھا خیال ہے ضرور لکھو' ہماری قوم کے ہر فرد کو آگاہی کی ضرورت ہے۔ فی الحال تم میڈیا کے حوالے سے لکھا اپنا یہ آرٹیکل مکمل کر لو۔''

''لیکن ہر فرد اخبار تو نہیں پڑھتا۔''

بے اختیار آمنہ کے لبوں سے نکلا تو اسید کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''تم نے آج عاشی جیسی بات کی آمنہ! ہمارا کام آگاہ کرنا ہے' سب نہ سہی کچھ تو آگاہ ہوں گے۔''

آمنہ نے سر ہلا دیا اور ہاتھ میں پکڑے کاغذات ٹیبل پر رکھے۔ ''میں نے کچھ پوائنٹ لکھے

ہیں' آپ ایک نظر دیکھ لیجئے گا۔''

''میرے خیال میں اس کی ضرورت تو نہیں اب۔ تم لکھنے کا ہنر جانتی ہو' بہر حال تمہاری تسلی کے لیے دیکھ لوں گا۔'' آمنہ اٹھ کھڑی ہوئی اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

''آمنہ......'' بے اختیار ہی اسید کے لبوں سے نکلا تھا۔ ''کچھ دیر بیٹھو نا۔''

آمنہ جھجک کر رک گئی۔ اگرچہ اس روز کے بعد اسید کے اور اس کے درمیان محبت کے موضوع پر کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ عام روٹین کی گفتگو' کسی ایشو پر' اخبار کے حوالے سے کسی آرٹیکل کے متعلق لیکن ایک دوسرے کی موجودگی کا احساس دونوں کے دلوں میں انہونی خوشی کا احساس بن کر دھڑکتا رہتا تھا۔

''تم آمنہ! کیا چیز ہو۔ تمہارا جادو مجھے خوف زدہ رکھتا تھا' میں تم سے بھاگتا تھا کہ کہیں اس سحر میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ لیکن اب جی چاہتا ہے کبھی نہ نکلوں۔ تم میرے سامنے بیٹھی رہو اور میں اس محبت کے سحر میں گم ہو جاؤں۔''

اسید نے گہری سوچوں کو جھٹک کر آمنہ کی طرف دیکھا۔

''بیٹھ جاؤ نا آمنہ!''

وہ پُرشوق نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اور آمنہ جھجکتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

***

''غلام فریدا دل او تھے دیئے' جتھے اگلا قدر پچھانے۔'' (غلام فریدا دل اس جگہ دینا چاہیے، جہاں اگلا اس کی قدر پہچانے۔)

دھوپ میں کرسی پر نیم دراز آنکھیں موندے سعید گنگنا رہا تھا۔ کبھی کبھی آنکھیں کھول کر کن انکھیوں سے عاشی کو بھی دیکھ لیتا تھا' جو آمنہ کی کرسی کے ہتھے پر بیٹھی ہولے ہولے اس کے کان میں کچھ کہہ رہی تھی۔

آج چھٹی کی وجہ سے اخبار کا آفس بند تھا اور آمنہ کو عاشی کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانا تھا۔ عاشی کو اپنی شادی کی تیاری کے سلسلے میں شاپنگ کرنا تھی۔

''یار! کس کو دل دیا ہے۔'' ڈاکٹر فہد نے بیٹھک سے باہر نکل کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ جب سے اسید کو پتا چلا تھا کہ ڈاکٹر فہد کے خاندان کے سب افراد زلزلے میں ختم ہو گئے تھے' فہد اپنی پڑھائی کے سلسلے میں لاہور تھے اور باقی خاندان مظفر آباد میں۔ وہ ڈاکٹر فہد کو ہر ویک اینڈ پر گھر لے آتا تھا اور ڈاکٹر فہد بھی اس گھریلو ماحول میں اپنا دکھ بھول جاتا تھا۔

''ہمیں تو موقع ہی نہیں ملا دینے کا' وہ کیا کہتے ہیں کہ اڑنے بھی نہ پائے تھے کہ گرفتار ہوئے ہم......'' اس نے کن انکھیوں سے عاشی کی طرف دیکھا۔

''تو آزاد کر لو خود کو۔'' عاشی کو بلا سوچے سمجھے بولنے کی عادت تھی۔

''تو اجازت ہے۔''

''بکو مت......'' عاشی نے اپنے مخصوص انداز سے کہا اور کھڑی ہو گئی۔

''فہد بھائی! آپ کے لیے چائے بناؤں۔''

''نہیں' یہ اسید کہاں ہے؟''

''دادا جان کے پاس ہیں۔'' سعید نے جواب دیا۔ ''تم تو چائے پیو گی نا؟'' عاشی نے آمنہ سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ اٹھ کر عاشی کے پیچھے کچن میں چلا گیا۔ آمنہ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اسے عاشی اور سعید دونوں ہی بے حد عزیز ہو گئے تھے۔ سعید کے برجستہ جملے' شستہ مذاق' سنجیدہ سے سنجیدہ صورتِ حال میں بھی مسکرانے پر مجبور کر دیتے تھے۔

کل دادی جان کا پیغام اسید نے دیا تھا کہ وہ عاشی کے ساتھ جا کر اس کی پسند کے کپڑے وغیرہ لے لے۔ ان کا ارادہ عید کے بعد سعید اور عاشی کی شادی کا تھا۔ یوں وہ ناشتہ کر کے گھر سے نکلی تھی۔ وحید' عاشی کو بلا لایا تھا۔ چونکہ دادی جان نفل پڑھ رہی تھیں اس لیے وہ برآمدے میں ہی بیٹھ کر سعید سے باتیں کرنے لگی تھی۔

آمنہ نے جھک کر چارپائی سے اخبار اٹھایا اور دیکھنے لگی۔ تب ہی اسید ڈاکٹر فہد کے ساتھ باتیں کرتا ہوا کمرے سے نکلا۔

''اوکے فہد! پھر جلد آنا' پھپھو نے آج نہاری بنائی ہے' کھانا ادھر ہی کھانا۔ پھپھو بھجوا دیں گی ادھر۔''

فہد کو خدا حافظ کہہ کر وہ چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''گھر میں سب ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے آمنہ کی طرف دیکھا۔

''ہاں......''

''آمنہ! عاشی کہہ رہی تھی' تم نے افسانے لکھنے چھوڑ دیے۔ کیوں......لکھا کرو۔''

''ان حالات میں جب ملک میں اتنی مہنگائی ہے' اتنے لوگ مارے جا رہے ہیں ہر روز اور اس ملک کے خلاف سازشوں کے جال بنے جا رہے ہیں۔ میرا یہ رومانٹک افسانے لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ویسے......'' اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اسید کو دیکھا۔

''آپ مرد حضرات خاص طور پر لکھاری مرد تو خواتین کے پرچوں میں چھپنے والی کہانیوں' افسانوں کا بڑا مذاق اڑاتے ہیں بلکہ انہیں پڑھنا توہین سمجھتے ہیں۔''

''نہیں' ایسا نہیں ہے۔ میں نے چند ایک کہانیاں پڑھی ہیں' بہت اچھا اور خوبصورت لکھ رہی ہیں خواتین۔''

''اور میری کوئی کہانی پڑھی آپ نے؟'' آمنہ نے اشتیاق سے پوچھا۔

''تمہارا ہر لفظ' تمہاری ہر تحریر بہت جمیل ہے۔ دل میں اتر جاتی ہے تمہاری طرح اور رگوں میں سرایت کر جاتی ہے۔'' آمنہ کے رخسار شفق رنگ ہو گئے۔

''تمہاری طرح......''

دل نے دہرایا تو شفق کے رنگ گہرے ہو گئے۔ اسید دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا' جب عاشی کچن سے ٹرے اٹھائے باہر آئی' سعید اس کے ساتھ تھا۔ سعید نے پلاسٹک کی ''تپائی'' اٹھا کر آمنہ کے سامنے رکھی اور عاشی نے ٹرے اس پر رکھ دی۔ سعید' اسید کے ساتھ ہی چارپائی پر بیٹھ گیا تھا۔

''آج کل الیکٹرانک میڈیا زیادہ پاورفل ہے۔ رات فہد بھائی کہہ رہے تھے کہ ہمیں اپنے نصب العین کو' اپنے خیالات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے الیکٹرانک میڈیا کا استعمال کرنا چاہیے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنا چینل ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے اسید! تمہارے لیے ایسا Possible (ممکن) ہے کہ تم ایک چینل لانچ کر سکو۔'' سعید نے چائے کا کپ اسید کو اٹھا کر دیتے ہوئے پوچھا۔

''فہد صحیح کہتا ہے کہ میں بہت دنوں سے سوچ رہا ہوں اس کے متعلق۔ اخبار کتنے لوگ پڑھتے ہوں گے' کتنے لوگوں کو وہ آگاہی ہوتی ہوگی جو ہم دے رہے ہیں لیکن ٹی وی تو ہر کوئی دیکھتا ہے' میں بہت دنوں سے اس پر ورک کر رہا ہوں لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں ہے' اس میں کچھ وقت لگے گا۔'' اسید نے بتایا تو عاشی نے فوراً ہی کہا۔

''آپ یہ چینل کا کام رہنے ہی دیں اسید بھائی! زہر لگتے ہیں مجھے یہ سب میڈیا والے۔''

''ارے ارے کیوں عاشی گڑیا! ان بے چاروں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔'' اسید نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''میرا کیا بگاڑنا ہے لیکن ملک و قوم کا بہت کچھ بگاڑ رہے ہیں۔''

''تو قوم ایسے بے ہودہ پروگرام نہ دیکھے نا' جو دوسرے ممالک دکھا رہے ہیں۔''

''اول تو یہ کہ حکومت کا کام ہے کہ ایسے فضول اور بے ہودہ چینل بند کر دے جو ہماری اسلامی شناخت کی نفی کرتے ہوں۔ قوم کو تو مفت میں دیکھنے کو سب کچھ ملے گا تو وہ تو دیکھیں گے۔'' عاشی' سعید کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

''لیکن' میرا مطلب ان بے ہودہ چینل سے نہیں تھا۔ ہمارے اپنے چینل بھی ان سے کم نہیں رہے۔ اب میں تو میڈیا کے عمومی کردار کی بات کر رہی ہوں۔''

''کیا مطلب......؟'' اسید نے دلچسپی سے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ ہمارا میڈیا منفی کردار ادا کر رہا ہے لیکن بہت ساری باتوں کی طرح ہمیں اس کا احساس نہیں ہے اور ہم خواہ مخواہ ہی تعریفوں کے ڈونگرے برساتے رہتے ہیں ان پر۔''

''تم یہ ''اونگے بونگے'' پروگرام دیکھنے کے بجائے سنجیدہ پروگرام دیکھا کرو عاشی! مثلاً ٹاک شوز' انٹرویوز سیاسی ڈسکس وغیرہ۔'' سعید نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے مشورہ دیا۔

''سب دیکھ رکھے ہیں میں نے۔'' عاشی نے جل کر کہا۔ ''جتنا ٹی وی میں دیکھتی ہوں' اتنا تم میں سے کبھی کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔ تمہارے اس میڈیا نے مجھے بے حد مایوس کیا ہے۔ انتہائی غیر ذمہ دار انٹرویو لینے والے ہیں' انہیں تو بات کرنے کی تمیز نہیں' جیسے لڑ رہے ہوں۔ اپنی معلومات صفر' اردو تلفظ غلط اور......''

اس نے ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ نیچے رکھا اور تلخی سے بولی۔

''جن دنوں مسجد حفصہ کا مسئلہ ہوا تھا تو میں ایک منٹ کے لیے بھی ٹی وی کے سامنے سے نہیں ہٹی تھی اور تمہارے یہ میڈیا کے لوگ صرف کمنٹری کر رہے تھے۔ یہ ہو رہا ہے...... وہ ہو رہا ہے' معاملہ ختم کریں...... خدا کی قسم اسید بھائی! اگر یہ میڈیا والے ذمہ داری کا ثبوت دیتے اور مثبت انداز میں تبصرہ کرتے کہ یہ سب جو کیا جا رہا ہے غلط ہے' صحیح نہیں ہے' اسے فوراً ختم ہونا چاہیے تو کبھی بھی معصوم بچیاں اتنی تعداد میں شہید نہ ہوتیں۔'' وہ یکدم جذباتی ہو گئی تھی۔

''لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں نا سنسنی پیدا کر کے خوش ہونے والے تو یہ بھی ایسے ہی ہیں۔ بچیوں کی شہادت کا ذکر نہیں ہو رہا تھا' لگتا تھا جیسے کرکٹ میچ کی کمنٹری کی جا رہی ہو۔ اور تاریخ کے صفحوں پر دنیا کی تاریخ کا سیاہ ترین باب رقم ہو رہا تھا۔ ایک ریاست' ایک حکومت کا چند ہزار بچیوں پر وہ بھی چھ' سات سال سے چودہ' پندرہ سال کی عمر کی بچیوں کے خلاف آپریشن۔'' اس کی آواز بھرا گئی تھی اور آنکھیں چھلک جانے کو بے تاب ہو رہی تھیں۔

''کیا میڈیا والے نہیں جانتے تھے کہ دو تین بندوں کو گرفتار کرنا حکومت کے لیے مشکل نہیں ہے' اس کے لیے اتنا ظلم؟ حکومت کے ساتھ ان بچیوں کے مجرم ہیں یہ سب۔'' عاشی کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی تھی۔ آمنہ نے بے اختیار اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور ہولے ہولے تھپکنے لگی۔

''الیکٹرانک میڈیا کے لوگوں کو خود اندازہ نہیں تھا کہ ایسا کچھ ہو جائے گا۔ وہ سمجھتے تھے کہ تھوڑی گولیاں چلیں گی اور بس۔'' سعید نے رائے دی لیکن عاشی یونہی آمنہ کے کندھے سے لگی سسکتی رہی۔

''ناؤ ریلیکس عاشی!''

اسید نے پرسوچ انداز میں عاشی کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا۔ اس کی پیشانی کی لکیریں بتا رہی تھیں کہ وہ کسی گہری سوچ میں ہے۔

''اور بعد میں......'' عاشی نے آنسو پونچھتے ہوئے سعید کی طرف دیکھا۔ ''یہ صحافی...... اور یہ میڈیا والے رونے لگے کہ غلط ہو گیا سب۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ معصوم لڑکیوں کی کہانیاں

لکھی جانے لگیں۔

وہ تو چپ چاپ جل کر راکھ ہو گئیں' بلاوجہ' بے قصور...... وہ غلط تھے مانا۔ تمہارا میڈیا بھی تو آزادی کو پسند کرتا ہے' ان کی نظروں میں بھی تو مذہبی اور دینی لوگ کھٹکتے ہیں' اسی لیے چند شخص آکر ڈٹ جاتے' سڑکوں پر نکل آتے' میڈیا والے شور مچاتے تو...... تو یہ آپریشن ہوتا پھر بھی۔''

وہ سانس لینے کو رکی۔

''جہاں کہیں دھماکہ ہوتا ہے' ان کی رننگ کمنٹری شروع ہو جاتی ہے۔ بے حس انداز میں اکثر غلط انفارمیشن۔ انہیں تو یہ تک معلوم نہیں کہ کون سی بات ہائی لائٹ کرنا ہے اور کون سی بات کا سرسری ذکر کرنا ہے۔ نہ انہیں پاکستان کی عزت کا خیال ہے نہ وقار کا۔ غلط بات کی تردید کرنے کے بجائے اسے اچھالیں گے' جھوٹ کو بار بار بولا جائے تو وہ سچ لگنے لگتا ہے اور یہ بھی غیر ملکی چینلز پر بولے گئے جھوٹ کو اتنی بار دہراتے ہیں کہ وہ سچ لگنے لگتا ہے۔ اگر آپ کے چینل نے بھی یہی کچھ کرنا ہے تو مت شروع کریں یہ چینل۔

"I hate this media"

اس نے ٹیبل پر پڑا چائے کا کپ اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں ٹھنڈی چائے پی لی۔

''یار عاشی! تم تو بہت بدگمان ہو رہی ہو۔ حالانکہ سب ایسے نہیں ہیں' بہت سے صحافی ایسے ہیں جو بے لاگ تبصرہ کرتے ہیں۔ بغیر کسی خوف اور ڈر کے۔ میں تو خود کئی پروگرام بہت شوق سے دیکھتا ہوں۔'' سعید نے اس کی بدگمانی دور کرنے کی کوشش کی۔

''میں تو ایک عام شہری ہوں۔ تمہاری طرح بہت ایجوکیٹڈ نہیں ہوں۔ میری سوچ بھی میری طرح عام ہے۔ ہو سکتا ہے میں غلط ہوں لیکن کیا رائٹر اور کیا صحافی اخبار میں لکھ رہے ہیں یا ٹی وی چینلز پر آ رہے ہیں' سب مجھے ڈاکٹر جلیبی لگتے ہیں۔'' عاشی نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے۔

اسید کے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کچھ بھی ہے سعید! ہمارے عوام اب اتنے باشعور ہیں کہ وہ ''ڈرامے'' اور حقیقت کا فرق محسوس کرتے ہیں۔ اسے جھوٹ اور سچ میں بھی فرق کرنا آتا ہے۔ عاشی کی بات اور خیالات نے مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ بات تمہیں ماننی پڑے گی کہ ہمارے ہاں میڈیا والوں میں احساس ذمہ داری نہیں ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ میڈیا بہت پاورفل ہوتا ہے۔ تاہم کچھ لوگ ایسے ضرور ہیں جنہیں سلام کرنے کو دل چاہتا ہے۔'' اسید بات ختم کر کے کھڑا ہو گیا۔

''او کے' مجھے جانا تھا' عاشی کی باتوں میں دیر ہو گئی۔''

''کہاں؟'' سعید نے پوچھا۔ ''اخبار کا آفس تو بند ہے آج۔''

''ہاں' کسی سے ملنا تھا۔''

''آپ ٹھہریں...... میں دادی جان سے بات کر کے آتی ہوں...... آپ کو ڈراپ کر دوں گی۔''

آمنہ نے کھڑے ہوتے ہوئے اسید سے کہا اور عاشی کو تیار ہونے کے لیے کہتی ہوئی وہ دادی جان کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

''اسید! مجھے تم سے کوئی بات کرنا تھی۔'' سعید نے اسید کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے آہستگی سے کہا تو اسید نے ہاتھ میں پکڑی کتاب اوندھی کر کے تکیے کے پاس رکھی۔

''ہاں' کہو کیا بات ہے۔ تم سوئے نہیں ابھی تک۔'' وہ دو' تین دن سے دیکھ رہا تھا کہ سعید کچھ پریشان سا ہے۔

''ہاں کہو نا یار! کیا بات ہے۔ کیا چیز پریشان کر رہی ہے تمہیں۔''

''اسید......'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ''اسید! اگر میں عاشی سے شادی نہ کروں تو؟''

''کیا...... کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔ ''کیا کہہ رہے ہو تم' اپنی بات کا مطلب سمجھتے ہو۔''

''ہاں......'' اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ''میں عاشی سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

''کیا کوئی اور...... کیا کسی اور سے شادی کرنا چاہتے ہو تم...... یہ بات تمہیں پہلے معلوم نہیں تھی کیا؟''

اسید کی آواز تھوڑی بلند ہو گئی تھی۔

''نہیں' میں کسی سے بھی شادی نہیں کرنا چاہتا۔'' سعید نے نظریں جھکا لیں۔

''اور ابھی چند ماہ پہلے' تو تمہیں شادی کی بہت جلدی تھی' یہ تم ہی تھے نا جس نے دادی جان سے کہہ کر عاشی کو یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینے سے منع کیا تھا کہ تم جلد شادی کرنا چاہتے ہو۔''

''ہاں' تب میں شاید خود غرض ہو گیا تھا۔ اسید! میں نے سوچا تھا میرے پاس وقت کم ہے تو میں زندگی کا یہ رنگ' یہ خوشی بھی دیکھ لوں...... میں......''

''کیا کہہ رہے ہو تم سعید! خدا کے لیے صاف بات کرو۔ کیوں وقت کم ہے تمہارے پاس' کیا ہوا ہے تمہیں۔''

اسید کا سارا غصہ لمحوں میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس نے بے قرار سا ہو کر سعید کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ ایک لمحے میں ہزاروں وسوسے جیسے اس پر حملہ آور ہوئے تھے' کوئی بیماری...... کوئی خطرناک بیماری' بلڈ کینسر...... احمر کا چہرہ اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا' بے بسی سے اس کی طرف دیکھتا ہوا۔

''میں ابھی مرنا نہیں چاہتا اسید! میں نے تو ابھی صدف سے وہ سب کچھ کہا ہی نہیں تھا جو میں اپنے دل میں سینت سینت کر رکھتا ہوں۔''
غیرارادی طور پر اس کے ہاتھ پر اس کی گرفت سخت ہوگئی تھی۔
''کیا ہوا ہے تمہیں سعید کیا......؟''
اسید کی آواز گھٹ گئی تھی' بہت سارے آنسوؤں نے اس کا حلق سی دیا تھا۔اس نے یک دم دونوں بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے ساتھ بھینچ لیا۔
''کچھ نہیں ہوگا تمہیں' باہر لے جاؤں گا' کہیں بھی کسی بھی جگہ۔دنیا بہت ترقی کر چکی ہے۔میڈیسن کی فیلڈ۔''
''موت کا تو کوئی علاج نہیں ہے اسید! اسے تو اپنے وقت پر آنا ہے اور میری زندگی بہت مختصر ہے۔اللہ نے مجھے یہ مختصر سی زندگی ہی عطا کی ہے اسید! ڈاکٹر فہد بہت اچھا ہے۔میں چاہتا ہوں' تم ڈاکٹر فہد سے بات کرو کہ وہ عاشی سے......''
''پاگل ہوگئے ہو تم۔'' اسید نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس کی طرف ناراضی سے دیکھا۔''بتاتے کیوں نہیں کہ ڈاکٹرز نے کیا بتایا ہے تمہیں......اور کیا بیماری ہے تمہیں؟''
''مجھے کوئی بیماری نہیں ہے اسید! لیکن میرے ہاتھوں میں زندگی کی لکیر بہت مختصر ہے۔یہ دیکھو۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھ اسید کے سامنے پھیلائے۔
''یہ کیا احمقانہ بات ہے اور تم کب سے ماہر پامسٹ بن گئے کہ ہاتھ کی لکیروں کا احوال جاننے لگو۔مجھے اصل بات بتاؤ' سب بیماریاں لاعلاج نہیں ہوتیں۔''
''اصل بات یہی ہے اسید بھائی!'' وہ بے حد سنجیدہ تھا۔
''کس کو ہاتھ دکھایا تھا تم نے۔''
اسید نے ایک چور نظر اس کی پھیلی ہتھیلیوں پر ڈالی۔زندگی کی مختصر لکیر نے ایک لمحے کو تو جیسے اس کے دل کو مٹھی میں لے لیا۔
''پہلے تو میں نے خود دیکھا تھا۔دادا جان کی لائبریری سے میں نے ایم اے ملک اور نیاز فتح پوری کی کتاب نکال کر یونہی شوق میں پڑھی اور اپنے ہاتھ کی لکیریں دیکھتا رہا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میری زندگی......''
''اور دو کتابوں کا سرسری مطالعہ کر کے تم نے سمجھا کہ تم ماہر پامسٹ ہوگئے ہو۔سعید! یہ ہاتھ کی لکیریں وغیرہ کچھ نہیں ہوتیں۔ویسے بھی کوئی ایک لکیر دیکھ کر تم کوئی بات یقین سے نہیں کہہ سکتے۔اتنا تو میں بھی جانتا ہوں اور یوں بھی کوئی ایک لکیر اکیلے کوئی معنی نہیں دیتی۔'' اسید نے اطمینان کا سانس لیا۔''تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔''
''لیکن اسید میں نے دو تین اور اشخاص کو بھی ہاتھ دکھایا ہے' ان میں سے دو تو خاصے مشہور

پامسٹ ہیں۔انہوں نے مجھے کہا ہے کہ اٹھائیس' انتیس سال کی عمر میں کوئی اچانک حادثہ شاید موت کا سبب بن جائے۔''
اس کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔
''کوئی اچانک بم دھماکہ' کوئی روڈ ایکسیڈنٹ۔''
''فار گاڈ سیک سعید! ایک ڈاکٹر ہو کر یہ تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو۔''
''پامسٹری کوئی حتمی علم نہیں۔مائی گاڈ! تم اتنے دنوں سے اس فضول خیال کو دل میں پالے بیٹھے ہو۔''
''بس پتا نہیں کیوں یہ خیال ذہن سے چپٹ کر ہی رہ گیا ہے کہ......''
''بس اب فضول بکواس نہیں۔تمہاری تسلی کے لیے میں صبح تمہیں اپنے ایک پروفیسر صاحب کے پاس لے چلوں گا۔اور اب جاؤ جا کر سو جاؤ' فضول کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔''
''لیکن اگر تمہارے پروفیسر صاحب نے بھی کہا کہ......تو میں عاشی سے شادی نہیں کروں گا۔'' اپنی بات کر کے وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔
''بے وقوف احمق......'' اسید نے زیر لب کہا۔لیکن دل میں ایک کانٹا سا چبھ گیا تھا۔''حد ہوگئی حماقت کی۔'' اس نے کتاب اٹھائی لیکن پھر پڑھنے کا موڈ ہی نہ بن سکا۔
''اللہ اسے بہت لمبی زندگی عطا کرے۔'' اس نے دل ہی دل میں دعا کی۔
وحید اور عدیل تو خاموش طبع سے ہیں' اپنی پڑھائی میں مست رہتے ہیں۔گھر کی رونق تو سعید کے دم سے ہی ہے۔کل بھی دادی جان کہہ رہی تھیں۔دادی جان نے تو کچھ اور بھی کہا تھا۔لبوں کو بے اختیار مسکراہٹ نے چھوا۔
''آمنہ تمہیں کیسی لگتی ہے اسید!'' سعید کی شادی کے متعلق باتیں کرتے کرتے یکا یک انہوں نے پوچھا تھا تو وہ چونک کر انہیں دیکھنے لگا تھا۔دل میں یکدم گھنٹیاں سی بج اٹھی تھیں۔
''اچھی ہے دادی جان! لیکن آپ کیوں پوچھ رہی ہیں۔''
''مجھے بہت بہت اچھی لگتی ہے۔بہت پیاری اور محبت کرنے والی بچی ہے۔ہم سوچ رہے تھے کہ اگر تمہارے لیے اس کے والدین سے بات کریں تو......تمہاری پھپھو کی بھی یہی خواہش ہے۔عاشی کہہ رہی تھی کہ اس کی کہیں منگنی وغیرہ تو نہیں ہوئی ابھی۔''
''لیکن دادی جان! میں نے بتایا تو تھا آپ کو کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتا......میں......''
''ارے یار! سب مفروضے ہیں تمہارے۔میری عمر تراسی برس ہو چکی' اب کے دن اور جیوں گا......چلو تمہاری خوشیاں بھی دیکھ لیں۔تمہارے ابا بھی چاہتے ہیں کہ سعید کے ساتھ ہی

تمہاری شادی بھی کر دی جائے۔"

"لیکن دادا جان......"

"لیکن ویکن کو چھوڑو میاں! آمنہ اچھی لڑکی ہے۔ بہترین رفیق سفر ثابت ہوگی تمہارے لیے۔"

"یہ نہ ہو کہ کل تم شادی کے لیے تیار ہو اور......" دادا جان نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی تھی۔

"والدین لڑکیوں کو زیادہ دیر تک بٹھا نہیں سکتے اور آمنہ جیسی لڑکی کے تو نہ جانے اب تک کتنے رشتے آ چکے ہوں گے۔ زیادہ مت سوچو' میں جانتا ہوں کہ آمنہ سے بہتر لڑکی تمہارے لیے کوئی اور نہیں ہو سکتی۔"

دادا جان کہہ تو صحیح رہے تھے' لیکن اس کی اپنی سوچیں اور اپنے مفروضے تھے۔

"اگر ہر کوئی تمہاری طرح سوچنے لگے تو کوئی بھی شادی نہ کرے۔"

دادی جان نے اسے خاموش دیکھ کر کہا تھا۔ "تنگ نہ کرو ہمیں' اسید! بس کہہ دیا میں نے' میں کل تمہاری پھوپھی سے کہوں گی کہ لے چلے مجھے آمنہ کے گھر' بھلے لوگ ہیں۔"

اور اسید خاموش ہو گیا تھا۔ دل کے اندر کہیں چراغاں سا ہو گیا تھا۔ آمنہ کی رفاقت میں شب و روز کتنے انوکھے ہو جائیں گے۔

لیکن آمنہ...... پھپھو کے ادھر جانے سے پہلے مجھے آمنہ سے بات کرنا چاہیے کہ میں...... اور آمنہ کیا تاثرات ہوں گے اس کے...... شاید وہ حیران رہ جائے۔ شاید وہ بہت زیادہ خوش...... شاید......

میں صبح ہی آمنہ سے بات کروں گا' پھپھو تو شاید شام کو جائیں بلکہ ابھی کیوں نہیں کر لوں۔ ابھی وہ سوئی تو نہ ہوگی۔ اس نے تکیے کے پاس پڑا موبائل اٹھایا اور پھر رکھ دیا۔ اسے پھر سعید کا خیال آ گیا تھا۔

بے وقوف۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ...... اور اگر خدانخواستہ اور نہیں...... اس نے اپنے ذہن سے اس خیال کو جھٹکنا چاہا لیکن وہ تو جیسے دماغ سے چمٹ کر ہی رہ گیا تھا' وہ اٹھ کر بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ سعید کو ڈانٹ رہا تھا کہ خوامخواہ اس نے ایک وہم پال لیا ہے اور اب خود......

اور ایسے ہی پڑھے لکھے سمجھ دار لوگ بھی ان وہموں میں پڑ جاتے ہیں۔ شاید ایمان کی کمزوری اسے ہی کہتے ہیں۔ چاہت کے باوجود بھی وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک نہیں پا رہا تھا۔

اگر اس وقت ممکن ہوتا تو وہ اسی وقت پروفیسر صاحب کے پاس جاتا۔ لیکن بہرحال رات تو

کسی نہ کسی طرح کاٹنی تھی۔ جانے کب وہ تھک کر لیٹا تھا اور اس کی آنکھ لگی تھی لیکن صبح وہ حسب معمول نماز کے وقت اٹھ بیٹھا تھا۔ ناشتے میں بھی اس نے صرف چائے کا ایک کپ لیا تھا۔ سعید نے دو تین بار اس کی طرف دیکھا' وہ اس کی بے چینی اور اضطراب کو محسوس کر رہا تھا لیکن خود وہ مطمئن نظر آتا تھا۔

اضطراب تو فیصلے سے پہلے تھا' اب جیسے فیصلہ کرنے کے بعد سارا اضطراب ختم ہو چکا تھا۔ اسے یقین تھا کہ پروفیسر صاحب بھی وہ کچھ نہیں کہیں گے جو پہلے حضرات کہہ چکے تھے۔ پروفیسر صاحب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

"ڈاکٹر سعید! سب سے پہلے تو ایک وضاحت کر دوں غیب کا علم صرف اللہ کو ہے' کسی شخص کو کب کہاں کس جگہ موت آتی ہے کوئی نہیں بتا سکتا۔ پامسٹری ایک علم ضرور ہے لیکن اس کو یقینی اور حتمی نہیں کہہ سکتے۔ پتا نہیں آپ نے کس شخص کو ہاتھ دکھایا۔ کم از کم وہ لکیروں کی زبان نہیں سمجھتا۔ میرے حساب سے آپ طویل عمر پائیں گے۔ صحیح علم اللہ تعالیٰ کو ہے۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ ہاتھ کی لکیریں طویل عمر کی نشاندہی کر رہی ہیں اور آپ طب کے شعبے میں بہت کامیابیاں حاصل کریں گے۔"

"اوہ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔"

سعید کو لگا جیسے دل پر رکھا بوجھ ہلکا ہو گیا ہو۔ اور ایک فضول سی بات کے پیچھے میں نے کتنے سال ضائع کر دیے۔ سب دوستوں نے پارٹ ون کلیئر کر لیا اور اب پارٹ ٹو کی تیاری کر رہے ہیں جبکہ میں...... مجھ سے بڑا احمق اور کوئی نہیں ہوگا۔" اس نے اسید کی طرف دیکھا تو اسید نے تائید کی۔

"اس میں کوئی شک نہیں اور اب اٹھیں۔"

"ہاں......" وہ یکدم کھڑا ہو گیا تو اسید نے بھی پروفیسر صاحب کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اجازت چاہی۔

"تم نے اسپتال جانا ہوگا۔" اسید نے پوچھا۔

"نہیں' ابھی تو ایک کیک خریدوں گا اور ناراض لوگوں کو مناؤں گا۔"

"ہیں' کیا مطلب...... تم نے عاشی سے کہہ دیا سب......"

اسید نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔ یہ گاڑی دو تین ماہ پہلے ہی سعید نے سیکنڈ ہینڈ خریدی تھی' جب بھی لیٹ نائٹ اسپتال جانا یا آنا پڑتا تو مسئلہ ہو جاتا تھا۔

"نہیں خیر' بتایا تو کچھ نہیں لیکن ان دو تین دنوں میں اپنے رویے سے اسے ضرور ہرٹ کیا ہے۔"

"احمق......" اسید نے ایک پیار بھری نظر اس پر ڈالی۔ اس کے اپنے دل پر بھی رات بوجھ

سا آ پڑا تھا۔ شک اور یقین کے درمیان ڈولتے رات بہت مشکل سے کٹی تھی۔

گاڑی کو مین روڈ پر لانے کے لیے جوں ہی سعید نے ٹرن کیا' اسید نے اسے روکا۔

''ٹھہرو یار! مجھے یہاں ہی اتار دو۔''

سعید نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ ادھر اندر گلی میں احمر کا گھر ہے' بہت عرصہ ہو گیا میں ادھر نہیں آ سکا۔ حالانکہ ایک دو بار صدف نے کہا بھی کہ دادا جان مجھے یاد کر رہے ہیں۔''

''آپ کہیں تو میں بھی رک جاتا ہوں۔''

''نہیں یار! تم جاؤ ناراض لوگوں کو مناؤ یہاں سے آسانی سے ٹیکسی رکشہ مل جاتا ہے۔''

اسید نے ہنستے ہوئے کہا اور گاڑی سے اتر گیا۔ احمر کے دادا جان اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔

''بہت اداس ہو رہا تھا اور کام بھی تھا تم سے۔ لیکن صدف نے بتایا کہ تم بہت مصروف ہو۔ آج بھی صدف سے کہا تھا کہ اسید کو کہنا مجھ سے ملے۔''

''ابھی صدف سے ملاقات نہیں ہوئی' میں آفس نہیں گیا...... کیا وہ چلی گئی ہے۔''

''ہاں بیٹا! وہ تو آمنہ پک کر لیتی ہے اسے' بہت اچھی بچی ہے۔''

اسید کے ہونٹوں پر یوں مسکراہٹ بکھری جیسے اس کی تعریف کی گئی ہو۔

احمر کی والدہ بھی ہمیشہ کی طرح بہت خوش ہو کر بہت محبت سے ملیں۔

''تمہارا اخبار بہت اچھا جا رہا ہے اسید! صدف سے لے کر بہت باقاعدگی سے پڑھتا ہوں' سب بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔''

دادا جان نے تعریف کی' احمر کی والدہ کچھ دیر بعد چائے بنانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ حالانکہ اس نے منع بھی کیا تھا لیکن وہ اسے کھلا پلا کر خوش ہوتی تھیں ہمیشہ۔ اس لیے اسید زیادہ ضد نہیں کرتا تھا۔

دادا جان سے باتیں کرتے ہوئے حسب معمول احمر کا ذکر شروع ہوا تو دادا جان کو کوئی نہ کوئی اس کی بات یاد آتی رہی۔

''دادا جان! آپ کو کوئی کام تھا مجھ سے۔'' اسید کو یک دم یاد آیا تو وہ پوچھ بیٹھا۔

''ہاں...... وہ......'' انہوں نے اپنی آنکھیں پونچھیں۔ ''اسید! مجھے تم سے ایک بات کرنا تھی۔ میری بات پسند نہ آئے تو صاف بتا دینا مجھے۔''

''جی کہیے دادا جان......''

''بیٹا! جیسا کہ تم جانتے ہو' صدف مجھے بہت عزیز ہے اور احمر کی والدہ کی تو خیر وہ بھانجی ہی ہے۔ میں نے بھی کبھی اس میں اور احمر میں فرق نہیں سمجھا تھا۔ بچپن کا بہت سا حصہ اس نے

یہاں اس گھر میں گزارا ہے۔ احمر کے حوالے سے تو وہ مجھے اور بھی پیاری لگنے لگی تھی۔ میں نے ہمیشہ ہی سوچا کہ اسے اس گھر میں آنا ہے لیکن اب جبکہ احمر نہیں رہا تو میں چاہتا ہوں کہ اس کا رفیق زندگی بہت اچھا ہو۔ اسید بیٹا! یوں تو اس کے کئی پروپوزل آئے ہیں۔ پہلے تو وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہی نہ تھی۔ اب اپنی ماں کے بار بار سمجھانے پر وہ کسی حد تک قائل ہو گئی ہے۔ لیکن بیٹا! پتا نہیں کیوں میرا دل کہیں ٹھہرتا ہی نہیں ہے۔ ایک رشتہ ہے' لڑکا بی اے ہے۔ اس کے والد کے عزیزوں میں سے ہے' اپنی الیکٹرانک کی شاپ ہے۔ اچھے کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ سب خاندان والے تقریباً رضامند ہیں بلکہ اس کی والدہ تو دل میں فائنل بھی کر چکی ہیں لیکن میں...... پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے صدف وہاں خوش نہیں رہے گی۔ وہ لڑکا اس کے مزاج کا نہیں ہے۔''

''اور صدف...... وہ...... وہ کیا کہتی ہے؟'' اسید نے پوچھا۔

''کچھ نہیں' اس نے کیا کہنا ہے۔ پہلے انکار کرتی تھی' اب چپ رہتی ہے۔ بیٹا! میں تم......'' وہ کچھ جھجکے۔

''کیا تم صدف کو اپنا نہیں سکتے؟''

ان کی نظریں جھک گئی تھیں اور پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے نمودار ہو گئے تھے' اسید ساکت سا بیٹھا تھا۔

''سوری بیٹا! اگر میری بات اچھی نہ لگی ہو تو معاف کر دینا۔ بوڑھا آدمی ہوں' بعض اوقات یونہی بلا سوچے سمجھے بول جاتا ہوں۔ بس ایک خیال ذہن میں آیا کہہ دیا۔''

''نہیں...... نہیں......'' اسید نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ ''میں نے آپ کی بات کا برا نہیں مانا۔ میں بھی تو آپ کے احمر کی طرح ہوں جس طرح آپ دل کی باتیں احمر سے کرتے تھے' مجھ سے بھی کر سکتے ہیں۔''

احمر کے دادا جان کی آنکھوں میں لمحہ بھر کے لیے چمک سی نمودار ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک تشکر سی نظر اس پر ڈالی۔

''بیٹا! یہ عمر بھر کی زندگی بھر کی بات ہے۔ کوئی زبردستی نہیں...... جبر نہیں' بس ایک خیال آتا ہے دل میں۔ تم کو اپنا سمجھ کر کہہ دیا۔ دل نہ مانے تو کوئی بات نہیں' بلا جھجک کہہ دینا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔''

اسید نے بنا بولے ان کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے گویا خاموشی کی زبان میں تسلی دی تھی۔ لیکن خود اس کا ذہن یکدم الجھ گیا تھا۔ وہ کیسے' کس طرح دادا جان سے کہے کہ وہ......

آج تو پھپھو کو آمنہ کے گھر جانا تھا۔ اس نے ایک نظر ان کو دیکھا' ان کی آنکھوں میں امید اور آس تھی۔

کیا میں اس بوڑھے آدمی کو مایوس کر سکتا ہوں جس نے اتنی آس' اتنی امید اور مان سے ایک درخواست کی ہے۔ کاش وہ کچھ اور مانگ لیتے اور اگر میں ان کی امید نہ توڑوں تو آمنہ......اور میرا دل' جس نے صرف اور صرف آمنہ کی چاہ کی ہے۔ کیا میں صدف کو خوش رکھ سکوں گا......اور کیا میں جی سکوں گا۔

وہ دادا جان سے اجازت لے کر اٹھا تو بہت الجھا ہوا تھا پھر بھی......

دفتر پہنچتے ہی اس نے عاشی کو فون کیا تھا۔

''عاشی! پھپھو کو کہنا وہ آج آمنہ کے گھر نہ جائیں۔''

''کیوں اسید بھائی؟'' عاشی کی تو ہمیشہ سے خواہش تھی کہ آمنہ اور اسید کی شادی ہو۔

''بس یونہی ابھی کچھ دن نہیں۔''

اس نے فوراً ہی فون رکھ دیا تھا ورنہ عاشی خوامخواہ بحث کرنے لگتی۔

''نہیں' یہ غلط ہے۔ میں بھلا دل میں آمنہ کی محبت چھپائے صدف کو کیا دے سکوں گا۔''

اس نے سر جھٹک کر اس خیال کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی۔

اسید کچھ دیر یونہی خالی الذہن سا بیٹھا رہا۔ حالانکہ ابھی اس نے کل کے ایڈیشن کے لیے اڈیٹوریل لکھنا تھا' لکھنے کو بہت کچھ تھا۔

چند لفظ لکھے پھر کاٹ دیے۔ یہ سب تو روز ہی لکھتا ہوں۔ کبھی کسی موضوع پر' کبھی کسی پر......آج کچھ اور لکھوں' کچھ مختلف' آج کا اداریہ......

ڈاکٹر عبدالقدیر کے متعلق لکھنا چاہیے بلکہ مجھے ہر روز کے اخبار میں کچھ نہ کچھ لکھنا چاہیے ان کے متعلق......صرف اپنے جذبات کے اظہار کے لیے......

ڈاکٹر عبدالقدیر خان:......محسن پاکستان آخر کب تک پاکستان کو ایٹمی طاقت بنانے کی سزا بھگتتے رہیں گے۔ ہم......اور پھر لفظ جیسے یکدم ہی ذہن کی سلیٹ سے غائب ہو گئے......اس نے قلم اٹھاتے اٹھاتے بائیں ہاتھ سے اپنے سر کو دبایا اور پھر قلم رکھ دیا۔ نہیں اس وقت......کم از کم اس وقت کچھ لکھنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ باہر سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ وہ آمنہ اور صدف کے کمرے کی طرف چلا آیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور بالکل سامنے ٹیبل کے پیچھے صدف بیٹھی تھی اور دائیں طرف دیوار کے ساتھ لگی صوفے پر عروج اور آمنہ بیٹھی تھیں۔ تینوں کے ہاتھوں میں چائے کے کپ تھے اور وہ باتوں میں مصروف تھیں۔ اس نے ایک گہری نظر آمنہ پر ڈالی تھی۔ آج صبح وہ اسے ایک خوش خبری سنانا چاہتا تھا لیکن اس وقت......کیا وہ احمر کے دادا جان کو مایوس کر دے' کتنے مان سے انہوں نے کہا تھا۔

''اسید! تم......صدف کا ہاتھ تھام لو۔''

آمنہ پر سے نگاہیں ہٹا کر اس نے صدف کو دیکھا۔ خوش شکل' ذہین' باشعور' وہ کسی بھی دل کا خواب ہو سکتی تھی' لیکن......

تب ہی صدف کی نظریں اس پر پڑی تھیں اور صدف سے نظریں ملتے ہی وہ زبردستی مسکرایا اور قدم کمرے میں رکھے۔

''ہیلو خواتین! کیا ہو رہا ہے۔''

''چائے اور گپ شپ......'' عروج نے اس کی طرف دیکھا۔

''آپ سنائیں' گھر میں سب ٹھیک ہیں۔''

''ہاں سب ٹھیک ہیں۔'' اسید بائیں طرف رکھی چیئر پر بیٹھ گیا۔

''کس موضوع پر گپ شپ ہو رہی تھی؟''

''وہی میڈیا پر بحث تھا۔'' آمنہ نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر اسید کی طرف دیکھا۔

''اس روز عاشی کی باتوں نے ہلا کر رکھ دیا' پتا ہے اسید! جب میں نے عاشی کی باتوں پر غور کیا تو میں نے محسوس کیا وہ صحیح کہتی ہے' ہمارا میڈیا احساس ذمہ داری سے کوسوں دور ہے جو باتیں Negative ہیں' انہیں دہرانا 90 فیصد صرف برائیوں کو اجاگر کرنا۔ یہاں یہ برائی ہے' وہ برائی ہے۔ کیا دوسرے ممالک میں یہ سب کرپشن نہیں ہے جو ہم ہر برائی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر رہے ہیں۔ کسی عورت پر ظلم ہو یا کوئی اور بات برائی......ہمیں میڈیا کے ذریعے اچھائیوں کا پرچار کرنا چاہیے۔ ہے نا اسید! ہم اپنا چینل ضرور شروع کریں گے ان شاءاللہ اور اس چینل کے ذریعے صحیح شخص سے روشناس کرائیں گے' ٹھیک ہے نا اسید!''

''ہاں......کیا......'' اسید نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کیا آپ میری بات نہیں سن رہے تھے' کہاں تھا آپ کا دھیان؟''

''میرا دھیان......''

اسید نے سوچا۔ تمہیں کیا خبر آمنہ کہ میں تمہیں سوچ رہا تھا اور یہ کتنی عجیب بات تھی کہ ان کے درمیان کوئی بہت زیادہ محبت کے ڈائیلاگ نہیں بولے گئے تھے۔ بس ایک بار دل کی بات کہہ کر وہ مطمئن ہو گیا تھا اور شاید آمنہ بھی......پھر بھی کیسا گہرا تعلق اور رشتہ بن گیا تھا اس کے اور آمنہ کے بیچ کہ اس تعلق کے ٹوٹنے کا تصور ہی جیسے اس کا دل بھینچ رہا تھا اور پورے وجود میں گداز بھر گیا تھا۔ شاید اس وقت کسی دوست کا کندھا نصیب ہوتا تو وہ رو پڑتا۔

''کیا بات ہے اسید بھائی! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں' سب خیریت تو ہے نا۔''

''ہاں' سب خیریت ہے' بس یونہی۔''

اس نے آمنہ کے چہرے سے نظریں ہٹا لیں۔

''یہ دھماکہ جو ہوا ابھی مین مارکیٹ میں، کیا خودکش حملہ تھا؟'' صدف اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

''نہیں، مجھے کوئی خاص تفصیل معلوم نہیں۔ چاچا خدا بخش نے بس دھماکے کا ہی بتایا تھا، غالباً کوئی جانی نقصان نہیں ہوا، ورنہ وہ ضرور بتاتے اور اگر جانی نقصان ہو بھی جاتا تو کیا فرق پڑتا تھا۔ اب تو انسانی زندگی چیونٹی سے بھی کم قیمت ہو کر رہ گئی ہے۔ دس مر گئے ہیں، پچاس مر گئے ہیں۔ خبر بتا کر اگلے ہی لمحے رقص و موسیقی کے یا مزاحیہ پروگرام شروع ہو جاتے ہیں۔'' عروج کا لہجہ جلا بھنا تھا۔

''لوگوں کو بتائیں کہ دھماکہ ہوا تو سپاٹ لہجے میں کہا جاتا ہے۔''

''اچھا...... کہاں...... کتنے مرے؟ اور پھر اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں لوگ...... ہر روز ٹی وی پر خبر آتی ہے۔ آج دس عسکریت پسند میزائل حملوں میں مر گئے۔ آج آٹھ شدت پسندوں کو سیکورٹی فورسز نے مار ڈالا اور خلاص۔ کیا یہ لوگ انسان نہیں تھے؟ کیا ان سے وابستہ لوگوں نے ان کے لیے خواب نہیں دیکھے ہوں گے۔ کیا ان سے امیدیں بھی وابستہ نہیں کی ہوں گی، کیا یہ محبتوں کے حصار میں گھرے ہوئے نہیں ہوں گے اور کیا ان کی محبتوں کی ان کے سہاروں کی کسی کو ضرورت نہیں ہوگی، کیا ان کے چلے جانے سے گھر ویران نہیں ہوئے ہوں گے، کیا یہ کوڑا کرکٹ تھے، بیکار......''

''ریلیکس عروج!'' آمنہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''آج تو تم بالکل عاشی کی طرح جذباتی ہو رہی ہو۔''

''کیا مجھے جذباتی نہیں ہونا چاہیے آمنہ! بلکہ ساری قوم کو جذباتی ہونا چاہیے۔''

''بہت ہو گیا ہے آمنہ! بہت زیادہ۔ اب یہ سب ختم ہو جانا چاہیے۔ جانتی ہو نا کتنے لاکھ لوگ گھروں سے بے گھر ہوئے بیٹھے ہیں؟ کتنے بے گناہ مارے گئے ہیں۔ حامد کہتا ہے کہ یہ شدت پسند امریکہ کی ایماء پر لڑ رہے ہیں۔''

''بکنے والے کتنے لوگ ہوں گے۔ اگر ہماری فوج ان سے لڑنا چھوڑ دے تو مجھے یقین ہے کہ قبائلی خود ان خریدے گئے لوگوں کے خلاف فیصلہ کریں گے۔

یہ اتنی بڑی سازش ہے پاکستان کے خلاف عروج! کہ صرف فوجیں ہٹا لینا اس کا حل نہیں ہے، اس سے تو مل بیٹھ کر بہت سمجھ کر بہت حکمت عملی کے ساتھ نبٹنا چاہیے۔ امریکہ کی سی آئی اے، یہودی کی موساد، انڈیا کی را، افغانستان کی خاد، ہمیں بیک وقت ان کے منصوبوں سے جنگ کرنا ہے، خود کو بچانا ہے۔ پہلے ایران، امریکہ کے ٹارگٹ پر تھا لیکن اب پہلے پاکستان ہے اور پھر ایران۔''

صدف نے آہستگی سے کہا اور پھر خاموش ہو کر اسید کی طرف دیکھنے لگی، جو سیل فون پر

مصروف تھا۔

''مجھے لگتا ہے اس وقت پاکستان میں جتنے بھی دھماکے اور خودکش حملے ہو رہے ہیں، یہ سب کرنے والے را اور موساد کے ایجنٹ ہیں جو مسلمانوں کے بھیس میں حملے کر رہے ہیں۔'' عروج نے تبصرہ کیا۔

''ہاں شاید۔'' اسید نے اس کی تائید کی۔

''چائے پئیں گے آپ......'' آمنہ نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

''ایسی گفتگو شروع ہوتی کہ خیال ہی نہیں رہا۔''

''نہیں۔'' اسید نے ایک بار پھر بغور اسے دیکھا۔

''تو کیا......''

''دادا جان آپ کو یاد کر رہے تھے بہت، کسی دن وقت ملے تو مل آیئے گا۔'' صدف کو اچانک یاد آیا۔

''میں گیا تھا آج بلکہ ابھی ادھر سے ہی آ رہا ہوں۔'' اسید کھڑا ہو گیا، تب ہی اس کا موبائل بج اٹھا۔

''جی کیا...... کل سے...... لیکن وہ آفس میں تو نہیں آیا اور میرے خیال میں کل وہ نو بجے ہی چلا گیا تھا، میں ابھی اسے فون کرنے ہی لگا تھا۔ میرا خیال تھا شاید طبیعت ٹھیک نہیں۔'' اس نے دوسری طرف سے کچھ سنا۔

''اس کا فون آف ہے۔ پلیز آپ پریشان نہ ہوں...... میں دیکھتا ہوں۔''

''کیا ہوا؟'' اس نے فون آف کیا تو تینوں نے بیک وقت پوچھا۔

''حامد کل گھر نہیں گیا، ذرا چاچا کو بلوانا۔''

صدف نے گھنٹی بجائی، چند لمحوں بعد ہی خدا بخش چاچا دروازے میں کھڑے تھے۔

''چاچا! حامد کچھ بتا کر گیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟''

''نہیں، میں ان کے پاس ہی کھڑا تھا، جب کوئی فون آیا تھا، انہوں نے کہا تھا کہ اسید صاحب کو بتا دینا، میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔''

اسید کے چہرے سے پریشانی جھلکنے لگی تھی۔

''کیا وہ کسی خاص موضوع پر کام کر رہا تھا؟ گردوں کی چوری کے حوالے سے تو اس کے آرٹیکل مکمل ہو گئے تھے۔ کہہ رہا تھا کہ اس فرائیڈے کو پہلا آرٹیکل لگے گا۔''

''ہاں، وہ تو فائل میری ٹیبل پر پڑی ہے۔''

''کیا آپ کے خیال میں کوئی نہیں چاہتا کہ یہ مضمون چھپیں۔''

''میرا خیال ہے، نہیں۔'' اسید گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

کل رات سے لے کر اب تک یہ تیسرا شاک تھا جو لگا تھا۔ حامد پتا نہیں کہاں تھا' کہیں......

''اوہ نہیں......''

اس کے لبوں سے نکلا۔ کتنے سارے لوگ تھے ملک دشمن جن کو وہ اپنا دشمن بنا چکے تھے۔ کرپٹ' بے ضمیر لوگ۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو اسید نے حامد کو ایک کمپنی کے متعلق بتایا تھا۔ بظاہر کمپنی یہاں سے چمڑے کا سامان باہر بھجواتی تھی......لیکن اس گروپ میں سب لوگ موساد کے ایجنٹ تھے۔ ملکی اور غیر ملکی......چھوٹی سی عمارت میں اس کا دفتر قائم کیا گیا تھا' اور کام کرنے والے بھی دس گیارہ افراد سے زیادہ نہ تھے۔

اسید ان کے عزائم سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ وہ سب یہاں کیا سازش کر رہے تھے؟ اور اس سلسلے میں حامد سے تفصیلی بات کی تھی۔ وہ خود ان کے متعلق معلومات اکٹھی کر رہا تھا۔ گو ابھی اسے خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی تھی لیکن امید تھی کہ جلد ہی کچھ انکشاف ہوں گے۔ ممکن ہے حامد اپنا کام مکمل کرنے کے بعد ان کی طرف متوجہ ہو گیا ہو۔

حالانکہ اسے مجھ سے مشورہ کرنا چاہیے تھا لیکن حامد بہت انرجیٹک اور پُر جوش تھا۔ وہ اس ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا تھا۔

اس کے والد 71ء کی جنگ میں مشرقی پاکستان کے محاذ پر شہید ہو گئے تھے۔ اس معاملے میں وہ بہت حساس تھا اور کہتا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر پاکستان کو ان سازشیوں سے بچانے کی کوشش کرتا رہے گا جن کی وجہ سے پہلے پاکستان دو ٹکڑے ہوا تھا۔

سی آئی اے' را' خاد' موساد سب کی سرگرمیوں پر اس کی گہری نظر ہوتی تھی۔

''اب آپ کیا کریں گے اسید؟'' عروج نے پوچھا۔

''دیکھتا ہوں۔'' اسید فہد کا نمبر ملاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

''حامد! کیسا محسوس کر رہے ہو تم؟''

اسید نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا تو حامد تکلیف کے باوجود مسکرا دیا۔

''بہتر ہوں۔''

''یار! یہ تم نے کیا کیا' کم از کم مجھ سے تو مشورہ کر لیتے۔''

اسید نے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں نے سوچا تھا کہ میں فارغ ہوں تو اس سلسلے میں کچھ تحقیق کر لوں۔ تمہارا شک صحیح تھا' وہ لوگ موساد سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔ میں نے چوکیدار عبدالغنی سے دوستی کر لی تھی اور اس نے مجھے فون کیا تھا کہ اس وقت کچھ غیر ملکی آئے ہوئے ہیں اور میٹنگ ہو رہی ہے۔''

''تو عبدالغنی نے تمہیں چیٹ کیا؟'' اسید نے پوچھا۔

''شاید' یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میں جب وہاں پہنچا تو عبدالغنی وہاں نہیں تھا۔ میرا خیال ہے انہوں نے اسے مار دیا ہے۔ یہ میرا خیال ہے' وہ مجھے ایسا لگتا نہیں تھا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ وہ تینوں پیچھے سے آئے اور انہوں نے مجھے چھاپ لیا۔''

اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن صرف ہونٹ پھیلا کر رہ گیا۔ ہونٹ سوجے ہوئے اور زخمی تھے۔ تب ہی دستک دے کر سسٹر اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں انجکشن کا سامان پڑا تھا۔ اسید اسٹول سے اٹھ کر پیچھے دیوار کے ساتھ پڑے صوفے پر بیٹھ گیا۔

تین دن سے حامد یہاں اس اسپتال میں ایڈمٹ تھا اور آج پہلی بار اس نے اتنی بات کی تھی' دو دن تو وہ مکمل بے ہوشی میں رہا تھا۔ ڈاکٹر یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ رہے تھے۔ پولیس کی مدد بھی لی گئی تھی لیکن کہیں سے کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ خود اسید نے سعید کے ساتھ کہاں کہاں اسے نہیں ڈھونڈا تھا۔ حامد کی والدہ' دادی' چچا' بہن بھائی سب ہی بہت پریشان تھے اور اسید کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں سے اسے ڈھونڈ لائے' بار بار اس کا دھیان جعفر اینڈ سنز کی طرف جاتا تھا۔ ڈاکٹر فہد کے ساتھ ان چار دنوں میں کتنے ہی چکر اس نے جعفر اینڈ سنز کے آس پاس کاٹے تھے لیکن کہیں سے کوئی سراغ نہ مل سکا تھا۔ اس روز بھی رات ایک بجے ڈاکٹر فہد کے ساتھ وہ نہ جانے کہاں کہاں سے چکر لگا کر گھر پہنچے تھے' فہد کو اس نے وہاں ہی روک لیا تھا۔

''آج ادھر ہی سو جاؤ فہد! اب اس وقت کیا کرو گے گھر جا کر۔''

''ہاں دوست' وہاں کون میرے انتظار میں بیٹھا ہے۔ اپنا کیا ہے جہاں تھک گئے' وہیں ٹھکانہ بنا کر بیٹھ گئے۔''

لہجے کی افسردگی نے ایک لمحہ کے لیے اسید کو تڑپا دیا' زندگی کبھی کبھی انسان سے کتنے سنگین مذاق کرتی ہے اور فہد کے ساتھ جو ہوا تھا' وہ انتہائی سنگین تھا۔ لمحوں میں ہنستے بستے لوگ خاک تلے جا سوئے تھے۔

''وہ فہد کے متعلق ان دنوں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا بلکہ اس نے پھوپھی جان سے بھی بات کی تھی کہ فہد کے لیے کوئی بہت ہی اچھی لڑکی دیکھیں لیکن فہد سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

حامد کی گمشدگی نے پورے گھر میں افسردگی کی لہر پھیلا دی تھی۔ دادی جان نے سعید کی بری کے کپڑے اٹھا کر ایک طرف رکھ دیے تھے۔'' جانے بچہ کہاں اور کس حال میں ہوگا؟ اللہ ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رکھے۔ خیر خبر ملے اس کی تو پھر ہی کپڑے ٹانکنا۔''

اسید کے حوالے سے حامد' فیصل' دلاور' فہد سب ہی اس گھر میں جانے پہچانے جاتے تھے اور سب کے لیے دادا جان اور دادی جان یکساں محبت رکھتے تھے۔

فہد کوٹ الماری میں لٹکا رہا تھا جب سعید نے بیٹھک میں قدم رکھا۔

''ارے تم جاگ رہے ہو ابھی تک۔''

اسید نے جوتے چارپائی کے نیچے کھسکاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ بیٹھک کی چابی اس کے پاس ہوتی تھی' اگر اسے دیر ہو جاتی تھی تو وہ دروازہ کھول کر اندر آ کر سو جاتا تھا۔

''ہاں کچھ پتا چلا۔''

''نہیں' کچھ نہیں۔'' اسید کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''شاید بہت سارے لاپتا لوگوں کی طرح ہمیں حامد کا بھی کبھی پتا نہ چلے۔''

''مایوسی اچھی نہیں اسید! اللہ بہتر کرے گا۔'' ڈاکٹر فہد بھی بیڈ پر بیٹھ چکا تھا۔

''کھانا لاؤں آپ کے لیے؟''

''نہیں یار! رہنے دو' خوامخواہ تکلیف نہ کرو۔''

ڈاکٹر فہد نے منع کیا تو اسید نے کارنس پر پڑی الیکٹرک کی کیتلی کی طرف دیکھا۔

''ذرا کیتلی میں پانی ڈال کر رکھ دو۔'' میں چائے بناؤں گا۔

''ہاٹ پاٹ میں روٹیاں اور سالن پڑا ہے۔ ہمارے سگھڑ بھائیوں نے سب ٹرے میں لگا کر رکھا ہوا ہے۔ گلاس پلیٹوں سمیت...... ماشاءاللہ ایسے سگھڑ اور سلیقہ مند بھائی خدا سب کو دے' جس گھر جائیں گے نہیں بلکہ جس گھر سے دلہنیں لائیں گے' ان دلہنوں کے تو مقدر سنور جائیں گے۔''

وہ شاید ماحول کی اداسی کم کرنا چاہتا تھا۔ اسید کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہو کر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔

''میں ایک منٹ میں کھانا لاتا ہوں۔ اگر سالن ٹھنڈا بھی ہو گیا ہوا تو گرم کر لوں گا۔ بعد میں چائے بھی پیتے ہیں۔''

اس نے چٹکی بجائی۔

''اور حامد بھی بالکل ایسا ہی تھا' سعید ایسا...... ہر لمحہ ہنستا مسکراتا رہتا تھا۔''

ڈاکٹر فہد کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا جیسے وہ خود سے ہی مخاطب ہو۔ سعید جاتے جاتے رک گیا' شاید اس نے فہد کی بات سن لی تھی' اور شاید وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا' جب اسید کا موبائل بجنے لگا تھا۔

''اسید صاحب!'' دوسری طرف دلاور تھا۔ ''ابھی چند لمحے پہلے باہر احاطے میں کچھ گرنے کی آواز آئی...... کوئی بھاری سی چیز۔ میں اور چاچا فوراً ٹارچ لے کر باہر نکلے تو مائی گاڈ! کسی نے حامد کو اندر پھینکا تھا...... وہ زخمی ہیں' بے ہوش ہیں' اور سانس! بہت آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔''

''ہم آ رہے ہیں۔''

اسید نے فون آف کر کے جلدی جلدی ساری بات بتائی اور پھر انہوں نے اخبار کے دفتر پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ آج کل دلاور کے ساتھ چاچا خدا بخش بھی اخبار کے دفتر میں ہی رہتے تھے کہ ان کا بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

ڈاکٹر فہد کے ساتھ ہونے کی وجہ سے انہیں اسپتال میں زیادہ پرابلمز کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ حامد پر کسی نے بری طرح تشدد کیا تھا۔ دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں دو جگہ سے ٹوٹی ہوئی تھیں۔ سر کے پچھلے حصے میں گہرے زخم تھے۔ خون بہت زیادہ بہہ گیا تھا۔ بائیں ہاتھ کو بھی بری طرح کچلا گیا تھا لیکن ہڈی محفوظ تھی۔ بازو' چہرہ' جسم کے سارے ہی حصوں پر کوئی نہ کوئی زخم تھا' دو دن اور رات وہ سب وہاں ہی رہے تھے۔

ایک پل کے لیے بھی کوئی وہاں سے نہیں ہٹا تھا۔ فیصل' دلاور فہد' سعید اور حامد کے چچا' چھوٹا بھائی...... خواتین کو وہ زبردستی گھر بھجوا دیا کرتے تھے۔ آج صبح ہی اسے ہوش آیا تھا اور دن میں اس نے نامعلوم افراد کے خلاف ہی اپنا بیان لکھوایا تھا۔

''میں نہیں جانتا وہ کون تھے؟ ہم جیسے حقائق لکھنے والوں کے تو سو دشمن بجن ہوتے ہیں۔''

پولیس اپنی ضابطے کی کارروائی کر کے چلی گئی تھی...... ابھی ابھی اس کے چچا بھی کچھ دیر کے لیے گھر گئے تھے اور صبح دس بجے کے بعد دلاور' فیصل اور سعید بھی چلے گئے تھے۔

فہد راؤنڈ پہ تھا تو اسید نے حامد سے اصل حقیقت جاننے کی کوشش کی تھی۔ اس کا شک صحیح تھا۔ اسے آئی ایس ایف کے کسی ذمہ دار بندے سے بات کرنا چاہیے لیکن کسی ٹھوس ثبوت بغیر یہ کیسے ممکن ہے۔

سسٹر انجکشن لگا کر اور میڈیسن دے کر چلی گئی تو اسید پھر اٹھ کر اسٹول پر آ بیٹھا۔

''تو اب کیا خیال ہے حامد! تمہارے چچا کہہ رہے تھے تم کچھ دنوں کے لیے انگلینڈ چلے جاؤ اپنے ماموں کے پاس۔ وہ لوگ جنہوں نے پہلے ایسا کیا ہے وہ پھر بھی تو بھی......''

''کچھ دنوں کے لیے نہیں اسید! بلکہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھے وہاں بھیجنا چاہتے ہیں۔ ماموں نے ایک دو بار مجھے اسپانسر بھی کیا لیکن میں نہیں جانا چاہتا وہاں۔ وہاں دوسرے درجے کا شہری بن کر رہنے کے بجائے میں اپنے ملک میں رہنا پسند کرتا ہوں۔ لعنت ہے ایسی شہریت پر جس میں اپنی عزت نفس قربان کرنا پڑے۔''

''لیکن تب اور بات تھی حامد! اور اب۔ تمہارے چچا نے کہا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں۔ تمہارے گھر والے بہت خوف زدہ ہیں۔ وہ......''

''جانتا ہوں۔'' حامد نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''لیکن میں موت سے نہیں ڈرتا۔ موت تو اپنے مقرر وقت پر آتی ہے اور وہ انگلینڈ بھی آ سکتی ہے' اگر وقت مقرر آ گیا تو' میں چند سانپوں اور بھیڑیوں کے خوف سے یہ ملک نہیں چھوڑ سکتا۔ اسید! چچا کہتے ہیں ہم سر پھرے ہیں' پاگل اور ہمارے چند لفظ کسی کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ ساٹھ سالوں سے کوئی نہ کوئی ہم جیسے سر پھرے قلم سے جہاد کرتے آ رہے ہیں لیکن ان کا کچھ نہیں بگڑا' پتا ہے اسید! میں نے چچا سے کیا کہا؟''

حامد کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔

''میں نے ان سے کہا' پاکستان بنانے والے بھی ہم جیسے سر پھرے ہی تھے اور اب اسے قائم رکھنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے والے بھی ہم جیسے سر پھرے ہی ہوں گے۔'' اسید نے عقیدت سے اسے دیکھا۔

''او کے! اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔ ابھی تم آرام کرو۔'' تمہاری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔''

''ہاں شاید نیند کا اثر ہے' میڈیسن میں......''

حامد نے آنکھیں بند کر لیں۔ اسید کچھ دیر وہاں ہی بیٹھا رہا۔ ابھی حامد نے زیادہ تفصیل سے بات نہیں کی تھی کہ وہ لوگ کیا چاہتے تھے' کون تھے۔ کیا حامد نے انہیں دیکھا تھا اور کیا وہ انہیں پہچان سکتا تھا۔ یہ ساری باتیں ابھی اسے حامد سے پوچھنا تھیں لیکن حامد کے لیے ریسٹ بھی ضروری تھا۔

اللہ نے حامد کو زندگی دی تھی تو یہ ساری باتیں بعد میں بھی پوچھی جا سکتی تھیں۔ اس نے ایک نظر حامد پر ڈالی' وہ سو چکا تھا۔ اگرچہ فہد اور سعید نے خون بھی دیا تھا اسے لیکن ابھی بھی اس کی رنگت میں زردیاں گھلی تھیں۔

اللہ نے اسے کتنے مخلص اور سچے کارکن عطا کیے تھے۔

اسید کھڑا ہو گیا اور آفتاب حسین نے کہا تھا۔

''جب آدمی کسی کام کا آغاز کرتا ہے' نیک نیتی کے ساتھ تو خود بخود نہ صرف یہ کہ راستے ہموار ہوتے جاتے ہیں بلکہ اچھے اور مخلص رفیق کار بھی اس سفر میں شامل ہوتے جاتے ہیں۔''

اس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔

چار بج رہے تھے' ڈاکٹر فہد یقیناً فارغ ہو چکا ہو گا اور اسے فہد سے یہ سب ڈسکس کرنا تھا۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور ڈاکٹرز روم کی طرف بڑھ گیا۔

''میں رسائی نارسائی کے کرب اور خوشی سے قطعی واقف نہیں ہوں لیکن لگتا ہے جیسے نارسائی کا کرب دھیرے دھیرے میرے دل میں اپنے پنجے گاڑ رہا ہے۔ میں اتنا جانتا ہوں آمنہ! تمہاری محبت کی طلب اور خلوص کی مہک مجھے رلا دیتی ہے' میں کیا کروں آمنہ! کیسے دیکھوں گا تمہیں نارسائی کا عذاب بھگتتے۔''

اس نے اپنی بوجھل آنکھیں اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھی آمنہ کو دیکھا۔

''کیا بات ہے اسید! آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں اور آپ نے کیوں بلایا ہے مجھے۔''

''آمنہ! میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ کل رات میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ تمہارے لیے کتنا تکلیف دہ ہو گا۔ تم شاید......''

اسید نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

''ہاں آمنہ! مجھے تم سے کچھ کہنا تھا۔''

اس نے آہستگی سے کہا اور نظریں آمنہ کے چہرے سے ہٹا لیں۔ کئی دن تو حامد کی پریشانی کی نذر ہو گئے تھے' وہ بھی جیسے سب کچھ بھول گیا تھا لیکن کل صبح حامد ڈسچارج ہو کر گھر چلا گیا تھا اور رات ہی دادی جان نے پھر آمنہ کے گھر جانے کا ذکر چھیڑ دیا تھا اور وہ جو کتنی راتیں جاگ کر' کتنی ہی کشمکش کے بعد فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے احمر کے دادا کا مان نہیں توڑنا' وہ اس بوڑھے شخص کو انکار نہیں کر سکتا تھا جو اسے اپنے احمر کی طرح ہی سمجھتا تھا' کیا احمر انکار کر سکتا تھا۔

اس فیصلے کی اذیت اس کی رگوں کو کاٹ رہی تھی' پھر بھی اس نے عاشی سے کہہ دیا تھا کہ وہ دادی جان کو بتا دے کہ پھپھو کو آمنہ کے بجائے صدف کے گھر بھیجیں اور اس سے عاشی حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

''مگر آمنہ...... آمنہ...... تو......''

اور عاشی اپنی بات مکمل نہ کر سکی تھی اور وہ عاشی کو اپنا فیصلہ سنا کر آفس آ گیا تھا اور اب آمنہ کو اپنے آفس میں بلا کر وہ جیسے اذیت کی انتہا پر تھا' کیسے...... کس طرح کیسے وہ آمنہ سے......

''کیا بات ہے اسید! پلیز میں پریشان ہو رہی ہوں۔''

''آمنہ......'' بالآخر اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو احمر کے دادا جان نے اس سے کہا تھا۔

''تو اب......''

آمنہ کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی اور اس کے لبوں سے صرف یہی نکل سکا تھا۔

اس کی آواز بے حد بھاری ہو رہی تھی۔

''کہیں اور مہک سکو تو ضرور مہکنا' کہیں اور مسند نشین ہو جاؤ تو ضرور ہو جانا' میری محبت......''

اس کی آواز جیسے گھٹ گئی تھی۔ اس نے یکدم نظریں ہی نہیں چہرہ بھی جھکا لیا تھا۔ وہ آمنہ کے چہرے پر بکھرتے نارسائی کے کرب کو کیسے دیکھتا۔ تب ہی دروازہ زوردار آواز سے کھلا تھا اور صدف اندر داخل ہوئی تھی۔

''تم اسید! تم کیا سمجھتے ہو خود کو......''

اس نے آمنہ کی طرف نہیں دیکھا تھا' وہ اسید سے مخاطب تھی۔

''خدائی فوجدار! اگر دادا نے تم سے کوئی بات کی تھی تو تم مجھ سے بات نہیں کر سکتے تھے۔ خود ہی خود فیصلہ کر لیا' مجھ سے پوچھے بنا۔ تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا بھی چاہتی ہوں یا نہیں...... تم مجھ پر احسان کرنے چلے تھے' ہمدردی کا بخار چڑھا تھا تمہیں۔ کیا میں اندھی' لولی لنگڑی ہوں' بدصورت ہوں کہ تمہارے علاوہ کوئی اور مجھے قبول نہیں کرے گا۔ اور اس لیے تم نے سوچا کہ تم اپنی محبت کی قربانی دے دو۔''

اسید حیرت سے منہ اٹھائے اسے دیکھ رہا تھا۔
''کیا میں نہیں جانتی کہ تم اور آمنہ...... مائی گاڈ! اگر عاشی مجھے فون نہ کرتی تو تم نے تو چار زندگیاں تباہ کر دی ہوتیں۔ فار یور کائنڈ انفارمیشن' آج میں اس لیے آفس نہیں آئی تھی کہ شام کو کچھ لوگ مجھے دیکھنے آ رہے تھے۔'' وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔
''اگرچہ میرے لیے احمر کے بعد ابھی بہت مشکل ہے لیکن میں اماں' ابا کو بھی اب مزید پریشان نہیں دیکھ سکتی لیکن اسید! میں تمہیں اتنا احمق نہیں سمجھتی تھی۔'' اسید کے اندر جیسے یک دم چراغاں ہو گیا تھا' اس نے کسی قدر سنبھلتے ہوئے پوچھا۔
''کون لوگ ہیں؟''
''پتا نہیں' میں نے نہیں پوچھا۔'' اس نے اپنی مسکراہٹ چھپائی۔
''شاید دادا جان میری طرف سے مایوس ہو گئے ہوں گے۔'' اسید نے سوچا۔'' حالانکہ میں تو حامد کی وجہ سے پریشان رہا۔''
''کیا تمہیں پوچھنا نہیں چاہیے تھا۔''
''دادا جان نے اسے اوکے کر دیا ہے اور وہ میرے لیے غلط نہیں کر سکتے۔ ان کی اجازت کے بعد ہی وہ آ رہے ہیں۔'' صدف سنجیدہ تھی۔
''ہائے ہائے صدف جی غضب ہو جائے گا۔ ابھی فون کر کے منع کر دیجیے دادا جان کو کہ ان لوگوں کو مت بلائیں۔'' سعید لپکتا ہوا اندر داخل ہوا۔
''شام کو تو پھپھو آ رہی ہیں' آپ کے گھر......''
''لیکن وہ میرا مطلب ہے کہ......'' اسید کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
''کیا آپ نے نہیں کہا تھا انہیں کہ وہ شام کو صدف کے گھر چلی جائیں۔''
''ہاں' لیکن اب......''
اسید نے پریشان ہو کر باری باری صدف اور آمنہ کی طرف دیکھا۔
''اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' سعید اطمینان سے کرسی پر بیٹھ گیا۔'' میں دو ٹوکرے مٹھائی کا آرڈر بھی دے آیا ہوں' جو پھپھو نے دونوں گھروں میں لے کر جانے ہیں۔''
''دونوں گھروں میں......'' اسید الجھا ہوا سا اسے دیکھ رہا تھا۔
''ہاں' ایک آمنہ کے گھر اور ایک صدف کے گھر۔''
''کیا بک رہے ہو؟''
اب کے اسید کو اس کا یہ مذاق ناگوار گزرا۔
''بک نہیں رہا' حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ پھپھو اپنے منہ بولے بیٹے ڈاکٹر فہد کا رشتہ لے کر جا رہی ہیں صدف کے گھر' کیوں صدف بی بی! آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں' ماشاء اللہ

ہمارے ڈاکٹر فہد لاکھوں میں ایک ہیں۔ سگھڑ...... سلیقہ مند...... اور مخلص اور سب سے بڑھ کر عیش کریں گی آپ۔ نہ ساس کا جھگڑا نہ نند کا بکھیڑا۔''
صدف اب مسکرا رہی تھی۔ ''سعید! تم بھی......''
''کیوں بھائی میں نے کیا کیا؟''
سعید نے اسید کی طرف دیکھا جو بے حد ریلیکس سا ہو کر اسے سن رہا تھا۔
''ویسے داد دیں مجھے' جب عاشی نے مجھے بتایا۔ بے چاری دھواں دھار رو رہی تھی' نہ جانے کتنی سہیلیوں میں شو مار چکی تھی کہ اس کی آئیڈیل افسانہ نگار اس کی بھابھی بننے والی ہے اور اب اس کے افسانے پڑھنے کے لیے اسے پیسے خرچ نہیں کرنے پڑیں گے۔ ادھر اس نے افسانہ لکھا' ادھر اس نے چرا کر پڑھ لیا۔''
''تم صدف کو کہاں ملے؟'' اسید نے پوچھا۔
''جناب مابدولت مع عاشی کے ان کے دولت خانے پر گئے تھے' وہاں عاشی نے ان کے گوش گزار کیا سب اور ہم نے فوراً ہی ڈاکٹر فہد کی سفارش کر دی۔ بے چارے کب سے راتوں کو تارے گنتے اور ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں لیکن حال دل کہنے کی جرأت نہیں ہوتی تو وہاں سے آفس بھی محترمہ ہماری ہی گاڑی میں لد کر آئی ہیں۔ شکر کریں بروقت پہنچ گئے' ورنہ...... ارے آمنہ جی! آپ کہاں جا رہی ہیں۔''
اس نے یکدم باہر جاتی آمنہ کو دیکھا۔
''جائیے سر! ان کے پیچھے اور روٹھے ہوؤں کو منا لیجیے۔'' اسید بے اختیار کھڑا ہو گیا۔
''اگر مدد کی ضرورت ہوئی تو بلا لیجیے گا۔'' سعید نے ہانک لگائی۔ اسید نے باہر نکلتے نکلتے مسکرا کر اسے دیکھا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

''کیا آپ ہمارے ساتھ چائے کا ایک کپ پینا پسند کریں گے مسٹر اسید؟''
اسید نے چونک کر اپنے دائیں طرف دیکھا' یہ لڑکی ابھی چند لمحے پہلے ہی اس کے دائیں طرف آ کر کھڑی ہوئی تھی۔
بلیو جینز' ریڈ ٹی شرٹ پہنے' جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ شکل وصورت سے غیر ملکی نظر آنے والی اس لڑکی نے بڑی شستہ اردو میں بات کی تھی اور لہجے سے بھی وہ غیر ملکی نہیں لگ رہی تھی۔ اسید ابھی کچھ دیر پہلے یہاں اسٹاپ پر آ کر کھڑا ہوا تھا' سعید نے اسے ڈراپ کیا تھا۔
اس وقت اسے ڈاکٹر فہد کی طرف جانا تھا۔ آج ان کا پروگرام اپنے لیے شاپنگ کرنے کا تھا' اس لیے وہ کچھ جلدی ہی دفتر سے نکل آیا تھا۔ گھر میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک

نہیں، تین تین شادیوں کی تیاریاں۔ ڈاکٹر فہد کی شادی کی بھی ساری تیاری پھپھو اور عاشی نے ہی کرنا تھی۔ سو متفقہ رائے سے سعید کی شادی جو عید کے فوراً بعد ہو جانا طے پائی تھی، اس کی تاریخ بڑھا دی گئی تھی۔

تاکہ تینوں کی شادیوں کی تیاری کی جا سکے۔ فہد کی بری کا تو سارا سامان ہی خریدنا تھا۔ اسید کے لیے تو بہرحال کچھ نہ کچھ تیاری دادی اماں نے کر ہی لی تھی۔ فہد کا اسپتال زیادہ دور نہیں تھا۔ یہی طے پایا تھا کہ آج وہ فارغ ہو کر فہد کی طرف جائے گا اور پھر وہ سعید کو بھی لے لیں گے۔

''تو مسٹر اسید! کیا خیال ہے چلیں۔''

اسید نے چونک کر بغور اسے دیکھا۔ اس کا لہجہ نرم تھا لیکن اس کی نیلی آنکھوں میں بلا کی سرد مہری تھی۔ وہ اسے دعوت نہیں بلکہ حکم دیتی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ اسٹاپ پر ذرا فاصلے پر ایک بوڑھا اور بچہ تھا اور ذرا فاصلے پر دو مرد کھڑے تھے۔ اسید کی نظریں ان سے ملیں تو انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

یعنی دونوں حضرات اس خاتون کے ساتھ تھے اور مطلب تھا کہ انکار کی گنجائش نہیں کیونکہ ایک شخص نے اسے پسٹل کی جھلک بھی دکھا دی تھی۔

''لیکن میڈم! میں تو آپ کو نہیں جانتا۔''

اسید نے نظریں ان کے چہرے سے ہٹالی تھی۔

''ہم تو آپ کو جانتے ہیں نا پلیز چلیے۔ زیادہ وقت نہیں لیں گے آپ کا۔''

اس نے درخت کے پاس کھڑی سفید کرولا کی طرف اشارہ کیا تو اسید نے خاموشی سے قدم آگے بڑھا دیے۔ شاید مجھے بھی حامد کی طرح تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا۔ اس نے سوچا پچھلے دنوں اس نے جعفر اینڈ سنز کی طرح کی دو اور نام نہاد کمپنیوں کے متعلق پتا چلایا تھا اور اس سلسلے میں فہد کا دوست جس کا بھائی پولیس میں تھا، انہیں اطلاعات فراہم کر رہا تھا اور اسید بہت جلد یہ سب منظر عام پر لانا چاہ رہا تھا لیکن ابھی بہت سے شواہد کا اسے علم نہیں ہو سکا تھا۔

''یار! ایک اخبار نویس کو ایک اچھا سراغ رساں بھی ہونا چاہیے۔'' رات ہی اس نے فہد سے کہا تھا۔

''کیا تم نہیں ہو؟''

''اس طرح نہیں جیسے ہونا چاہیے، میرے مقابلے میں حامد اچھا ہے۔ شاید اس لیے کہ اس نے دو سال تک ایک بڑے اخبار کے کرائم رپورٹر کے طور پر کام کیا ہے۔''

''پلیز......''

''خاتون نے کار کا دروازہ کھولا تھا اور اسے فرنٹ سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس اثناء میں سامنے کھڑے دونوں مرد بھی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ چکے تھے۔ اس کا اندازہ صحیح تھا،

وہ اس خاتون کے ہی ساتھی تھے۔

''میں اس طرح لے جانے کا مقصد پوچھ سکتا ہوں۔'' اس نے خاتون سے پوچھا۔

''دوستانہ ماحول میں ایک کپ چائے یا کافی اور اچھی سی گفتگو......'' لڑکی نے ذرا سا رخ موڑ کر اسے دیکھا اور پھر سامنے سڑک کی طرف دیکھنے لگی، کچھ دیر بعد وہ ایک اچھے کافی ہاؤس کے ایک کیبن میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں مرد باہر ہال میں ہی بیٹھ گئے تھے۔

''مسٹر اسید! آپ بہت اچھا لکھتے ہیں بلکہ آپ کے اخبار میں سب ہی اچھا لکھ رہے ہیں۔''

''تھینکس۔'' اسید بے حد الجھا ہوا تھا۔

لڑکی نے ویٹر کو کافی کا کہہ کر پھر اس کی طرف دیکھا۔

''کئی پرانے گھاگ صحافی تو آپ سے خاصے جیلس ہو رہے ہیں۔''

''معلوم نہیں۔ ہر ایک کا اپنا ایک مقام ہے اور میں تو ابھی طفل مکتب ہوں۔''

لڑکی مسکرائی۔ اور پھر یکایک دونوں کہنیاں میز پر رکھتے ہوئے اس کی طرف جھکی۔

''آپ کے پاس اپنی گاڑی نہیں ہے، چہ چہ۔ اتنا بڑا صحافی اور اسٹاپ پر ویگن یا بس کے انتظار میں کھڑا ہو۔ آپ ایک گاڑی کیوں نہیں خرید لیتے بلکہ میرے ساتھ چلیں ابھی کسی شوروم میں اور اپنے لیے گاڑی پسند کر لیں۔ کل صبح وہ آپ کے دروازے پر ہو گی۔ بلیک ہنڈا سوک کیسی رہے گی؟''

اسید کی پیشانی پر ناگواری سے شکنیں پڑ گئیں۔ اس نے اپنی الجھن کو جھٹکا اور اپنے فطری اعتماد کے ساتھ کہا۔

''دیکھیے مس! آپ اپنا مقصد بیان کریں جس کے لیے یہاں لائی ہیں۔ تمہید میں وقت ضائع نہ کریں۔''

''اوکے۔'' لڑکی نے ہونٹ سکوڑے اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ''تمہید نہیں واقعی یہ ہماری خواہش ہے کہ آپ ایک اچھے پوش ایریے میں رہیں اور آپ کے پاس ذاتی گاڑی ہو...... اور......''

''پلیز......'' اسید نے ہاتھ اٹھایا۔ ''اصل بات...... میرے پاس وقت نہیں، مجھے کسی سے ملنے جانا تھا۔''

''وقت تو ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔'' اس نے سرد آنکھوں سے اسے دیکھا۔ ''سچی سی بات ہے مسٹر اسید! کہ ہم چاہتے ہیں کہ آپ اپنے اخبار میں وہ لکھیں جو ہم چاہتے ہیں۔''

''آپ کیا چاہتے ہیں؟'' اسید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''بتا دیں گے، پہلے آپ وعدہ تو کریں۔'' کافی کا سامان ٹیبل پر رکھ دیا گیا تھا۔ لڑکی کافی بنانے لگی۔

''سوری میڈم! میرا قلم کسی کا غلام نہیں ہے اور مجھے وہی لکھنا ہے جو میرا دل اور ضمیر مجھ سے کہے گا۔''

''اپنا ہی نقصان کریں گے آپ اور حاصل حصول کچھ نہیں۔ کیا فائدہ پہنچایا ہے آپ کے قلم اور تحریروں نے آپ کے ملک کو۔ وہ بے چارہ لڑکا حامد اپنی انگلیاں تڑوا کر بیٹھا ہے اور آپ تو غالباً ایسا ہرگز نہیں چاہیں گے۔'' لڑکی کی مسکراہٹ بڑی زہریلی تھی۔

''تو تم لوگوں نے ہی حامد کو......''

''فضول سوال نہیں......'' لڑکی نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی۔

''تم کون ہو' را کی' موساد کی یا سی آئی اے کی ایجنٹ۔''

''تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ اسید عبدالرحمٰن......''

لڑکی کی نظریں اسید کے چہرے پر جمی تھیں۔ ''یہ زندگی بہت مختصر ہے' ترس ترس کر اسے گزار دینا عقل مندی نہیں ہے۔ آج تم اکیلے ہو' کل تمہاری شادی ہوگی' بچے ہوں گے' ان کا فیوچر بھی تو تمہیں ہی بنانا ہے۔ تم اخبار کے علاوہ اپنا ایک چینل لانچ کرو۔ سب کام ہم کریں گے' پیسہ بھی ہم ہی خرچ کریں گے۔ تمہارا ہیڈک نہیں ہوگا کہ ہم کیسے کرتے ہیں۔ تم اس چینل پر ان لوگوں کو بلاؤ گے' ان سے انٹرویو لو گے' بات کرو گے' جو ہم کہیں گے۔''

اس نے کافی کی پیالی اسید کی طرف بڑھائی۔

''سوچنے کے لیے کچھ وقت لے لو اور......''

''سوری میڈم! مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے' ان شاء اللہ ایک دن ہم چینل بھی لانچ کریں گے لیکن وہ چینل ہماری مرضی کے پروگرام کرے گا۔ ہم اس چینل سے پاکستان کی نوجوان نسل کو' اس کے بچوں کو' ان کا تشخص دیں گے۔ انہیں آگاہ کریں گے کہ ان کو کس طرح تباہ کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔''

اسید کی آواز دھیمی تھی لیکن ایک جوش اور ایک ولولہ تھا اس کی آواز میں۔ لڑکی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ہم جسے چن لیتے ہیں مسٹر! یا تو وہ ہمارے ساتھ چلتا ہے یا پھر اس کی منزل قبر ہوتی ہے۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ایک لمحہ کو اسید کا دل کانپ گیا۔

''اور مسٹر اسید! اچھی طرح سوچ کر جواب دینا۔ ہمیں جلدی نہیں ہے بہت...... ایک طرف زندگی کی آسائشیں ہیں اور دوسری طرف......''

اس کی نیلی سرد مہر آنکھوں میں چمک سی نمودار ہوئی۔ ''پہلے تمہارے اپنوں کی اور پھر تمہاری موت......''

اسید نے ہاتھ میں پکڑی کافی کی پیالی نیچے رکھ دی تھی۔

''ہاں' مسٹر حسین احمد اور آفتاب حسین سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''میرا خیال ہے تم اپنا ہوم ورک کمپلیٹ کر کے ہی آئی ہوگی۔''

''وہ تو ہے......'' وہ مسکرائی۔ ''لیکن یہ تمہارے ملک میں جو دس نسلوں تک رشتوں کا جال بچھا ہے' یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمیں تو دور تک کوئی رشتہ داری نظر نہیں آئی' تمہاری حسین احمد کے خاندان سے......''

''میرا ملک...... یعنی تم غیر ملکی ہو؟'' اسید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''جو سمجھ لو۔ بے بی میں کبھی ریٹا۔ میری آن رہی ہوں۔ اس وقت تو میں زرینہ ہوں' تمہارے ملک کی باضابطہ شہری۔ زرینہ آفریدی۔ چاہو تو اپنا شناختی کارڈ دکھا دوں۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔

اسید نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا' بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''تو مسٹر اسید!'' وہ کھڑی ہوگئی۔ ''انتخاب کا حق آپ کے پاس ہے...... ایک طرف بہترین زندگی' دوسری طرف......'' اس نے ایک معنی خیز نظر اس پر ڈالی۔

''سنا ہے آپ کو اپنے دادا سے بہت پیار ہے۔ یوں بھی وہ اپنی عمر تقریباً گزار چکے ہیں' اب تو...... سو اگر کسی روز سڑک پر کوئی حادثہ ہو جائے تو...... اچھا ہے۔''

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے خاموش بیٹھے اسید کی طرف دیکھا۔

''تمہاری کافی تو ٹھنڈی ہوگئی ہے' میں اور بھجوا دیتی ہوں۔ ہاں بل پے کر دیا جائے گا۔''

وہ لہراتی ہوئی کیبن سے باہر نکل گئی۔ اسید ساکت بیٹھا تھا...... دادا جان......

''نہیں......''

اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔ وہ چوراسی سال کے ہو چکے ہوں یا پچاسی کے' لیکن ہمارے لیے ان کا وجود کتنا گھنا سایہ ہے اور پھر دادا جان کے بعد......

''نہیں......'' اس کے لبوں سے پھر نکلا۔ ''اور مجھے کیا ایوارڈ ملے گا...... آج تک اس قوم نے کیا ایوارڈ دیا ہے۔ اپنے مخلص اور محبِ وطن لیڈروں تک کو تو نہیں بخشا۔ حتیٰ کہ قائداعظم اور علامہ اقبال پر بھی کیچڑ اچھالنے والے بھی ہیں اور مجھے کیا ملے گا اتنی قربانیاں دے کر؟ تو پھر کیوں نہ اس لڑکی کی آفر قبول کرلوں۔ آخر کئی دوسرے بھی تو ایسا ہی کر رہے ہیں۔ ایک زبردست کالم ملک دشمنوں کے خلاف...... زبردست تنقید۔ حکومت پر لیڈروں پر اور ساتھ ہی تین چار کالم اور آرٹیکل اس کی نفی کرتے ہوئے اور وہی کچھ کہتے ہوئے جو لیڈروں اور حکومت کی زبان پر ہے جو ملک دشمن چاہتے ہیں اور بدلے میں ایک زبردست شاندار زندگی۔ خوبصورت گھر...... اعلا تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے بچے۔

''نہیں......'' یکایک اس نے جھرجھری سی لی۔ آفتاب حسین نے کہا تھا۔

''یہ پل صراط کا سفر ہے اسید! دھاگے سے زیادہ باریک اور نازک' لیکن یاد رکھنا جو لوگ

''سوری میڈم! میرا قلم کسی کا غلام نہیں ہے اور مجھے وہی لکھنا ہے جو میرا دل اور ضمیر مجھ سے کہے گا۔''

''اپنا ہی نقصان کریں گے آپ اور حاصل حصول کچھ نہیں۔ کیا فائدہ پہنچایا ہے آپ کے قلم اور تحریروں نے آپ کے ملک کو۔ وہ بے چارہ لڑکا حامد اپنی انگلیاں تڑوا کر بیٹھا ہے اور آپ نو غالباً ایسا ہرگز نہیں چاہیں گے۔'' لڑکی کی مسکراہٹ بڑی زہریلی تھی۔

''تو تم لوگوں نے ہی حامد کو......''

''فضول سوال نہیں......'' لڑکی نے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اوپر اٹھائی۔

''تم کون ہو' را کی' موساد کی یا سی آئی اے کی ایجنٹ۔''

''تمہیں اس سے کوئی مطلب نہیں ہونا چاہیے۔ اسید عبدالرحمٰن......''

''لڑکی کی نظریں اسید کے چہرے پر جمی تھیں۔ ''یہ زندگی بہت مختصر ہے' ترس ترس کر اسے گزار دینا عقل مندی نہیں ہے۔ آج تم اکیلے ہو' کل تمہاری شادی ہوگی' بچے ہوں گے' ان کا فیوچر بھی تو تمہیں ہی بنانا ہے۔ تم اخبار کے علاوہ اپنا ایک چینل لانچ کرو۔ سب کام ہم کریں گے' پیسہ بھی ہم ہی خرچ کریں گے۔ تمہارا ہیڈک نہیں ہوگا کہ ہم کیسے کرتے ہیں۔ تم اس چینل پر ان لوگوں کو بلاؤ گے' ان سے انٹرویو لوگے' بات کرو گے' جو ہم کہیں گے۔''

اس نے کافی کی پیالی اسید کی طرف بڑھائی۔

''سوچنے کے لیے کچھ وقت لے لو اور......''

''سوری میڈم! مجھے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے' ان شاء اللہ ایک دن ہم چینل بھی لانچ کریں گے لیکن وہ چینل ہماری مرضی کے پروگرام کرے گا۔ ہم اس چینل سے پاکستان کی نوجوان نسل کو' اس کے بچوں کو' ان کا تشخص دیں گے۔ انہیں آگاہ کریں گے کہ ان کو کس طرح تباہ کرنے کی سازشیں کی جارہی ہیں۔''

اسید کی آواز دھیمی تھی لیکن ایک جوش اور ایک ولولہ تھا اس کی آواز میں۔ لڑکی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''ہم جسے چن لیتے ہیں مسٹر! یا تو وہ ہمارے ساتھ چلتا ہے یا پھر اس کی منزل قبر ہوتی ہے۔'' اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ایک لمحہ کو اسید کا دل کانپ گیا۔

''اور مسٹر اسید! اچھی طرح سوچ کر جواب دینا۔ ہمیں جلدی نہیں ہے بہت...... ایک طرف زندگی کی آسائشیں ہیں اور دوسری طرف......''

اس کی نیلی سرد مہر آنکھوں میں چمک سی نمودار ہوئی۔ ''پہلے تمہارے اپنوں کی اور پھر تمہاری موت......''

اسید نے ہاتھ میں پکڑی کافی کی پیالی نیچے رکھ دی تھی۔

''ہاں' مسٹر حسین احمد اور آفتاب حسین سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

''میرا خیال ہے تم اپنا ہوم ورک کمپلیٹ کر کے ہی آئی ہوگی۔''

''وہ تو ہے......'' وہ مسکرائی۔ ''لیکن یہ تمہارے ملک میں جو دس نسلوں تک رشتوں کا جال بچھا ہے' یہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ ہمیں تو دور تک کوئی رشتہ داری نظر نہیں آئی' تمہاری حسین احمد کے خاندان سے......''

''میرا ملک...... یعنی تم غیر ملکی ہو؟'' اسید نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''جو سمجھ لو۔ مے بی میں کبھی ریٹا۔ میری آن رہی ہوں۔ اس وقت تو میں زرمینہ ہوں' تمہارے ملک کی باضابطہ شہری۔ زرمینہ آفریدی۔ چاہو تو اپنا شناختی کارڈ دکھا دوں۔'' وہ ہولے سے ہنسی۔

اسید نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا' بس خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

''تو مسٹر اسید!'' وہ کھڑی ہوگئی۔ ''انتخاب کا حق آپ کے پاس ہے...... ایک طرف بہترین زندگی' دوسری طرف......'' اس نے ایک معنی خیز نظر اس پر ڈالی۔

''سنا ہے آپ کو اپنے دادا سے بہت پیار ہے۔ یوں بھی وہ اپنی عمر تقریباً گزار چکے ہیں' اب تو...... سو اگر کسی روز سڑک پر کوئی حادثہ ہوجائے تو...... اچھا ہے۔''

بات ادھوری چھوڑ کر اس نے خاموش بیٹھے اسید کی طرف دیکھا۔

''تمہاری کافی تو ٹھنڈی ہوگئی ہے' میں اور بھجوا دیتی ہوں۔ ہاں بل پے کر دیا جائے گا۔''

وہ لہراتی ہوئی کیبن سے باہر نکل گئی۔ اسید ساکت بیٹھا تھا...... دادا جان......

''نہیں......''

اس کے لبوں سے سرگوشی کی طرح نکلا۔ وہ چوراسی سال کے ہو چکے ہوں یا پچاسی کے' لیکن ہمارے لیے ان کا وجود کتنا گھنا سایہ ہے اور پھر دادا جان کے بعد......

''نہیں......'' اس کے لبوں سے پھر نکلا۔ ''اور مجھے کیا ایوارڈ ملے گا...... آج تک اس قوم نے کیا ایوارڈ دیا ہے۔ اپنے مخلص اور محبِ وطن لیڈروں تک کو تو نہیں بخشا۔ حتیٰ کہ قائداعظم اور علامہ اقبال پر بھی کیچڑ اچھالنے والے بھی ہیں اور مجھے کیا ملے گا اتنی قربانیاں دے کر؟ تو پھر کیوں نہ اس لڑکی کی آفر قبول کرلوں۔ آخر کئی دوسرے بھی تو ایسا ہی کررہے ہیں۔ ایک زبردست کالم ملک دشمنوں کے خلاف...... زبردست تنقید۔ حکومت پر لیڈروں پر اور ساتھ ہی تین چار کالم اور آرٹیکل اس کی نفی کرتے ہوئے اور وہی کچھ کہتے ہوئے جو لیڈروں اور حکومت کی زبان پر ہے جو ملک دشمن چاہتے ہیں اور بدلے میں ایک زبردست شاندار زندگی۔ خوبصورت گھر...... اعلا تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرتے بچے۔

''نہیں......'' یکایک اس نے جھرجھری سی لی۔ آفتاب حسین نے کہا تھا۔

''یہ پل صراط کا سفر ہے اسید! دھاگے سے زیادہ باریک اور نازک' لیکن یاد رکھنا جو لوگ

اپنے ایمان اور عقیدے میں سچے اور مضبوط ہوں گے' وہ اس پل صراط سے آسانی سے گزر جائیں گے۔ جب آدمی سچ کے راستے پر قدم رکھتا ہے تو بھلے وہ راستہ مشکل ہی کیوں نہ ہو' اللہ کی مدد خود بخود اس کے شامل حال ہو جاتی ہے اور پھر راستے مشکل نہیں رہتے۔"

اسید نے اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے صاف کیے۔

"یہ میں کیا سوچ رہا تھا۔" ندامت نے اسے گھیر لیا۔ کس بات نے مجھے خوف زدہ کر دیا تھا۔ "موت نے......" جو اپنے وقت معین پر ہی آنی ہے' نہ ایک لمحہ اِدھر نہ اُدھر اور حامد کہتا ہے۔ اگر سانسیں پوری ہو گئی ہیں تو پھر بند قلعوں میں بھی فرشتہ اجل آ پہنچے گا تو خوف' ڈر اور بدنامی کی زندگی کیوں قبول کروں میں...... قسم ہے رب جلیل کی' وہ لوگ آخر تو بہت خوش اور مطمئن کر دیے جائیں گے جنہوں نے غم واندوہ کو جھیلا اور اپنی زندگی اور اپنا آپ قوم وملک اور سچائی کے لیے وقف کر دیا۔ یہ زندگی تو بہت چھوٹی اور ناپائیدار ہے' ختم ہو جانے والی' دلوں کے حساب یہاں نہیں' آخرت میں ہوں گے۔ یہاں چھنی ہوئی خوشیاں اور مسکراہٹیں' وہاں کئی گنا زیادہ کر دی جائیں گی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو حامد!" وہ زیر لب بڑبڑایا۔ "اسید عبدالرحمٰن بھی اپنا سفر جاری رکھے گا۔ اسی سمت اور اسے اپنی سمت تبدیل نہیں کرنا' کسی بھی قیمت پر نہیں۔"

موبائل کی بیل وقفے وقفے سے ہو رہی تھی' اس نے نمبر دیکھا' فہد تھا۔

"کہاں رہ گئے ہو بھئی۔"

"آ رہا ہوں یار......"

اس نے گرم جھاگ اڑاتی کافی کی طرف دیکھا جسے ابھی ابھی ویٹر رکھ کر گیا تھا اور کھڑا ہو گیا۔ بے حد جان دار اور دلکش سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا اور اس کا چہرہ بہت روشن روشن لگنے لگا۔ اور آنکھیں اعتماد ویقین اور ارادے کی چمک سے جگمگا اٹھیں۔ اور وہ بڑے اعتماد ویقین سے سر اٹھائے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر ریسٹورنٹ سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

اور میں نے...... یعنی عروج نے اپنی کہانی یہاں ختم کر دی' کیونکہ اس کا منطقی انجام یہی ہے لیکن یہ کہانی ختم نہیں ہوئی' ایسی کہانیاں کبھی ختم نہیں ہوتیں' جاری رہتی ہیں۔

جب تک اس دنیا میں کوئی ایک فرد بھی سچ کا دامن تھامے ایمان اور نفس کی مضبوطی کے ساتھ اس پل صراط پر چلنے کا حوصلہ رکھتا ہے' تب تک اسید کے بعد کوئی اور' اس کے بعد کوئی اور' اس جیسیاوں یہ سلسلہ چلتا رہے گا۔ اور کہانی کبھی ختم نہیں ہوگی اور خدا کرے کہانی ختم نہ ہو۔ اور چراغ سے چراغ جلتا رہے۔

☆☆☆